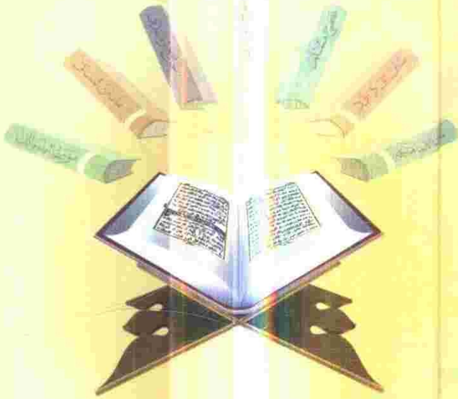
قل هذه سبيلي ادعوا الى الله
على بصيرة انا ومن اتبعني

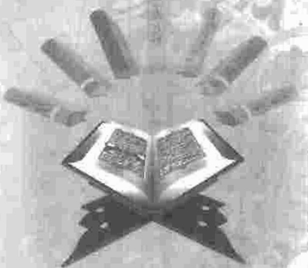


مقالات

ارشاد الحق اثری

ادارۃ العلوم الاثریہ
منٹگمری بازار۔ فیصل آباد
فون: 041-2642724

قل هذه سبيلي ادعوا الى الله
على بصيرة انا ومن اتبعني



مقالات

ارشاد الحق اثری

ادارۃ العلوم الاثریہ
منٹگمری بازار فیصل آباد
فون 041-2642724

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب مقالات

مؤلف ارشاد الحق اثری

ناشر ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد فون 041-2642724

تعداد 500

تاریخ طباعت ستمبر 2018

مطبع: انٹرنیشنل دار السلام پرنٹنگ پریس، لاہور

فون: 042-7232400

ملنے کا پتہ

(1) ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد

(2) مکتبہ اسلامیہ : (A) غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

(B) کوتوالی روڈ فیصل آباد فون 041-26[illegible]1204

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

② علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ

③ مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی عظیم آبادی رحمہ اللہ

⑥ مولانا محمد اسحاق چیمہ رحمہ اللہ

⑦ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ (کچھ یادیں، کچھ باتیں)

عرضِ ناشر

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وبعد:

مقالات کی جلد چہارم قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، اس میں مختلف اوقات میں لکھے گئے سات مقالات ہیں جو مختلف شخصیات پر مشتمل ہیں۔ ان کی طباعت کا خیال کئی بار ذہن میں آیا مگر اس کی تعمیل و تکمیل نہ ہوسکی، (لکل اجل کتاب)۔ اسی سال مارچ، اپریل میں حرمین شریفین میں حاضری کی توفیق حاصل ہوئی تو مکہ مکرمہ میں دیرینہ مہربان فضیلۃ الشیخ المحقق الاستاذ العلامہ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ سے ملاقات کے دوران میں بڑے اصرار سے فرمایا کہ بہت ہو چکی، اب مقالات کی چوتھی جلد شخصیات پر آنی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ یہ رسائل کی نذر ہو کے رہ جائیں۔ بلکہ انھوں نے علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کی مطبوعہ کتب کی فہرست اور غیر مطبوعہ رسائل کی نشاندہی پر مشتمل اوراق دیتے ہوئے فرمایا کہ اب اس میں تاخیر کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ، مقالات کی یہ چوتھی جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ پر رسالہ ۱۳۹۱ھ میں لکھا گیا تھا، یوں چھتیس سال بعد اس میں ناگزیر جزوی ترمیم و اضافہ سے اسے دوبارہ شائع اشاعت کیا گیا ہے، ورنہ اگر آج کے مراجع و مصادر کو پیشِ نظر رکھ کے دوبارہ لکھا جائے تو اس

کا حجم دوچند ہو جائے۔

میں انتہائی سپاس گزار ہوں اپنے دیرینہ رفیق حضرت مولانا محمد خالد سیف صاحب ﷾ کا، جن سے ادارہ کی رفاقت کے تناظر میں اس کا مقدمہ لکھنے کی استدعا کی گئی تو انھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوصف میری التماس کو قبول فرمایا اور بڑا جاندار، شاندار مقدمہ لکھا اور اپنے شیوخ و اساتذہ کے تعلق کو خوب نبھایا۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

اسی طرح میں ادارہ کے تمام رفقا کا بھی شکر گزار ہوں، بالخصوص مولانا عبدالحی انصاری صاحب، مولانا حافظ محمد خبیب صاحب اور مولانا طارق محمود صاحب کا، جنھوں نے اس کے پروف پڑھے اور بہت سے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے التماس ہے کہ ادارہ کے معاونین اور تمام رفقا کو اپنی رحمتوں سے نوازے، ہمیشہ انھیں اپنی مرضیات سے نوازتا رہے اور ادارہ کے مؤسسین کے لیے ادارہ کی خدمات کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین

خادم العلم والعلماء
ارشاد الحق اثری
۲۸/ ۸/ ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

(حضرت مولانا محمد خالد سیف صاحب)

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین محمد وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، أما بعد:

دنیا کے اس سٹیج پر لاکھوں قسم کے اصحابِ کمال گزرے ہیں، چشم فلک نے بارہا بڑے بڑے شاہانِ عالم کا نظارہ کیا ہے، شجاعتوں اور بسالتوں کے جوہر دکھانے والے سپہ سالاروں کو دیکھا ہے، بڑے بڑے دانشوروں، حکما اور فلسفیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ فاتحینِ عالم کی پرہیبت صفیں دیکھی ہیں، شعرا وادبا کی رنگین محفلوں کو دیکھا ہے، شان وشکوہ کے قصرِ زرنگار اور زر و جواہر کے انبار کے مالک دولت مندوں کو دیکھا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا ہے کہ اپنے اپنے میدان کے ان شہسواروں اور اپنے اپنے فن کے ان ماہروں نے بنی نوعِ انسان کی سعادت و کامرانی کے لیے کچھ نہیں کیا، ان میں سے کوئی طبقہ ایسا نہیں اور کسی طبقے کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں جس کی زندگی انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونہ قرار پاسکتی ہو!

ہمارا آج کا یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ترقی یافتہ دور ہے۔ سائنس دانوں نے بڑی بڑی حیرت انگیز ایجادات کے ذریعے سے اپنے کمالات کا لوہا منوایا ہے اور

تسخیرِ قمر کے بعد اب دیگر اجرامِ فلکی پر اپنی کمندیں پھینکنا شروع کر دی ہیں، مگر آہ!

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

سائنس دانوں نے نت نئی ایجادات کے تو انبار لگا دیے، دریاؤں اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا اور فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا تو سکھا دیا، مگر افسوس کہ یہ انسان کو انسان بن کر زمین پر چلنا نہ سکھا سکے، انسان کے راحت و آرام کے لیے شاید یہ اتنا ایجاد نہیں کر سکے، جس قدر انھوں نے انسانیت کی تباہی و بربادی کے سامانوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ آج کے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور تمام بموں کے مادر اور فادر بم ان بموں سے ہزاروں گنا زیادہ مہلک ہیں، جنھیں ہیروشیما اور ناگاساکی پر برسایا گیا تھا۔

بہرحال ہم یہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسانیت کے ان طبقات میں کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں جس کی زندگی اور جس کا عمل انسانیت کے لیے مشعلِ راہ، جس کی سیرت و کردار بنی نوعِ انسان کے لیے باعثِ ہدایت اور جس کے افکار و نظریات سعادتوں اور کامرانیوں کا موجب ہوں، مگر ٹھہریے! ایک طبقے کا ذکرِ خیر ابھی باقی ہے، یہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا مقدس طبقہ ہے، دنیا میں جہاں کہیں بھی ہدایت کی روشنی ہے، وہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام ہی کی بدولت ہے، دنیا میں جہاں جہاں بھی ایمان

کا نور ہے، وہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، انھی کے دم قدم سے کرن کرن اجالا ہوا، انھی کی کوششوں سے انسانیت کو اس کا اصل مقام و مرتبہ ملا، انھی کی کاوشوں سے دلوں کی دنیا آباد ہوئی اور انھی کی برکتوں سے تباہ حال انسانیت شادکام ہوئی۔

یہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام ہی کی مقدس تعلیمات تھیں، جن سے عقائد کی اصلاح ہوئی، اعمال میں نکھار پیدا ہوا، اوہام اور خیالاتِ فاسدہ کی بیڑیاں کٹ گئیں، ہدایت کا نظام قائم ہوا، معاشرے امن، چین اور سکون کا گہوارہ بن گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیطانی پگڈنڈیوں پر ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے انسانوں کا اپنے رب تعالیٰ سے تعلق قائم ہو گیا۔

تمام انبیائے کرام علیہم السلام اپنے اپنے دور اور اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے راہنما اور مشعلِ راہ تھے، جب کہ عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ صرف سید الاولین والآخرین، سرورِ دنیا و دیں، رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ آنحضور علیہ الصلاۃ والسلام خاتم النبیین ہیں، آپ کی ذاتِ اقدس سے سلسلۂ نبوت و رسالت کی تکمیل ہوگئی، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، لہٰذا حضرات علما کو انبیائے کرام علیہم السلام کا وارث قرار دے دیا گیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں علمائے کرام کے رفعِ درجات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ﴾

[المجادلۃ: ۱۱]

''اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان کے جنھیں علم عطا ہوا ہے درجے بلند کرے گا۔''

اہلِ ایمان و اہلِ علم سے درجات کی سربلندی کا یہ وعدہ ان کے حسبِ درجہ

خلوص اور بے پناہ خوف وخشیتِ الٰہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ حقیقی اور سچے علما کے خوف وخشیت کی شہادت دیتے ہوئے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴾

[الفاطر: ۲۸]

''اللہ سے ڈرتے تو بس وہی بندے ہیں جو علم والے ہیں، بے شک اللہ زبردست ہے، بڑا مغفرت والا ہے۔''

ایسے علما کو جن کے دل حبِ الٰہی سے آباد ہوں، جن کی زندگی تقویٰ اور خوف وخشیتِ الٰہی سے عبارت ہو اور جنھوں نے علم اور عمل کے مابین حائل دیواروں کو گرا دیا ہو، انھیں دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ [الزمر: ۹]

''آپ کہیے کہ کیا علم والے اور بے علم کہیں برابر بھی ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو بس وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

اسی طرح بہت سی احادیثِ مبارکہ میں بھی علما کی فضیلت اور ان کے مقام ومرتبہ کی رفعت کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي ... الحديث)) (صحيح البخاري: ٧١)

''جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر وبھلائی کا ارادہ کرتے ہیں، اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتے ہیں، میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، جب کہ (علم) عطا فرمانے والا تو اللہ ہی ہے۔''

اس حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص دین میں فقاہت حا   ں نہ ے، یعنی دینِ اسلام کے قواعد اور فروع کا علم حاصل نہ کرے تو وہ خیر و بھلا   سے وم ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ » (جامع ترمذي: ٢٦٨٥)

''عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح مجھے تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، آسمانوں اور زمین والے، حتی کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی (پانی میں) لوگوں کو خیر و بھلائی کی تعلیم دینے والے کے لیے رحمت کی دعا کرتی رہتی ہیں۔''

اسی طرح اور بھی بہت سی آیاتِ کریمہ و احادیثِ مبارکہ میں علمائے کرام کی یلت اور ان کے مقام و مرتبہ کی رفعت و عظمت کو بیان کیا گیا ہے، اس وقت   ن کا تقصا مقصود نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان شخصیات کے مقام و مرتبہ کی بلندی کی طرف اشارہ مطلوب ہے جو پیشِ نظر ''مقالات'' کا موضوع   ۔ یہ مقالات'' اخی و حبی فی اللہ حضرت مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کے موئے قلم کا   ہکار ۔ مولانا اثری حفظہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم و تعلم کے ابتدائی دور ہی سے تحقیق و   نید کا ذوق عطا فرمایا ہے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا:

''انسان کی زندگی میں کبھی کبھار ایک ایسی لہر اٹھتی ہے، جس پر اچھل   ر

"وہ چڑھ جائے تو کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اثری کی ابتدائی زندگی ہی میں یہ لہر اٹھی جس پر سوار ہو کر وہ علوم حدیث، اسماء الرجال اور تحقیق و تنقید کے میدان میں اقران سے سبقت لے گئے ہیں۔ شیکسپیئر نے یہ لہر کی بات اس لیے کی کہ اس نے قرآن مجید نہیں پڑھا تھا، ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موہبتِ عظمیٰ اور عطیۂ کبریٰ ہوتا ہے جس سے وہ اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ [فاطر: ٣٢]

"پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا تھا۔"

قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کی اس طرح نقاب کشائی کی گئی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [العنکبوت: ٦٩]

"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم انھیں ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔"

یعنی جو لوگ محنت کرتے اور اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں شرحِ صدر عطا فرما دیتے ہیں، ان پر علم کے دروازے کھول دیتے ہیں اور ایسی باتوں کی طرف راہنمائی فرما دیتے ہیں، جن کا انھیں علم نہیں ہوتا۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾

مولانا اثری حفظہ اللہ نے اپنے ان مقالات میں درج ذیل شخصیات کو موضوعِ سخن

ہے:

امام دار قطنی رحمہ اللہ

علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ

علامہ شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ

حضرت العلام محدث العصر مولانا محمد گوندلوی رحمہ اللہ

استادِ مرحوم کی یاد میں (حضرت مولانا عبداللہ صاحب محدث رحمہ اللہ جھال خانو آنہ والے)

محترمی و مشفقی (حالات و تاثرات) حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ رحمہ اللہ

تم کیا گئے، دن روٹھ گئے بہار کے، کچھ یادیں کچھ باتیں (حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ)

مولانا اثری حفظہ اللہ نے مذکورہ بالا اساطینِ علم و فضل پر قلم اٹھاتے ہوئے محض ... انداز میں ان کے حالات و واقعات بیان کرنے یا محض مقفع و مسجع القاب کے ... ذکر کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے منفرد تحقیقی و تنقیدی اسلوب و انداز میں ... کے حالات و واقعات اس طرح احاطۂ تحریر میں لائے ہیں کہ وہ ہمارے مدارس ... طلبا ہی کے لیے نہیں، بلکہ اساتذہ کرام اور دیگر اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ ہیں ... محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کے حالات میں انھوں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے ... یا علامہ حنفی تھے، جیسا کہ بعض حضرات نے انھیں حنفی مسلک کے اعیان دا... بر... شمار کیا ہے، مولانا نے صورتِ حال کی وضاحت کے لیے علامہ موصوف ہی کے ... رسالے کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق تو جائز سمجھتے ہیں کہ "انھیں حدیث نہیں پہنچی، مگر ائمہ مذہب کے ...

متعلق یہ قول سننا اور کہنا پسند نہیں کرتے، حالانکہ دونوں کے مابین زمین و آسمان فرق ہے۔ یہ حضرات کتبِ حدیث کا مطالعہ اور اس کی تدریس اس لیے نہیں کرتے کہ اس پر عمل کریں بلکہ ان کا مقصدِ وحید یہ ہوتا ہے کہ اپنے امام کے دلائل کا پتا لگائیں جو حدیث ان کے قول کے مخالف ہو اس کی تاویل کریں اور جہاں تاویل نہیں ہو سکتی وہاں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے امام ہم سے زیادہ عالم تھے، کیا وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہوئے اللہ کی حجت اپنے اوپر قائم کرتے ہیں۔''

اسی طرح انھوں نے ان کے ایک اور اقتباس کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ وہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مقلدین کے خیالات و حالات بیان کرتے ہوئے ان کے کردار پر ماتم کرتے ہیں، لہٰذا انھیں معروف معنی میں حنفی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

افسوس کہ علامہ سندھی نے مقلدین کے جس کردار کا ماتم کیا، ان کا یہ کردار کبھی ختم نہ ہوا اور ان کے طرزِ عمل میں کبھی فرق نہ آیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنے مشہور مقالے ''ہندوستان میں علمِ حدیث'' کے آخر میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے بارے میں لکھا ہے:

''مرحوم کو دراصل فقہ حنفی کے ساتھ والہانہ شغف تھا اور اس کی نادر اور حنفی اماموں کی اصل کتابوں کا بڑا شوق تھا اور ساتھ ہی ایسی حدیثوں کی بھی ان کو بڑی تلاش رہتی تھی، جن سے کسی حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہو۔''[1]

بات طول اختیار کرتی جا رہی ہے، لیکن جی چاہتا ہے کہ یہاں سلطان العلماء عز بن عبدالسلام رحمہ اللہ کے اس ارشاد کا بھی حوالہ دے دیا جائے جو انھوں نے مقلد کے اس ناگفتہ بہ طرزِ عمل کا شکوہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

[1] مقالاتِ سلیمان، حصہ دوم (ص: ٦٤)

”یہ انتہائی تعجب انگیز بات ہے کہ فقہاء مقلدین کو اپنے امام کے ماخذ کے ضعف کا بھی علم ہوتا ہے اور اس کے مداوا کی بھی کوئی صورت نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے امام کی تقلید کرتے ہیں اور اپنے امام کی تقلید اور مذہبی جمود کے باعث انھیں کتاب و سنت اور صحیح قیاس کو ترک کر دینے میں کوئی حجاب نہیں ہوتا، بلکہ کتاب و سنت کی واضح نصوص کو ترک کر دینے اور اپنے امام کی طرف سے دفاع کرنے کے لیے عجیب و غریب بعید از قیاس اور باطل تاویلوں سے کام لیتے ہیں۔“[1]

بہر حال مولانا اثری ﷾ نے ٹھوس اور ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ۔ محمد حیات سندھی ؒ مقلد نہیں، بلکہ متبع سنت تھے، مولانا کا موقف بالکل بجا ۔ بھلا جس انسان نے اپنے رسالہ ”تحفة الانام في العمل بحديث النبي“ میں تقلیدِ شخصی کی تردید و ابطال اور اتباعِ سنت کی تائید و حمایت میں نقلی و عقلی ... کا انبار لگا دیا ہو، اسے حنفی مقلد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟!

علامہ شمس الحق محدث ڈیانوی ؒ بھی قافلۂ سلف کے حدی خواں تھے۔ وہ خالص کتاب و سنت ہی پر عمل پیرا تھے اور کتاب و سنت کے خلاف کسی بھی امام و مجتہد ... کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، کتاب و سنت کی سربلندی کے لیے انھوں نے ... کتبِ حدیث کے شروح و حواشی لکھے، وہاں انھوں نے بہت سی نادر و نایاب ... حدیث کی طباعت و اشاعت کا بھی اہتمام فرمایا، خود ”غاية المقصود“ کے نام ... سنن ابی داود کی نہایت مبسوط شرح لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ ... تاہم غنیمت ہے کہ ”عون المعبود“ کے نام سے اس کا اختصار موجود ہے، اختصار

[1] ... مد الاحکام، حجۃ اللہ (۱/۱۵۵)

کے باوجود یہ شرح سنن ابی داود کی دیگر شروح سے اپنے بہت سے امتیازات وخصوصیات کے باعث نہایت اہمیت کی حامل ہے اور کہیں کہیں تو محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کا محدثانہ اسلوب و انداز اجتہادی شان کا حامل ہے۔ مولانا اثری حفظہ اللہ نے اپنے اس فاضلانہ مقالہ میں ایسے کئی ایک مقامات کی نشان دہی بھی فرمائی ہے۔ ہمارے دینی مدارس میں ''سنن ابی داود'' نہ صرف پڑھنے والے طلبا بلکہ پڑھانے والے اساتذۂ کرام کو بھی اس مقالہ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

حضرت العلام محدثِ عصر مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ کے تذکرہ میں مولانا اثری حفظہ اللہ نے ۱۹۶۴ء میں ملک کی عظیم ترین دینی دانش گاہ الجامعۃ السلفیۃ میں طلب علم کے لیے آنے کا ذکر کیا اور ضمناً شیخ المعقولات حضرت مولانا شریف اللہ خان صاحب رحمہ اللہ اور شیخ المشائخ حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ محدث بڈھیمالوی رحمہ اللہ کا ذکر کیا تو یہ سارے حالات و واقعات آنکھوں کے سامنے گھومتے ہوئے محسوس ہونے لگے، کیوں کہ بندۂ عاجز نے بھی ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۸ء تک کا عرصہ جامعہ ہی میں طلب علم میں بسر کیا ہے، مگر آہ!

فَانْقَضَتْ تِلْكَ الْأَيَّامُ وَأَهْلُهَا   كَأَنَّهَا وَكَأَنَّهُمْ أَحْلَامُ

اسلام کا ماضی اس قدر درخشاں اور تابناک ہے کہ مسلمانوں نے اسے دیکھ کر ہمیشہ سر فخر سے اونچا کیا ہے، وہ جب بھی اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں، انھیں کبھی ندامت محسوس نہیں ہوئی، جس امت میں ہزاروں کے حساب سے محدثین، مفسرین، مورخین، فقہاء اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین گزرے ہوں تو وہ اپنے قابلِ رشک ماضی پر فخر کا اظہار کیوں نہ کرے، ایسی ہی قابلِ فخر شخصیات میں حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ بھی تھے۔ اللہ رب ذوالجلال نے آپ کو علم و فضل کی جن عظمتوں

ـتوں سے سرفراز فرما رکھا تھا، اس کا اندازہ درج ذیل دو واقعات سے لگایا جا سکتا
ہے۔ ان دونوں واقعات کے راوی حضرت مولانا محمد یوسف کاظم رحمہ اللہ ہیں، مولانا
کاظم رحمہ اللہ حضرت کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، انھوں نے جامعہ سلفیہ کے ابتدائی
دور میں حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ پھر انھیں عالمِ اسلام کی عظیم ترین
دانش گاہ الجامعۃ الاسلامیۃ، مدینہ منورہ میں بھی حضرت سے کسبِ فیض کا موقع ملا، مولانا
مرحوم رحمہ اللہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں مسندِ تدریس پر فائز رہے،
یونیورسٹی کی فیکلٹی آف اصول الدین سے بحیثیت ڈین آف فیکلٹی ریٹائرمنٹ کے بعد
چند سال پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں، اصول الدین، اسلامی فقہ و قانون اور
علم الفرائض میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ رحمة الله رحمة واسعة

مولانا کاظم رحمہ اللہ نے راقم السطور سے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ جن دنوں
حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ سے عرب و عجم کے تشنگانِ علوم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
میں اپنی علمی تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے، انھی دنوں جامعہ مدینہ کے
بعض بڑے بڑے شیوخ و اساتذہ کرام بھی بعد از نمازِ عصر مسجدِ نبوی میں حضرت کے
درس میں شامل ہو کر آپ سے باقاعدہ استفادہ کرتے، جن میں فضیلۃ الشیخ
عبدالقادر شیبۃ الحمد اور شیخ عطیہ محمد سالم (جو ان دنوں مدینہ کے قاضی بھی تھے) بطورِ خاص
قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دن میں نے فضیلۃ الاستاذ شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد سے پوچھا:
"کیف وَجَدْتُّمُ الشَّيْخَ الْحَافِظَ؟" آپ نے الشیخ الحافظ (مدینہ یونیورسٹی میں
حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا) کو علمی اعتبار سے کیسے پایا؟
انھوں نے جواب میں فرمایا: "وَاللهِ وَجَدْنَاهُ بَحراً فِيْ كُلِّ الْعُلُوْمِ" "واللہ! ہم
نے انھیں تمام علوم میں بحرِ بیکراں کی طرح پایا ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ممارست

نہ ہو۔۔ کی وجہ سے انھیں عربی بول چال میں قدرے دشواری محسوس ہوتی ہے۔

مولانا کاظم رحمہ اللہ ہی نے حضرت سے متعلق دوسرا واقعہ اس طرح بیان کیا کہ ایک دفعہ جامعہ مدینہ کے ایک طالب علم نے آپ سے پوچھا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا علمی مقام زیادہ اونچا ہے یا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا؟ حضرت حافظ صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ عقلیات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مقام زیادہ اونچا ہے اور حدیث وفنونِ حدیث میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا مقام زیادہ ہے۔ حضرت حافظ صاحب کے اس جواب کے بارے میں جب اس وقت کے یونیورسٹی کے وائس چانسلر حضرت الشیخ ابن باز رحمہ اللہ کو علم ہوا جو خود بھی علم وفضل کے بہت ہی اونچے مقام ومرتبہ پر فائز تھے تو انھوں نے ایک دن جامعہ مدینہ کی مسجد میں بعد از نمازِ ظہر یہ اعلان کر دیا کہ تمام اساتذہ کرام اور طلبا تشریف رکھیں، فضیلۃ الشیخ الحافظ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کے علمی مقام ومرتبہ پر لیکچر دیں گے، حضرت حافظ صاحب سے اس لیکچر کی نہ منظوری لی گئی اور نہ ہی آپ کو اس کے بارے میں پہلے سے کچھ بتایا گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی رحمت اور توفیق سے حضرت حافظ صاحب نے اس طرح لیکچر دیا اور اپنے موقف کی تائید میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتابوں سے نہ صرف بے شمار دلائل وشواہد پیش فرمائے، بلکہ ان کی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھ کر سنائیں، یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کرام اور شیوخِ عظام دنگ رہ گئے اور بے ساختہ پکار اٹھے کہ ہم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا عالم نہیں دیکھا۔ نوّر اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ

ہم مولانا اثری حفظہ اللہ کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے ان "مقالات" میں ہماری ایسی ہی چند عبقری شخصیات کی کہانی سنائی ہے، کیوں کہ نژادِ نو کو اس وقت

یہ بات بتانے کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارا ماضی کس قدر درخشاں اور تابناک ہے ہمارے اسلاف نے علوم وفنون کے میدانوں میں کیسے کیسے معرکے سرانجام دیے ہیں کامیابی و کامرانی انہی کے نقشِ قدم پر چلنے میں ہے، میڈیا کا منفی اور بے روک ٹوک استعمال تو ناکارہ اور معطل کر کے رکھ دے گا۔

حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ کی اقتدا میں دو سال تک نمازیں ادا کی ہیں اور ان کا سورت فاتحہ کا وہ درس سننے کی بھی سعادت حاصل کی جو مسلسل دس ماہ تک جاری رہا تھا، یہ الگ بات کہ کم سنی کے باعث ان کے بہت سے ارشادات سمجھ سے بالا تھے، مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے جامعہ کے بہت سے اساتذۂ کرام بھی حضرت کے بیان فرمودہ علمی نکات نوٹ فرمایا کرتے تھے، جو طلبا درس میں حاضری میں سستی کا ہلی کا مظاہرہ کرتے تو حضرت الاستاذ محدث بڈھی مالوی رحمہ اللہ ''عصائے کلیمی'' پکڑے ہوئے نہیں جامعہ کے کونوں گوشوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور فرماتے کہ دیکھو علم و عرفان کی کیسی بارش ہو رہی ہے اور تم اس سے محروم ہو رہے ہو، حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ کا وہ نمازوں میں خشوع و خضوع، جہری نمازوں میں پرسوز تلاوت اور کثرتِ ذکر، سباق میں نظم ونسق کی زبردست پابندی ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آرہی ہیں۔ حضرت کے جامعہ سے تشریف لے جانے کے بعد کی بات ہے کہ میں نے ایک دفعہ حضرت الاستاذ مولانا شریف اللہ خاں صاحب رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ اور حضرت حافظ صاحب کافی عرصہ ایک ہی کمرے میں اکٹھے رہے ہیں، ان کی کوئی خاص بات بتائیں؟ انھوں نے فرمایا: میں کیا بتاؤں میں تو اس عرصہ میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ یہ کوئی انسان ہیں یا آسمانوں سے اترا ہوا کوئی نورانی فرشتہ! کیونکہ رات کو جب بھی میری آنکھ کھلتی تو میں دیکھتا کہ آپ نماز میں یا تلاوتِ قرآن مجید میں یا ذکر و فکر میں

یا دعا و مناجات میں مشغول ہیں، اللہ جانے وہ سوتے کب تھے؟ حضرت حافظ صاحب نہ صرف عابد و زاہد اور تہجد گزار و شب زندہ دار بزرگ تھے، بلکہ ہم نے اسلاف کی علمی رفعتوں اور عظمتوں کے تذکرے جو کتابوں میں پڑھے ہیں، حضرت حافظ صاحب ان کی ایک زندہ مثال تھے۔

حضرت مولانا شریف اللہ خاں صاحب رحمہ اللہ، حضرت حافظ صاحب کے جامعہ سے تشریف لے جانے کے بعد بھی مسندِ تدریس پر جلوہ افروز رہے، اس لیے راقم کو بھی ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، فلسفہ و منطق، صرف و نحو، عربی زبان و ادب اور فقہ پر انھیں زبردست مہارت حاصل تھی، ان کے پڑھانے کا انداز نہایت دل نشین تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بوڑھا باپ محبت اور شفقت سے اپنے بچوں سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو۔ بہرآئینہ حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ سے متعلق آپ کا مقالہ دلوں کے تار ہلا گیا اور اس سے کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں۔

یہی حال استاذ العلماء شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد عبداللہ محدث فیصل آبادی رحمہ اللہ سے متعلق مقالہ پڑھتے ہوئے ہوا کہ وہ میرے بھی شیخ، مربی، معلم اور مرشد ہیں، میں نے بھی ادارۃ العلوم الاثریہ میں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے ہیں، اس اعتبار سے وہ میرے عظیم محسن بھی ہیں کہ آپ، حضرت مولانا چیمہ صاحب رحمہ اللہ کی معیت میں ہمارے گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں تشریف لائے، ادارۃ العلوم الاثریہ کا تعارف کروایا اور مجھے ادارے میں کسبِ فیض کی ترغیب دی۔ حضرت الشیخ کو داغِ مفارقت دیے ہوئے قریباً پینتیس برس کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک ان کا سراپا آنکھوں کے سامنے ہے، وہ پربہار چہرہ، باغ و بہار شخصیت، علومِ حدیث، خصوصاً رجال میں مہارت اور تخریج کا ایسا ملکہ کہ اس کی مثال دور دور تک نظر نہیں آئے گی، علم و فضل کی

نعتوں کے ساتھ نماز باجماعت کی شدید پابندی۔ فرائض تو فرائض، سنن و نوافل کا
بھی شدید اہتمام۔ ایک بار جناب حاجی محمد شریف صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ میں
حضرت مولانا صاحب کے ساتھ سفر میں تھا، رات کا سفر تھا، نمازِ فجر کا وقت ہوا تو
آپ نے فرمایا کہ گاڑی کھڑی کرلو، تاکہ میں سنتیں پڑھ لوں، میں نے عرض کی کہ
تھوڑی دیر تک ہم مسجد میں پہنچ جائیں گے تو انھوں نے فرمایا کہ جب ہم مسجد میں
پہنچیں گے تو جماعت کھڑی ہو جائے گی اور بحمداللہ میری چالیس سال سے صبح کی
سنتیں قضا نہیں ہوئیں، لہٰذا گاڑی کھڑی کرلو، تاکہ آج بھی میری سنتیں قضا نہ ہوں۔
۱۹۸۰ء میں آپ جب حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے جانے کی غرض سے کراچی
میں تشریف فرما تھے تو حسنِ اتفاق کہ بندۂ عاجز بھی ان دنوں کراچی میں تھا، آپ کی
تشریف آوری کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً کشاں کشاں محمدی مسجد برنس روڈ میں
آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بے پناہ محبت و شفقت کا مظاہرہ فرمایا، طویل مجلس
میں، بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں اور پھر فرمایا کہ اگر اللہ کو واپسی منظور ہوگی تو ایک
دن تمھارے گھر قیام کروں گا اور پھر ساری باتیں وہاں ہوں گی، لیکن یہ کسے معلوم تھا
کہ حضرت الشیخ سے یہ آخری ملاقات ہے۔

تمام دینی حلقوں میں ہمارے شیخ کو یکساں احترام سے دیکھا جاتا تھا، حضرت
کے ہمراہ ایک دفعہ دار الاحسان میں جانے کا اتفاق ہوا، نمازِ ظہر کا وقت ہوا تو جناب
صوفی برکت علی صاحب نے آپ سے فرمایا: مولانا تشریف لائیں اور نماز پڑھائیں۔
آپ سنت کے مطابق رفع الیدین کے ساتھ نماز ادا فرما رہے تھے اور مقتدیوں میں
سے یہ خاکسار اس سنت پر عمل پیرا تھا، جناب صوفی صاحب تو آپ سے اس طرح
عقیدت رکھتے تھے کہ ایک دفعہ ان کے ایک مرید نے جب ان سے یہ پوچھا کہ

وہابیوں میں بھی کوئی ولی ہوا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ کوئی ہوا ہے یا نہیں، اس کا تو مجھے علم نہیں، البتہ وہابیوں میں کوئی زندہ ولی دیکھنا ہو تو جھال پر جا کر مولانا عبداللہ صاحب کی زیارت کر لو۔

مولانا نے بھی فقہی اختلاف کے باوجود ان سے ''ترتیب شریف'' اور اسماء النبی ﷺ کے سلسلے میں بہت زیادہ علمی تعاون فرمایا، حضرت الشیخ کے حسبِ ارشاد ''ترتیب شریف'' کی بہت سی دعاؤں کا ترجمہ راقم الحروف کے قلم سے ہے اور اس سلسلے میں مجھے بھی کئی بار دار الاحسان جانے کا اتفاق ہوا، جناب صوفی صاحب بے پناہ اپنائیت کا مظاہرہ فرماتے۔ محبت و شفقت سے گلے لگا لیتے اور دعائیں دیتے، اس سلسلے کی تفصیلات کو طوالت کے خوف سے حذف کیا جاتا ہے۔

''محترمی و مشفقی'' کے زیرِ عنوان حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں بہت معلومات افزا اور فکر انگیز مقالہ لکھا گیا ہے، میں نے مولانا چیمہ مرحوم کو سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں دیکھا تھا، آپ اس وقت جامعہ سلفیہ کے ناظم تھے اور میں نے جامعہ کے پہلے درجے میں داخلہ لیا تھا، میرے داخلہ فارم پر بحیثیت ناظم چیمہ صاحب ہی نے دستخط فرمائے تھے، مولانا اثری صاحب نے چیمہ صاحب کی تانگوں والوں سے رد و کد کی بات جو بیان فرمائی ہے، یہ بات اس وقت جامعہ کے طلبا میں بھی مشہور و معروف تھی، صرف اسی سے اندازہ لگائیں کہ ہمارے ان بزرگوں نے کس طرح خونِ جگر سے ان اداروں کو سینچا تھا، جس کی وجہ سے ان میں یہ بہار آئی ہوئی ہے، چیمہ صاحب کا وہ بھرپور عہدِ شباب تھا، شخصیت میں رعب داب تھا، طلبا دور ہی سے دیکھ کر کونوں گوشوں میں چھپنے کی کوشش کرتے کہ ناظم صاحب آ رہے ہیں، ناظم صاحب آ رہے ہیں، لیکن ناظم صاحب کا طلبا کے ساتھ نہایت محبت و شفقت

حاملہ ہوتا تھا، مقدور بھر تعاون میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے، مولانا اثری صاحب نے ان کے اپنی کمر پر گندم کی بوریاں اٹھانے کی جو بات کی ہے، راقم اس کا چشم دید گواہ ہے۔ ریڑھے، چھکڑے یا ٹرک وغیرہ پر جب جامعہ کے لیے سیزن میں گندم کی بوریاں آتیں تو انھیں اتار کر سٹور میں پہنچانا ایک مشکل مرحلہ ہوتا تھا، بڑی عمر کے دو طالب علم مل کر بوری اٹھاتے مگر چیمہ صاحب تنِ تنہا اپنی کمر پر الٹا کر انھیں سٹور میں پہنچا دیا کرتے تھے۔

چیمہ صاحب ساری زندگی مختلف شکلوں میں بہت سے دینی اداروں کی سرپرستی فرماتے رہے، جب کہ ادارۃ العلوم الاثریہ کا پودا تو انھوں نے لگایا ہی اپنے ہاتھوں سے تھا، راقم کے محسن و مربی تھے، ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ نوّر اللہ مرقدہ، وبرد مضجعه.

''تم کیا گئے، روٹھ گئے دن بہار کے'' کے زیرِ عنوان حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ سے متعلق بڑا ہی خوب صورت مقالہ ہے، راقم نے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور بحمد اللہ یہ شرف مسلسل دو ماہ تک حاصل رہا۔ حضرت ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں مسندِ تدریس پر فائز تھے اور اس سال موسمِ گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جامعہ سلفیہ میں تشریف لے آئے، تاکہ ان ایامِ تعطیلات میں شیخ العرب والعجم حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ اور امام المعقولات حضرت مولانا شریف اللہ خان صاحب رحمہ اللہ سے اپنی علمی تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔ درمیان میں کئی سال کے تعطل کے بعد ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ان سے ارادت و عقیدت کے بے حد گہرے مراسم قائم ہو گئے، حضرت سید صاحب رحمہ اللہ بھی بے پناہ محبت و شفقت سے نوازنے لگے۔ ان کے دل میں اسلام کا

بے پناہ درد تھا، ایک بار فرمانے لگے: دیکھو الحاد اور زندیقیت کی اسلام کے خلاف ایک یلغار ہے، لاہور آجاؤ، اس یلغار کے آگے بند باندھنے کے لیے مل کر کم از کم ایک سو مقالات لکھیں گے، لیکن: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

حضرت سید صاحب بلاشبہ عظیم شخصیت کے مالک تھے، لیکن ان کی شخصیت میں جو محبوبیت اور جاذبیت تھی، وہ اور کہیں نظر نہیں آئی، ان کے دل میں اللہ کی محبت کے چراغ جل رہے تھے، ان کا سینہ دینی حمیت و غیرت سے معمور تھا، میں ''مقالات'' اور ان کے قارئین کرام کے درمیان زیادہ حائل نہیں رہنا چاہتا، لیکن سید صاحب رحمہ اللہ کی ایمانی غیرت سے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ قارئین کرام کی خدمت میں بھی پیش کر دیا جائے:

اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین محترم جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان صاحب نہایت فاضل شخصیت ہیں، اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر کامل عبور رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و فضل اور امانت و دیانت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے بھی بہرہ وافر عطا فرمایا ہے، کونسل میں ان کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، اللہ تعالیٰ انھیں ایمان و سلامتی اور صحت و عافیت کے ساتھ دراز اور بابرکت عمر عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

محترم ڈاکٹر صاحب کے حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے، سید صاحب جب لندن میں اسلامک فیسٹول میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کا قیام بھی لندن میں تھا، آپ پاکستان سفارت خانہ میں غالباً کلچرل اتاشی تھے، فیسٹول کے مہمانوں کے قیام و طعام کا اگرچہ سرکاری طور پر اہتمام تھا، مگر محترم ڈاکٹر صاحب نے حضرت سید صاحب اور جناب

اکٹر نبی بخش بلوچ کو اپنے دوستوں کی حیثیت سے اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ محترم ڈاکٹر ماحب نے بتایا کہ جب روڈ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے شدید زخمی حالت میں سید صاحب ہپتال میں داخل تھے تو میں روزانہ ان کی عیادت کے لیے جاتا تھا۔ ایک دن جب میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے پوچھا کہ آج فیسٹول میں کس کا لیکچر تھا اور انھوں نے کیا بیان کیا، تو میں نے بتایا کہ آج بیرسٹر کمال فاروقی کا لیکچر تھا اور انھوں نے پنے لیکچر میں ایک عجیب بات یہ بھی کہی کہ دیہاتی ماحول کا ایک شخص جس نے صرف چند لمحات نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں گزارے ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ امام بوحنیفہ اور غزالی و رازی جیسی شخصیتوں سے بھی بڑھ کر ہو۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ بات سن کر سید صاحب کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو گئی، شاید ان کا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا، ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے تھے، اس کیفیت میں انھیں شاید میرے پاس بیٹھے ہونے کا بھی احساس نہ رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں، میں نے اپنے کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیے تو میں نے ان کے یہ الفاظ سنے:

''اسے (کمال فاروقی) کیا خبر کہ جس کی آنکھیں، ان کی آنکھوں سے چار ہوئیں، اس نے کیا پا لیا۔''

حضرت سید صاحب کے یہ الفاظ بیان کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب اشکبار ہو گئے اور فرمانے لگے:

''سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ بلاشبہ سچے ولی اللہ تھے۔''

یہ تھے ہمارے وہ اسلاف کرام جن میں سے چند منتخب شخصیتوں کے حالات و واقعات مولانا اثری حفظہ اللہ نے اپنے ان ''مقالات'' میں اپنے مخصوص علمی و ادبی

اور تحقیقی تنقیدی اسلوب میں بیان فرمائے ہیں۔

دارۃ العلوم الاثریہ، جس سے راقم کو بھی اکتسابِ فیض کا شرف حاصل ہے، کے مؤسسین کرام رحمہم اللہ اجمعین کے پیشِ نظر اس ادارے کی تاسیس سے مقصود یہ تھا کہ ہمارے دینی مدارس و جامعات کے فارغ التحصیل حضرات کی اس طرح تربیت کی جائے کہ انھیں علومِ حدیث میں تخصص حاصل ہو اور تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد وہ تدریس اور تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرم عمل ہو سکیں، ملک و ملت کے سامنے علمی و تہذیبی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لیے وہ اسلاف کرام کی ان محدثانہ، فقیہانہ اور حکیمانہ کاوشوں پر روشنی ڈال سکیں، جن سے معلوم ہو کہ ہم نے ماضی میں تفسیر و حدیث اور فقہ و قانون کے گہرہائے تاباں کے فروغ میں کیا کیا مساعیِ جمیلہ سرانجام دی ہیں اور علوم و فنون کو کہاں سے کہاں تک اچھال دیا ہے۔ پیشِ نظر ''مقالات'' اسی خواب کی تعبیر ہیں جو ادارے کے بانیوں نے دیکھا تھا۔

محبّ مکرم مولانا ارشاد الحق اثری ﷾ کی تصنیفی و تالیفی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ''مقالات'' اسی سلکِ مروارید کی ایک خوش نما اور جاذبِ نظر کڑی ہے۔ اللہ کرے کہ ان کے قلمِ گہربار کی فیاضیوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہے اور احباب جماعت کو ادارے کے ساتھ دامے، درمے، سخنے، قدمے ہر ممکن تعاون کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد خالد سیف

۲۴ ستمبر ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام دار قطنی رحمہ اللہ

پیش لفظ:

جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نظم و معانی کی حفاظت کی ہے، اسی طرح وحی کے دوسرے حصے حدیث کی حفاظت کے بھی سامان بہم پہنچائے ہیں اور ہر دور میں اس دور کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہے جنھوں نے حدیث کی حفاظت و مدافعت میں معجزانہ کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ تاریخِ تدوینِ حدیث کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے محدثین رحمہم اللہ کو اسی کام کے لیے پیدا کیا تھا اور انھوں نے بھی وہی کام سرانجام دیے جس کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے بعد ائمہ اسلام اور محدثین کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دور اس اعتبار سے نہایت پرفتن دور ہے کہ اس میں ہر قسم کے اہلِ بدعت پیدا ہو گئے تھے اور فتنۂ وضع حدیث بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو چکا تھا۔ اس دور میں محدثین نے ایک طرف تو جمع و تدوینِ حدیث کا کام تندہی سے سرانجام دیا اور دور دراز سفروں کی تکالیف اٹھا کر بلادِ اسلامیہ کے ہر کونے میں پہنچنے کی کوشش کی اور اس جمع شدہ ذخیرے کی تہذیب و تنقیح بجائے خود ایک محنت طلب کام تھا۔ چنانچہ محدثین نے اپنی لگاتار محنتوں سے اس ذخیرے کو نہ صرف مرتب کیا، بلکہ سند و متن کی

صحت اور عدمِ صحت معلوم کرنے کے لیے قواعد و اصول بھی ترتیب دیے۔ تاریخِ رجال پر کتابیں لکھیں، احادیث کے انواع و اقسام اور درجات مقرر کیے۔ علومِ حدیث کو انواع میں تقسیم کیا اور ہر نوع کی تحقیق کی۔ ان میں سے بعض انواع کی اہمیت کے پیشِ نظر ان پر مستقل تالیفات ترتیب دیں۔ علل الحدیث اور جرح و تعدیل کی طرح ڈالی، اخذ و تحمل اور ادا کے الفاظ مقرر کیے۔ الغرض علمِ حدیث بہر پہلو مکمل کر کے اس میں فنی کمال پیدا کر دیا اور آیندہ کے لیے بحث و تمحیص کے خطوط متعین کر دیے۔

ائمہ ستہ کے بعد جو محدثین آئے، انھوں نے انھی خطوط پر کام کیا، لیکن اس سلسلے میں بعض ایسے محدث بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے اس فن میں خصوصی کمال اور دوسروں سے امتیازی حیثیت حاصل کی۔ انھی امتیاز حاصل کرنے والوں میں ایک امام دارقطنی رحمہ اللہ بھی ہیں جو اس مقالہ کے ہیرو ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ پر اس سے قبل بھی بعض علما نے اپنے مقالات شائع کیے ہیں، مگر افسوس کہ وہ مقالہ نگار اختلافِ مسلک کی بنا پر امام موصوف کی علمی شخصیت صحیح طور پر تجزیہ کرنے سے قاصر رہے اور ان کو متشدد وغیرہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی، بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ انھوں نے امام موصوف پر جو کچھ لکھا، گریز پا ہو کر لکھا اور امام موصوف رحمہ اللہ کے متعلق غلط تاثر دینے کی کوشش کی۔

یہی وہ چیزیں ہیں جو زیرِ نظر مقالے کی تدوین کا باعث بنی ہیں، اس مقالے میں اس تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو سابق مقالات میں پائی گئی ہے اور امام موصوف پر عائد کردہ الزامات کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ خصوصاً السنن پر تبصرہ، علل الحدیث، جرح و تعدیل میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مقام، تالیفات وغیرہ چند عنوانات ان کی اہمیت کے پیشِ نظر جامع بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بعض فنونِ حدیث

میں تو امام دارقطنی سابق محدثین سے بھی بازی لے گئے ہیں اور بعض فنون میں انھیں سابقیت کا مقام حاصل ہے۔

عرصہ سے یہ خیال دامن گیر تھا کہ امام موصوف پر ایک جامع مقالہ ترتیب دیا جائے، مگر نامساعد حالات اس راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنتے رہے۔ آخری مولوی ارشاد الحق تخصص ادارہ علوم اثریہ سال دوم نے اس خصوصی کام کا بیڑا اٹھایا اور ادارے کی رہنمائی کے مطابق ان کی پیہم محنت نے اس دیرینہ خواہش کو تکمیل کا جامہ پہنا دیا۔ امید ہے کہ یہ مقالہ علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ عزوجل ان کو مزید علم حدیث کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

ہمارے آیندہ پروگرام میں پاک و بھارت میں مشاہیرِ اہل حدیث اور ان کی دینی و سیاسی خدمات پر کام کرنا بھی داخل ہے۔ یہ تاریخِ اہلِ حدیث کا ایک حصہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے اور ادارے کو اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، آمين برحمتك يا أرحم الراحمين.

فقط

(مولانا) محمد عبدہٗ الفلاح

خادم ادارہ علوم اثریہ (لائل پور)

۱۰ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، أما بعد:

اس مختصر مقالے میں ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں، وہ چوتھی صدی ہجری کے نامور تاجدارِ حدیث حضرت امام دارقطنی رحمہ اللہ ہیں، جنھیں مؤرخ کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ان کے تذکرے کے بغیر چوتھی صدی کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

نام و نسب:

نام علی، کنیت ابو الحسن۔ آپ ''حافظِ بغداد'' کے لقب سے مشہور ہیں۔[1]

سلسلۂ نسب یہ ہے:

''ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن النعمان بن دینار بن عبداللہ الدارقطنی البغدادی۔''[2]

نسبت میں گو دارقطنی بغدادی کہا جاتا ہے، مگر دارقطنی معروف تر ہے۔ دارقطن بغداد کا ایک بڑا محلّہ تھا، علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نسبة إلى دار قطن وكانت محلة كبيرة ببغداد''[3]

---

[1] كشف الظنون (١٠٠٧/٢)

[2] طبقات الشافعية (٣١٠/٢)، تاريخ بغداد (٣٤/١٢)

[3] الأنساب (٤٣٨/٢)، اللباب (٤٨٣/١)

اور دارقطن کے ضبط میں علما نے لکھا ہے کہ یہ بہ فتحہ دال، سکون الف، فتحہ را، ضمہ قاف اور سکون طا مہملہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔[1]

دارقُطن محلّہ کرخ اور نہر عیسیٰ بن علی کے درمیان واقع تھا۔[2] عربی میں قُطن روئی کو کہتے ہیں، اس محلّہ میں روئی کی بہت بڑی منڈی ہو گی، اسی وجہ سے یہ محلّہ دارقطن کے نام سے مشہور ہوا۔

ولادت:

امام دارقطنی رحمہ اللہ عباسی خلیفہ المقتدر باللہ کے عہد میں پانچ ذیقعدہ ۳۰۶ھ مطابق ۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ طاش کبریٰ زادہ سن تولد میں متردد ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ولد سنة خمس أو ست وثلث مائة"[3]

''وہ ۳۰۵ھ یا ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔'' لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے سن تولد ۳۰۶ھ ہی لکھا ہے اور اس کی تائید خود امام موصوف کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ولدت سنة ست وثلث مائة"[4]

اس بنا پر ۳۰۶ھ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس کے بعد کسی قسم کے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

طلبِ علم:

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ابتدائی عمر ہی میں علمی جواہرات بڑی تندہی سے جمع کرنا

---

1. أيضاً و وفيات الأعيان (۳۵۹/۱)
2. معجم البلدان (۴۲۲/۲)
3. مفتاح دار السعادة (۱۴/۳)
4. مقدمہ الالزامات (ص: ۱۱۶)

شروع کر دیے تھے۔

ابو الفتح یوسف بن عمر القواس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو القاسم رحمہ اللہ ابن منیع البغوی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ دارقطنی ابھی بچے تھے وہ ہمارے پیچھے پیچھے ہوتے ان کے ہاتھ میں روٹی اور اس پر سالن ہوتا تھا۔ ہم انھیں امام بغوی رحمہ اللہ کے پاس جانے سے روکتے تو وہ باہر دروازے پر بیٹھ کر رونے لگتے۔ ①

اس سے معلوم ہوتا ہے بچپن ہی میں انھیں تعلیم کا شوق تھا۔ ان کے والدِ گرامی محدث قاری تھے۔ امام دارقطنی نے ان سے بھی علم حاصل کیا۔ ②

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"سمع وهو صبي من أبي القاسم البغوي" ③

انھوں نے بچپن میں امام ابو القاسم بغوی رحمہ اللہ سے سماع کیا۔ خود ان کا اپنا بیان ہے کہ ۳۱۵ھ کی ابتداء میں جب کہ ان کی عمر ۹ سال تھی، میں نے کتابتِ حدیث کا آغاز کیا۔ ④

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"كان في صغره موصوفاً بالحفظ الباهر والفهم الثاقب والبحر الزاخر" ⑤

ان کے مشایخ کے اوطان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے علم حدیث کے حصول کی خاطر مختلف ممالک کے سفر کیے تھے۔ بغداد جو اس وقت تہذیب وتمدن ا

---

① التذكرة (۳/۹۹٤)، ابن عساكر (۹۸/٤۳)

② تاریخ بغداد (۲۳۹/۱۱)

③ السير (٤٤۹/۱٦)

④ تاریخ بغداد (۳۹۷/۱۱)

⑤ البداية (۳۱۷/۱۱)

...وم وفنون میں عالم اسلام کا بہت بڑا مرکز تھا، جس کا ذکر امام حاکم رحمہ اللہ نیشاپوری نے "مدينة العلم و موسم العلماء والافاضل" جیسے شاندار الفاظ سے کیا ہے۔[1] وہاں سے استفادہ کے بعد امام موصوف رحمہ اللہ نے علوم وفنون کی تکمیل کے لیے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بصرہ، شام، کوفہ اور مصر وغیرہ بلاد کی طرف سفر کیے، کیوں کہ یہی وہ ممالک ہیں، جہاں سے بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علومِ نبوت، یعنی تفسیر القرآن، سنت وشریعت کے سرچشمے پھوٹے اور علما نے ان سے سیرابی حاصل کی۔[2]

امام موصوف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "میں احادیث کی تصدیق کے لیے کوفہ جایا تا تھا۔"[3] علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کے مصر اور شام جانے کی بھی صراحت کی ہے:

چنانچہ فرماتے ہیں:

"وارتحل في كهولته إلى مصر والشام وصنف التصانيف"[4]

"کہولت کی عمر میں انھوں نے مصر و شام کی طرف علمی سفر کیے اور تصانیف لکھیں۔"

علمِ حدیث اور خصوصاً "العلل" میں وہ مقام حاصل کیا کہ محدثین کے قول کے مطابق یہ فن ان ہی پر ختم ہوگیا۔[5]

شیوخ و اساتذہ

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنے وطن کے علمی سرچشموں

---

1. معرفة علوم الحديث (ص: ١٩٤)
2. منهاج السنة النبوية (١٤٢/٤)
3. تاريخ بغداد (٣٧/١٢)
4. تذكرة الحفاظ (١٨٧/٣)
5. الأنساب للسمعاني (ورق: ٢١٧)

سے سیرابی حاصل کرنے کے بعد مختلف ممالک کا سفر کیا۔ اس اعتبار سے ان کے شیوخ کا احاطہ ناممکن سا ہے۔ تراجم و رجال کی مختلف کتابوں میں جو منتشر نام ملتے ہیں ان سے قطع نظر ہم "السنن" کے ان اساتذہ کا ذکر زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، جن سے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کثرت سے روایات لی ہیں۔

① عبداللہ رحمہ اللہ بن محمد بن زیاد ابوبکر النیسابوری:

موصوف نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کی خاطر عراق، شام اور مصر وغیرہ ممالک کی طرف سفر کیے اور آخری عمر میں بغداد کو اپنا مسکن بنایا۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ ان کے قوتِ حافظہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"لم نر مثله في مشايخنا ولم نر أحفظ منه للأسانيد والمتون وكان أفقه المشايخ جالس المزني والربيع"[1]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے امام دارقطنی رحمہ اللہ ہی سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک دن حفاظ حدیث کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے، جن میں حافظ ابو طالب رحمہ اللہ اور ابوبکر الجعابی رحمہ اللہ بھی موجود تھے۔ فقہا میں سے ایک شخص نے آ کر سوال کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے "جعلت لي الأرض مسجداً وجعلت تربتها طهورا" کے الفاظ سے حدیث کس کس صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، تو انھوں نے جواب دیا: فلاں اور فلاں سے۔ تو سائل نے کہا: "جعلت تربتها لنا طهورا" کے الفاظ کس نے بیان کیے ہیں تو اس کا جواب جب کسی سے بن نہ پڑا تو کہنے لگے: ابوبکر نیشاپوری رحمہ اللہ کے پاس چلو وہی اسے جانتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ ان کے پاس آئے اور اس حدیث کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فوراً وہ روایت بالاسناد بیان کر دی۔

① تاریخ بغداد (۱۰/۱۲۱)

② ایضاً

اس واقعہ سے ان کے قوتِ حافظہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ موصوف ۲۳۸ھ کو پیدا ہوئے اور ۳۲۴ھ بمطابق ۹۳۵ء کو فوت ہوئے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ان سے سنن میں متعدد روایات لی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سنن کا کوئی باب شاذ و نادر ہی ہوگا جس میں ان کی روایت مذکور نہ ہو تو غلط نہ ہوگا۔ السنن کی پہلی حدیث ان کے واسطے سے بھی بیان کی ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اٹھارہ سال کی عمر میں کس قدر احادیث کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

② عبداللہ رحمہ اللہ بن محمد بن عبدالعزیز ابن بنت احمد بن منیع ابوالقاسم البغوی:

اس دور کے ثقات محدثین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھیں امام احمد رحمہ اللہ اور علی بن مدینی رحمہ اللہ ایسے کبار مشائخ سے سماع کا شرف حاصل تھا۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ ان کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

"كان ثقة ثبتا مكثرا فهما عارفا"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ انھیں ثقہ، جبل، امام من الائمہ، ثبت، کہا کرتے اور فرماتے:

"كان أبو القاسم ابن منيع قلما يتكلم على الحديث فإذ تكلم كان كلامه كالمسمار في الساج"[2]

موصوف ۳۱۷ھ بمطابق ۹۲۹ء میں فوت ہوئے اس وقت ان کی عمر ایک سو تین (۱۰۳) سال تھی۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ان سے "سنن" میں متعدد روایتیں لی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے گیارہ سال کے قلیل عرصہ میں خوب تندہی اور محنت سے احادیث کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابو یوسف القواس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب بھی

---

① تاریخ بغداد (۱۰/۱۱۱)

② أيضاً (۱۰/۱۱۶)، تذكرة الحفاظ (۲/۷۷۴)

ہم امام ابو القاسم بغوی رحمہ اللہ کے پاس جایا کرتے دارقطنی رحمہ اللہ اس وقت بچے تھے اور ان کے ہاتھ پر روٹی اور سالن ہوتا۔[1] جس سے ان کے ذوق وشوق کا ثبوت ملتا ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ابن طاہر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ بسا اوقات، امام بغوی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہوئے تدلیس کرتے ہیں۔ اس الزام کی حقیقت اور اس کا جواب آیندہ ہم ''امام دارقطنی اور ان کے ناقدین'' کے تحت کریں گے۔ ان شاء اللہ

③ الحسین رحمہ اللہ بن اسماعیل بن محمد ابوعبداللہ الضبی القاضی المحاملی:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''الإمام العلامة الحافظ شيخ بغداد و محدثها'' کے الفاظ سے ان کا ترجمہ شروع کیا ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''كان فاضلا دينا صادقا''[2]

ابو بکر الداؤدی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں دس ہزار طالب علم، علم کی پیاس بجھانے کے لیے حاضر ہوا کرتے۔[3] خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ابو بکر الداؤدی رحمہ اللہ کے ساتھ المحاملی رحمہ اللہ کے ایک پر لطف مناظرہ کی روداد ذکر کی ہے۔ جس سے ان کے تبحرِ علمی اور حاضر جوابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی السنن کی پہلی حدیث ان کے واسطے سے بیان کی ہے۔ موصوف ۳۳۰ھ بمطابق ۹۴۱ء فوت ہوئے۔

④ دعلج رحمہ اللہ بن احمد بن دعلج ابو محمد المعدل:

بغداد کے مشہور حفاظِ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ طلبِ علم کے لیے

[1] تذکرۃ الحفاظ (۱۸۹/۳)

[2] تاریخ بغداد (۲۰/۸)، تذکرۃ الحفاظ (۴۲/۲)

[3] تاریخ بغداد (۲۱/۸)

خراسان، رے، حلوان، بصرہ، کوفہ، مکہ مکرمہ اور سجستان وغیرہ بلاد کا سفر کیا اور امام عثمان رحمہ اللہ بن سعید الدارمی، عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ، موسیٰ بن ہارون الحافظ رحمہ اللہ جیسے کبار محدثین سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔ موصوف علم کی دولت کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی نعمت سے بھی سرفراز تھے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ان کی سخاوت کے واقعات بھی ذکر کیے ہیں۔ ان ہی کا بیان ہے کہ جب انھوں نے المسند الکبیر لکھ کر ابن عقدہ رحمہ اللہ کے پاس بھیجی تو ہر دو ورق کے بعد ایک ایک دینار بھی رکھ دیا۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ابن حیویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعلج رحمہ اللہ ایک دفعہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور فرمایا یہاں سے آپ جس قدر مال لینا چاہتے ہو اٹھا لو، تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا: مجھے مال کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے مکہ مکرمہ، سجستان اور عراق میں محدثین کی خدمت کے لیے صدقات جاریہ مقرر کر رکھے تھے۔

المسند الکبیر کا جو نسخہ ابن عقدہ رحمہ اللہ کے پاس بھیجا تھا وہ دراصل امام دارقطنی رحمہ اللہ ہی نے امام دعلج رحمہ اللہ کے اصل نسخہ سے مرتب کیا تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كان أبو الحسن الدارقطني هو الناظر في أصوله والمصنف له كتبه .... وقال الدارقطني صنفت لدعلج المسند الكبير فكان إذا شك في حديث ضرب عليه"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرمایا کرتے کہ میں نے اپنے اساتذہ میں ان سے اثبت کسی کو نہیں دیکھا۔[2] موصوف ۳۵۱ھ بمطابق ۹۲۶ء کو فوت ہوئے۔ یاد رہے کہ

[1] تاریخ بغداد (۳۸۸/۸)

[2] العبر في خبر من غبر (۲۹۱/۲)

تذکرۃ الحفاظ کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں امام دعلج رحمہ اللہ کی کنیت ابو اسحاق مذکور ہے، حالانکہ "المنتظم" (١٦/٣٠) میں ان کی کنیت ابو محمد ہی ذکر کی ہے۔

⑤ محمد رحمہ اللہ بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ ابو الحسن البزار:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے مشہور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ان سے ہزاروں احادیث روایت کی ہیں۔ ابو بکر البرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كتب الدارقطني عن ابن مظفر ألف حديث و ألف حديث و ألف حديث فعدد ذلك مرات" ①

امام دارقطنی رحمہ اللہ انھیں انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے۔ محمد بن عمر القاضی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ ان کا اس قدر احترام کرتے کہ ان کے سامنے بھی ٹیک لگا کر نہ بیٹھتے۔ ②

محمد بن ابی الفوارس فرماتے ہیں:

"كان ثقة أميناً مأموناً حسن الحفظ وانتهىٰ إليه الحديث" ③

ابو الولید الباجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حافظِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں تشیع کا رنگ بھی پایا جاتا تھا۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے اسی شبہے کا اظہار جب ان کے شاگرد السلمی رحمہ اللہ نے کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ان میں تشیع انتہائی قلیل تھا جو ان شاء اللہ نقصان دہ نہیں ہے۔ ④

محمد بن علی الصوری رحمہ اللہ اپنے بعض مشائخ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم

---

① تاریخ بغداد (٣/٢٦٣)

② أیضاً، تذکرۃ الحفاظ (٣/١٧٨)

③ تاریخ بغداد (٣/٢٦٤)

④ تذکرۃ الحفاظ (٣/١٧٩) سؤالات السلمی (ص: ٢٩٣)

ابن معروف قاضی رحمہ اللہ کے حلقہ میں حاضر تھے، جب ابو الفضل الزہری رحمہ اللہ تشریف لائے تو ابن مظفر رحمہ اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو الفضل رحمہ اللہ کو اپنی مسند پر بٹھا دیا۔ پھر ابن معروف قاضی رحمہ اللہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: قاضی صاحب! آپ اس شخص کو جانتے ہیں یہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ اور ان کے تمام آبا و اجداد محدث چلے آتے ہیں، پھر کیا تھا ابن مظفر رحمہ اللہ کو ان کے آبا و اجداد کے واسطہ سے جس قدر جن مشائخ سے روایتیں پہنچی تھیں بیان کرتے رہے اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔[1]

موصوف جمادی الاولیٰ ۳۷۹ھ بمطابق ۹۸۹ء بروز جمعۃ المبارک کو فوت ہوئے۔

⑥ محمد رحمہ اللہ بن مخلد ابو عبداللہ الدوری العطار:

بغداد کے مشہور محدثین میں ان کا شمار ہے۔ امام مسلم بن حجاج، الزبیر بن بکار، یعقوب بن ابراہیم رحمہم اللہ جیسے کبار محدثین سے سماع کا شرف حاصل ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كان أحد أهل الفهم موثوقاً به في العلم متسع الرواية مشهوراً بالديانة موصوفاً بالأمانة مذكوراً بالعبادة"[2]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے انھیں ثقہ مامون کہا ہے۔ حسن بن ابی طالب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن مخلد رحمہ اللہ کا مکان بغداد کے مشرقی جانب تھا۔ کسب فیض کے لیے تلامذہ کو روزانہ جانا پڑتا۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آپ ہمیں زیادہ سے زیادہ احادیث سنایا کریں، کیوں کہ بُعدِ مسافت کے سبب روزانہ آمد و رفت مشکل ہے تو فرمانے لگے:

[1] تذکرة الحفاظ

[2] تاریخ بغداد (۳/۳۱۰)

تم یہاں تک نہیں آسکتے میں تو محدثین کے پاس مختلف مقامات پر حدیث سننے کے لیے جایا کرتا تھا۔[1]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كتب ما لا يوصف كثرة وعني بهذا الشأن وصنف و خرج"[2]

موصوف ۳۳۱ھ بمطابق ۹۴۲ء کو فوت ہوئے۔

⑦ محمد رحمہ اللہ بن القاسم بن محمد ابوبکر ابن الانباری النحوی:

مشہور حافظِ حدیث اور مفسر ونحوی ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انھیں ''الحافظ شیخ الاسلام'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''كان من أعلم الناس بالنحو والأدب وأكثرهم حفظاً وكان صدوقاً فاضلاً دينا خيراً من أهل السنة وصنف كتباً كثيرة في علوم القرآن''[3]

علامہ ابن العماد رحمہ اللہ نے ابن ناصر الدین سے نقل کیا ہے کہ وہ ہر فن میں امام تھے اور ہمیشہ زبانی احادیث لکھوایا کرتے۔[4] علمِ ادب کا یہ حال تھا کہ قرآن مجید کی تفسیر کے لیے تین لاکھ اشعار حفظ تھے۔ محمد بن جعفر النحوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان جیسا حافظ کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے سوال کیا کہ آپ کو کیا کچھ یاد ہے تو فرمانے لگے: یہ تیرہ (۱۳) صندوق جو کتابوں کے بھرے پڑے ہیں، سب کے سب یاد ہیں۔

---

① تاريخ بغداد (۳/۳۱۱)

② تذكرة الحفاظ (۳/٤٦)

③ تاريخ بغداد (۳/۱۸۲)، الأنساب للسمعاني (ورق: ٤٩)

④ شذرات الذهب (۲/۳۱٦)

نیز محمد بن جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كان أحفظ الناس للغة و نحو و شعر و تفسير قرآن فحدثت أنه كان يحفظ عشرين ومائة تفسير من تفاسير قرآن بأسانيدها" (1)

ابو العباس فرمایا کرتے تھے:

"كان آية من آيات الله في الحفظ" (2)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے بھی ان کی تصانیف کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے، جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

1) "غريب الحديث" (یہ پینتالیس ہزار (۴۵۰۰۰) ورق میں تھی)۔
2) "كتاب شرف الكافي" (یہ ایک ہزار (۱۰۰۰) ورق پر مشتمل تھی)۔
3) "كتاب الاضداد" خطیب فرماتے ہیں: "ما رأيت أكبر منه"

ان کے علاوہ "كتاب الهاآت، كتاب المشكل، الجاهليات، المذكر والمؤنث" وغیرہ جیسے اہم علوم پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔

علم و حفظ کے ساتھ ساتھ بہت بڑے زاہد تھے، حمزہ بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كان مع حفظه زاهداً متواضعاً" (3)

تواضع اور حق پسندی کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کے دن وہ حسب معمول احادیث املا کروا رہے تھے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں بھی وہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک راوی حیّان کو حبّان اور حبّان کو حیّان پڑھا، جس پر مجھے بڑا

---

(1) ایضاً، تاریخ بغداد (۱۸۲/۳)
(2) ایضاً
(3) تاریخ بغداد (۱۸۲/۳)

تعجب ہوا لیکن ان کی جلالتِ شان کی بنا پر بول نہ سکا۔ مجلس کے ختم ہونے کے بعد المستملی ۔ ہے آہستہ سے کہہ کر چلا گیا کہ یہ صحیح لفظ حیان ہے۔ آیندہ جمعہ جب دوبارہ وہاں گیے تو شیخ ابوبکر رحمہ اللہ نے المستملی سے کہا: فلاں جگہ ہم سے تصحیف ہوگئی تھی حاضرین کو صحیح کروا دو۔ ہمیں اس نوجوان (امام دارقطنی رحمہ اللہ) نے اس پر مطلع کیا۔[1]

⑧ عمر بن احمد بن مہدی رحمہ اللہ:

محدثین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے، جنھیں یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے والد بھی محدث تھے۔ ان میں سے امام دارقطنی رحمہ اللہ بھی ہیں۔ موصوف امام دارقطنی رحمہ اللہ کے والد تھے۔ ان سے امام صاحب نے تقریباً سات جگہ پر روایت کی ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ثقہ قرار دیا ہے۔[2]

ہم اس سلسلے کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے، ورنہ امام صاحب کے متعدد ایسے اساتذہ ہیں جو یکتائے زمانہ تھے۔ علم و حفظ کے اعتبار سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سنن میں امام صاحب رحمہ اللہ نے جن اساتذہ سے روایت لی ہے ان کی تعداد سوا دوسو (۲۲۵) سے متجاوز ہے۔

تلامذہ:

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے جس طرح لاتعداد مشایخ سے اکتسابِ فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بے شمار طلبہ وابستہ رہے اور سرچشمۂ سنت سے سیراب ہوتے رہے، جن میں چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

① ابو نعیم الاصبہانی رحمہ اللہ ② ابوبکر البرقانی رحمہ اللہ

---

① أيضاً (۱۸٤/۳)

② تاریخ بغداد (۲۳۹/۱۱)

ابو القاسم ابن بشران رحمہ اللہ ④ حمزہ بن محمد بن طاہر رحمہ اللہ

عبدالغنی بن سعید المصری رحمہ اللہ ⑥ ابو محمد الجوہری رحمہ اللہ

ابو القاسم التنوخی رحمہ اللہ ⑧ قاضی ابو الطیب الطبری رحمہ اللہ

ابو عبداللہ الحاکم صاحب المستدرک رحمہ اللہ ⑩ ابو ذر عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ

ابو طاہر بن عبد بن احمد الکاتب رحمہ اللہ ⑫ حمزہ السہمی رحمہ اللہ

ابو الغنائم بن المامون رحمہ اللہ ⑭ ابو الحسین بن المہتدی باللہ رحمہ اللہ

ابو حامد الاسفرائینی رحمہ اللہ

ابو مسعود صالح بن احمد بن القاسم المیانجی رحمہ اللہ

تمام رازی صاحبِ فوائد مشہورہ رحمہ اللہ

عبدالوہاب بن عبد رحمہ اللہ ۔ وغیرہم

ابو بکر البرقانی (م ۴۲۵ھ) جو امام دارقطنی رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد ہیں، کے نام
کرہ نویسوں نے اختلاف کیا ہے۔ محدث ڈیانوی ۔نور اللہ مرقدہ۔ نے
علیق المغني" کے مقدمہ میں ان کا نام یوں ذکر کیا ہے: "أبو بکر محمد
حمد بن غالب المعروف بالبرقاني" لیکن یہ صحیح نہیں۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ
یگر اصحاب الطبقات نے ان کا ذکر یوں کیا ہے:

"الإمام الحافظ شیخ الفقهاء والمحدثین أبو بکر أحمد بن محمد بن أحمد بن غالب الخوارزمي البرقاني الشافعي شیخ بغداد"①

---

① ذکرۃ الحفاظ (۲۵۹/۳) العبر (۱۵۶/۳) مشتبه النسبة (ص: ۳٤) شذرات الذهب (۲۲۸/۳) البدایة (۳٦/۱۲) تاریخ بغداد (۳۷٥/٤) طبقات الشافعیه (۹/۳)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر کا نام احمد ہے اور محمد ذکر کرنے میں محدث ڈیانوی رحمہ اللہ سے سہو ہوا ہے۔ یا کاتب سے ''احمد بن'' کے الفاظ نقل نہ کرنے میں سہو ہوا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم

اس کے علاوہ طرح التثریب جلد اول (ص: ۹۶) میں البرقانی کا نام ابو منصور محمد بن محمد بن احمد البرقانی ذکر کیا ہے۔ رجال وسیر کی جن کتابوں تک ہمیں رسائی ہوئی ہے۔ ان میں ابو منصور البرقانی نامی کوئی راوی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ ابو منصور نوقانی ہیں۔ جو امام دارقطنی رحمہ اللہ کے شاگرد اور ان کی سنن کے راوی ہیں۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''أبو منصور محمد بن محمد بن أحمد النوقاني حدث عن الدارقطني بالسنن'' (1)

لہذا البرقانی رحمہ اللہ کی کنیت ابو منصور ذکر کرنا درست نہیں۔ البرقانی فتحہ باء اور سکون راء کے ساتھ ہے۔ علامہ سمعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''البرقان بفتح الباء المنقوطة بواحدة وسكون الراء المهملة وفتح القاف، هذه النسبة إلى قرية من قرىٰ كانت نواحي خوارزم'' (2)

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ امام دارقطنی کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''و عبدالغنی منذری صاحبِ ترغیب و ترہیب ..... از روئے تلمذ و شاگردی

← الأنساب للسمعاني (ورق: ٧٤) الرسالة المستطرفه (ص: ٢٤) وغيرهم

(1) مشتبه النسبة (ص: ٣٤-٣٧)

(2) الأنساب للسمعاني (ورق: ٧٤)

کردہ اند۔"[1]

لیکن حافظ منذری رحمہ اللہ صاحبِ ترغیب وترہیب امام دارقطنی رحمہ اللہ سے ...ت
...ہیں اور ان کا نام عبدالعظیم زکی الدین (م ۶۵۶ھ) ہے۔ عبدالغنی جو ...م
...نی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ الازدی المصری (م ۴۰۹ھ) صاحبِ کتاب المؤتا...
...ت ہیں۔

اد... ولغت:

علمائے سلف علمِ ادب ولغت کے بغیر کلام اللہ میں گفتگو کرنا ناجائز تصور کرتے
...یہی وجہ ہے کہ کبار محدثین ومفسرین کے تراجم میں یہ جملہ پایا جاتا ہے: "کان
في اللغة والعربية" اور کبھی یہ لکھا ہوتا ہے۔ "جمع العلم والفقه
...ب واللغة" اس لیے علمائے سلف دیگر علوم کے ساتھ علمِ ادب ولغت سے ...را
...رکھتے اور اس میں عبور حاصل کرتے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ بھی دیگر محدثین کی طرح علمِ حدیث کے علاوہ علمِ ادب ولغت
...طولیٰ رکھتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو نہ صرف ادب ہی سے گہرا تعلق ...
...حدیث کے علاوہ بھی ہر فن سے دلچسپی تھی۔

ابو القاسم الزہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جس علم کا تذکرہ آتا تو ان کے پاس
...ت کا ذخیرہ ہوتا۔ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ بسیار خوردوں کے بارے ...
...ت اور عجیب وغریب واقعات اس قدر سنائے کہ رات کا اکثر حصہ بیت گیا۔[2]
فصاحت اور لغت پر دسترس کا اندازہ الازہری رحمہ اللہ کے اس قول سے ہوتا ...

---

[1] ...ن المحدثین (ص:۴۹)

[2] ...یخ بغداد (۳۶/۱۲) تذکرۃ الحفاظ (۱۸۸/۳) طبقات الشافعیہ (۳۱۱/۳)

جسے خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے یوں ذکر کیا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ جب مصر پہنچے تو وہاں مسلم رحمہ اللہ بن عبید اللہ المظفری نامی مدینہ کے ایک علوی شیخ تھے۔ ان کے پاس کتاب الانساب خضر رحمہ اللہ بن داود وزبیر رحمہ اللہ بن بکار کی روایت سے تھی جو انساب کے علاوہ اشعار کا بھی مجموعہ تھا۔ مسلم رحمہ اللہ خود میدانِ فصاحت کے بڑے شہسوار اور عربی زبان کے ماہر تھے۔ لوگوں نے امام دارقطنی رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ آپ ہمیں کتاب النسب پڑھ کر سنائیں۔ آپ نے اسے قبول فرمایا اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا۔ وقت مقررہ پر بڑے اہتمام سے مجلس ترتیب دی گئی۔ مصر کے تمام اصحابِ علم و ادب اور فضل و کمال اس ارادے سے شریک ہوئے کہ دارقطنی رحمہ اللہ کی غلطیوں پر گرفت کی جائے، لیکن اپنے ارادے میں ناکام رہے۔ ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ شیخ علوی رحمہ اللہ سے رہا نہ گیا تو بے ساختہ چلا اٹھے۔ ”وعربية أيضاً“، یعنی آپ کو عربی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔[1] انھیں شعرا کے متعدد دیوان ازبر تھے۔ من جملہ دواوین ”سید حمیری“ کا دیوان بھی انھیں یاد تھا، اس لیے ان پر شیعہ ہونے کا الزام ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ شیعہ تھے؟

یہ تو ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ ”سید حمیری“ کے دیوان کے حافظ تھے۔ اسی وجہ سے بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں شیعیت کی طرف منسوب کیا ہے۔

سید حمیری جس کا نام اسماعیل بن محمد بن یزید کنیت ابو القاسم اور لقب سید ہے۔ مشہور ادبا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ابو عمر نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ”سید الشعراء“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔[2]

---

[1] تاریخ بغداد (۳۶/۱۲)

[2] رجال کشی (ص: ۲۴۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وكان رافضيا خبيثا"[1]

"وہ بڑا دریدہ دہن اور گستاخ رافضی تھا۔"

ایسے شخص کا پورا دیوان یاد ہونے کی بنا پر امام دارقطنی رحمہ اللہ کو تشیع کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولهذا نسب إلى التشيع"[2]

اور وفیات الاعیان میں ہے:

"فنسب إلى التشيع من ذلك"

اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے ان الفاظ سے بھی استدلال کیا گیا ہے، جو انھوں نے امام جوزجانی رحمہ اللہ صاحب "احوال الرجال" جو ضعیف راویوں پر مشتمل ہے کے متعلق کہے ہیں۔ جس سے تشیع کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہیں:

"وكان فيه انحراف عن علي"[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے بعد السلمی کے واسطہ سے ایک واقعہ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک روز امام ابو اسحاق ابراہیم بن یعقوب جوزجانی رحمہ اللہ نے مرغی کا بچہ ذبح کروانے کے لیے اپنی لونڈی کو بھیجا، لیکن اتفاق سے کوئی اسے ذبح کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے فرمایا: "سبحان اللہ! یہ لوگ مرغی کا بچہ ذبح کرنے سے کتراتے ہیں، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن میں بیس ہزار سے زائد مسلمانوں کو قتل کروا ڈالا تھا۔"

---

[1] المیزان (۱/۴۳٦)

[2] تذکرۃ الحفاظ (۳/۱۸۷)

[3] تہذیب التہذیب (۱/۱۸۲)

لیکن یہ سند صحیح نہیں ہے، کیوں کہ السلمی جن کا نام محمد بن حسین النیسابور
ہے۔ ولاً: وہ خود متکلم فیہ ہے۔ ثانیاً: امام دارقطنی رحمہ اللہ کی پیدائش سے قبل جوز جانی
۲۵۶ یا ۲۵۹ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ البتہ معجم البلدان میں جوز جان کے تحت یہ قصہ
بواسطہ عبداللہ بن احمد بن عدبس مذکور ہے اور تاریخ بغداد (۳۸۴/۹) اور تہذیب
ابن عساکر (۲۸۸/۷) وغیرہ میں گو ابن عدبس کا ترجمہ منقول ہے، لیکن اس کی تو
وغیرہ کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ علامہ عبدالرحمان الیمانی رحمہ اللہ نے "التنکیل لما
تأنیب الکوثري من الأباطیل" میں اس قصہ پر مفصل نقد کیا ہے۔[1]

تاہم واقعہ یہ ہے کہ امام جوز جانی رحمہ اللہ میں نصب پایا جاتا تھا۔ حافظ ابن حجر
اسمٰعیل بن ابان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"الجوزجاني كان ناصبيا منحرفا عن علي فهو ضد الشيعي
المنحرف عن عثمان"[2]

تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح
کی ہے اور تہذیب (۱۸۲/۱) میں کہا ہے کہ امام جوز جانی کی کتاب سے اس
تصدیق ہوتی ہے۔ بنابریں امام دارقطنی رحمہ اللہ کے قول: "كان فيه انحراف
عليّ" سے یہ کیونکر لازم ہے کہ وہ خود شیعہ تھے، حالانکہ اس قسم کا اظہار تو امام
عدی رحمہ اللہ نے بھی امام جوز جانی کے متعلق کیا ہے، فرماتے ہیں:

"كان شديد الميل إلى مذهب دمشق في الميل على علي"[3]

تو کیا انھیں بھی شیعہ کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ جہاں تک جوز جانی رحمہ اللہ

[1] التنكيل (۱۰۰/۱)
[2] هدي الساري (ص: ٤٥٢)
[3] تهذيب التهذيب (۱۸۲/۱)

...نی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كان من الحفاظ المصنفين والمخرجين الثقات" ①

لہٰذا امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مذکور قول کہ "كان فيه انحراف عن علي" ان ... شیعہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اہلِ سنت کے عقیدہ کے تناظر میں انھوں نے ...ام کیا ہے۔

رہی بات سید حمیری کا دیوان یاد کرنے کی تو اس سے بھی ان کا شیعہ ہونا لازم ...ں آتا، جب کہ وہ خود سید حمیری جیسے غالی شیعہ کی تردید ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"كان يسب السلف في شعره ويمدح عليا رضي الله عنه" ②

کیا شیعہ نظریات کا حامل شیخین رضی اللہ عنہما کو سلف کے الفاظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟

... ان وجوہ باردہ کی بنا پر انھیں شیعہ کہنا یا تشیع کی طرف منسوب کرنا قطعاً درست نہیں ... یہی وجہ ہے کہ متعدد حضرات نے اس الزام کی جابجا تردید کی ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ما أبعده من التشيع" ③

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یحییٰ بن الحسین کے ترجمہ میں اس الزام کا ...ب دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"هذا لا يثبت عن الدارقطني" ④

"امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرف تشیع کی نسبت درست نہیں۔"

---

① ...ذيب التهذيب (١/١٨٢)

② ...ان الميزان (١/٣٣٦)

③ ...رة الحفاظ (٣/١٨٧)

④ ...ان الميزان (٦/٢٤٩)

ہمارے اس دعوے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے ''ابن عقدہ'' جن کا نام احمد بن محمد ہے اور امام دارقطنی رحمہ اللہ کے استاد ہیں وہ چونکہ غالی شیعہ تھے، جیسا کہ حافظ ابن عدی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''سمعت ابن عقدة يثني على أبي مريم، يطريه وتجاوز الحد في مدحه حتى قال لو ظهر أبو مريم ما اجتمع إلى شعبة، قال: وإنما مال إليه ابن عقدة هذا الميل لإفراطه في التشيع'' (1)

ابو مریم (عبدالغفور بن قاسم رافضی) کے متعلق ابن عقدہ کا یہ کہنا کہ اگر وہ ظاہر ہو جاتے تو امام شعبہ رحمہ اللہ کے پاس لوگ نہ جاتے، اس پر دال ہے کہ ان میں حد درجہ کا تشیع تھا۔

اسی بنا پر امام دارقطنی رحمہ اللہ ان سے نالاں تھے، چنانچہ ان کے شاگرد ''السلمی'' نے ایک مرتبہ جب اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا:

''حافظ محدث ولم يكن في الدين بقوي ولا أزيد علىٰ هذا''

حمزہ بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کو یہ فرماتے سنا:

''هذا رجل سوء. يشير إلى الرفض'' (2)

خلاصہ یہ کہ جب ایک شخص جو اپنے استادِ محترم جن کی قوتِ حافظہ کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہو:

''لوگوں کے پاس جو کچھ ہے ابن عقدہ اسے جانتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس تھا لوگ اسے نہیں جانتے۔''

(1) لسان الميزان (٤/٤٣)

(2) لسان الميزان (١/٢٦٤)

لیکن جب وہ اس میں شیعیت کی بو پاتا ہے تو اسے معاف نہیں کرتا، بلکہ باشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے: ”ھو رجل سوء“ تو خود ایسے شخص پر شیعیت کا الزام کس قدر لچر اور بے ہودہ ہے۔ ابن عقدہ ہی نہیں، بلکہ اور بہت سے راویوں پر بھی انھوں نے ان کے تشیع کی بنا پر کلام کیا ہے، جسے ان کی الضعفاء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس نسبت کی تردید کی ہے، جیسا کہ ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں۔ رہی اس سلسلے میں ان کے عقیدہ کی وضاحت تو السلمی بیان فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بغداد میں ایک دفعہ یہ اختلاف پیدا ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ؟ بالآخر یہ نزاع میرے پاس پہنچا۔ ابتداءً تو میں نے سکوت اختیار کیا، لیکن پھر خاموش نہ رہ سکا تو کہا:

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک بالاتفاق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور اہلِ سنت کا یہی عقیدہ ہے۔“ [1]

اسی طرح السلمی نے ذکر کیا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا: عبدالعزیز رحمہ اللہ بن صہیب البنانی کے پاس یونس بن خباب آئے تو عبدالعزیز نے ان کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا۔ یونس نے کہا: شاید تم ان ناصبیوں میں سے ہو جو اس عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں۔ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں کو قتل کیا۔ تو عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: جب ایک بیٹی کو عثمان رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تو دوسری بیٹی کی شادی ان سے کیوں کی؟ [2]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ ان کے عقیدہ کی صراحت ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں:

---

[1] سؤالات السلمی (ص: ۲۳۸)

[2] سؤالات السلمی (ص: ۲۳۷)

"انتهی إلیه علم الأثر .... مع صحة الاعتقاد وسلامة المذهب"①

جبکہ ان کا عقیدہ صحیح اور درست تھا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام موصوف رحمہ اللہ کی طرف تشیع کی نسبت قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور ''سید الحمیری'' کے دیوان کو یاد کر لینا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ شیعہ تھے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے السیر (۱۶/ ۴۵۷) اور مختصر العلو (ص: ۳۵۴) میں انھیں سلفی المذہب قرار دیا ہے۔

ذکاوت و حافظہ:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کو قوتِ حفظ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وافر حصہ ملا تھا۔ محدثین رحمہم اللہ کے حافظہ کے متعلق جو تاریخی روایات مشہور ہیں اس کا ایک نمونہ اور مصداق آپ بھی تھے۔

چنانچہ ابو القاسم الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ انھیں اسماعیل الصفار رحمہ اللہ (م ۳۴۱ھ) کی مجلس املا میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ محدث موصوف رحمہ اللہ املا کروا رہے تھے اور امام دارقطنی رحمہ اللہ کے پاس ایک رسالہ تھا جسے وہ نقل کر رہے تھے اور سماع بھی جاری تھا۔ حاضرین مجلس میں سے اس پر کسی نے ٹوکا اور کہا تمھارا سماع درست نہیں۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ میرا ذوق تم سے نرالا ہے، یعنی سماع کے ساتھ میں لکھ بھی رہا ہوں اور سماع میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ مزید فرمایا کہ معلوم ہے کہ شیخ نے اب تک کتنی روایات لکھوائی ہیں؟ تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ امام موصوف نے فرمایا: شیخ نے اب تک کل اٹھارہ حدیثیں لکھوائی ہیں۔ شمار کرنے پر معلوم

① تاریخ بغداد (۱۲/ ۳٤)

ہوا کہ واقعی اٹھارہ تھیں۔ بعدۂ انھوں نے فرمایا: پہلی روایت فلاں راوی فلاں متن کے ساتھ مروی ہے اور دوسری روایت کی سند یہ ہے اور متن یہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان اٹھارہ احادیث کو مع الاسناد حرف بہ حرف سنا دیا۔ حاضرین یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئے۔ (1)

ابو بکر رحمہ اللہ البرقانی فرماتے ہیں: میں اکثر امام دارقطنی رحمہ اللہ کی تعریف، حافظ ابو مسلم رحمہ اللہ ابن مہران کے پاس کرتا تھا۔ انھوں نے ایک روز فرمایا: ''تم دارقطنی کا حافظہ بیان کرنے میں بڑا افراط کرتے ہو، جاؤ الرضراض عن ابن مسعود کی حدیث کے بارے میں ان سے سوال کرو۔'' چنانچہ میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کے ہاں حاضر ہوا اور ان سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ''یہ تمھارا مسئلہ نہیں، تمھیں کسی نے یہ سوال کرنے کے لیے بھیجا ہے، بتاؤ وہ کون ہے؟'' پہلے میں نے نام بتانے سے انکار کیا مگر بالآخر بتلانا پڑا تو انھوں نے اس کی تمام اسانید بیان فرما دیں اور میں نے اسے لکھ کر ابو مسلم کو پہنچا دیا اور العلل میں انھیں نقل کیا۔ (2)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ جو حافظ مشرق کے لقب سے مشہور ہیں، ان کے متعلق ایک مؤدب کہتے ہیں کہ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا: ''آپ حافظ ابو بکر ہیں؟'' تو انھوں نے جواب دیا بھائی میں تو احمد بن علی الخطیب ہوں۔ حافظہ تو امام دارقطنی رحمہ اللہ پر ختم ہو گیا ہے۔ (3)

علامہ سمعانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''كان يضرب به المثل في الحفظ'' (4)

---

(1) تاریخ بغداد (۳۶/۱۲) تذکرۃ الحفاظ (۱۸۷/۳) طبقات الشافعیہ (۳۱۱/۳)

(2) تاریخ بغداد (۳۸/۱۲) العلل (۲۳۵/۵)

(3) تذکرۃ الحفاظ (۳۱۷/۳)

(4) الانساب (ورق: ۲۱۷)

”ان کا حافظہ ضرب المثل تھا۔“

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

”الامام شیخ الإسلام حافظ الزمان“[1]

ازہری فرماتے ہیں کہ میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مجلس میں حاضر ہوا تو ابوالحسین البیضاوی ایک اجنبی آدمی کے ساتھ تشریف لائے اور کہا کہ اسے احادیث لکھوا دیں تو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بیٹھے بیٹھے زبانی بیس سے زائد احادیث نقل کروا دیں اور لطف یہ کہ تمام کا متن یہ تھا: ”نعم الشیء الهدیة أمام الحاجة“ چنانچہ وہ یہ احادیث لکھ کر چلا گیا تو دوسرے دن امام موصوف کے لیے کوئی چیز بطورِ تحفہ پیش خدمت کی۔ آپ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور زبانی سترہ احادیث لکھوا دیں جن کا متن یہ تھا:

”إذا جاء کم کریم قوم فأکرموه“

اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”إنما یخضع للدارقطني لسعة حفظه الجامع، لقوة الحافظة ولقوة الفهم والمعرفة“[2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ قول امام دارقطنی رحمہ اللہ کے علم و فضل اور قوتِ حافظہ پر سند کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہاں اس بات کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ حافظ ابن جوزی نے ان روایات کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور اس پر انتہائی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

”واعجباً من الدارقطني کیف روی حدیثین لیس فیهما

---

[1] تذکرۃ الحفاظ (۱۸۶/۳)

[2] تذکرۃ الحفاظ (۱۸۹/۳)

مالم يصح عن رسول الله ﷺ ولم يبين"[1]

لیکن علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کا یہ تعجب محلِ نظر ہے اسے زیادہ سے زیادہ ضعیف تو کہا جا سکتا ہے، موضوع نہیں۔ چنانچہ علامہ المناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وحكم ابن الجوزي بوضعه وتعقبه العراقي وتلميذه بأنه ضعيف لا موضوع"

بلکہ یہ روایت بایں الفاظ "إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه" گیارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور وہ یہ ہیں:

''ابن عمر، جریر بن عبداللہ، ابو ہریرہ، معاذ، ابو قتادہ، جابر بن عبداللہ، ابن عباس، عبداللہ بن ضمرہ، عدی بن حاتم، ابو راشد، انس بن مالک رضی اللہ عنہم''

امام حاکم رحمہ اللہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہی روایت نقل کر کے لکھا ہے:

"هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه بهذه السياقة"[2]

اسی طرح علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الجامع الصغیر میں اسے ذکر کرتے ہوئے اس کی صحت کی علامت لگائی ہے۔[3] بلکہ "اللآلئ" میں تو "عند البعض المتواتر" کے الفاظ مذکور ہیں۔

شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی "الصحيحة" (١٢٠٥) میں اسے حسن کہا ہے۔ نیز دیکھیے: المقاصد الحسنة (ص: ٣٢، ٣٣)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا کلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[1] كتاب الموضوعات (٩١/٣)

[2] المستدرك (٢٩٢/٤)

[3] الجامع الصغير (١٣/١)

"قلت: بل واعجباً من المؤلف كيف يحطم على رد الاحاديث الثابتة من غير تثبت ولا تتبع"[1]

اس کے بعد انھوں نے پہلی روایت کے مختلف طرق ذکر کیے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ کا یہ الزام صحیح نہیں ہے۔

رہی دوسری روایت تو وہ سخت ضعیف ہے، حتی کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔[2]

علامہ سیوطی نے بھی اللآلئ المصنوعة (۲/۲۹۸، ۲۹۹) میں اس کا کوئی دفاع نہیں کیا۔

امام دارقطنی کے حفظ و ضبط کی زندہ مثال ان کی "العلل" ہے، جسے انھوں نے زبانی املا کروایا تھا، جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آئے گی۔ (ان شاء اللہ) ان کے تلمیذ رشید امام حاکم رحمہ اللہ کے قول پر ہم اس عنوان کو ختم کرتے ہیں۔

"صار الدارقطني أوحد عصره في الحفظ والفهم والورع"[3]

علمی مرتبہ:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی قوتِ حافظہ کا اندازہ تو ہو چکا، یہی وجہ تھی کہ ان کی مجلس میں بڑے بڑے حفاظِ حدیث جن کے علم و فضل کا چرچا تھا وہ بھی ان کے سامنے بات کرنے سے کتراتے تھے۔

محمد بن عمر الداودی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام دارقطنی رحمہ اللہ اور ابن شاہین رحمہ اللہ ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ لیکن ابن شاہین رحمہ اللہ پر یہ کیفیت طاری تھی کہ ابو الحسن

[1] اللآلئ المصنوعة (۲/۲۹۹)
[2] الضعيفة (رقم: ۷۵٤)
[3] تذكرة الحفاظ (۳/۱۸۷)

دارقطنی رحمہ اللہ کے رعب کی وجہ سے وہ بول نہیں رہے تھے مبادا غلطی نہ ہو جائے۔ [1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ اپنے اساتذہ کی نظر میں:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی تعریف میں جہاں ان کے معاصرین، تلامذہ اور دیگر تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں وہاں ان کے اساتذہ بھی انھیں بڑی قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے البرقانی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے دارقطنی رحمہ اللہ کو کہتے سنا کہ میں نے محمد بن قاسم سودانی رحمہ اللہ کے واسطے سے چند ایسی احادیث سنیں، جن میں وہ منفرد تھے۔ میں اس کی تصدیق کے لیے ان کے پاس کوفہ گیا۔ جب وہاں پہنچا تو ابو العباس ابن عقدہ بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر وہ احادیث لکھ کر ان کے سامنے پیش کر دیں۔ ابو العباس ابن عقدہ رحمہ اللہ نے انھیں ایک نظر دیکھا اور بغیر پڑھے وہ ورقہ ایک طرف رکھ دیا اور کہا: یہ بغدادی لوگ ایسی روایات پیش کرتے ہیں، جنھیں ہم بھی نہیں سنتے۔ اس کے بعد انھوں نے سودانی رحمہ اللہ پر قراءت شروع کر دی تو ناگہاں وہ ایسی روایت پر پہنچے، جسے میں نے لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس پر میں نے کہا: یہ حدیث ان احادیث سے ایک ہے، جنھیں میں نے پیش کیا ہے، انھوں نے دھیان نہ دیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے دوبارہ عرض کی یہ حدیث بھی میری ان احادیث سے ہے، جنھیں میں لکھ کر لایا ہوں۔

میں یہ کہہ کر واپس اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا اور آتے ہی مجھے بخار ہو گیا جس کی وجہ سے دوبارہ مجلس میں نہ جا سکا۔ ایک دن میں اسی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ وہاں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پوچھا کون؟ تو جواب ملا، ابن سعید

[1] ایضاً (۱۸٤/۳)

ہوں۔ میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ استاد ابو العباس ابن عقدہ رحمہ اللہ تشریف فرما ہیں۔ ان کے گلے سے چمٹ گیا اور عرض کی: حضرت! آپ نے یہاں تشریف لانے کی زحمت کیوں فرمائی؟ حکم بھیج دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔ فرمانے لگے: بھائی ہم نے تمھارے واپس لوٹ آنے کے بعد تمھیں پہچانا۔ ان الفاظ سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: تم مجلس میں کیوں نہیں آئے؟ میں نے عرض کی: بخار میں مبتلا رہا ہوں، اسی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا۔ انھوں نے فرمایا: آپ مجلس میں تشریف لایا کریں اور جو چاہیں پوچھا کریں۔ دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے بعد جب کبھی ان کی مجلس میں جاتا وہ میری بڑی عزت کرتے اور اپنے پاس اونچی جگہ پر بٹھاتے۔[1]

خطیب رحمہ اللہ نے اپنے استاذ الخلال رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ محدثین کی ایک جماعت بیٹھی تھی، جن میں ابو الحسن ابن المظفر رحمہ اللہ، قاضی ابو الحسن الجراحی رحمہ اللہ اور دیگر مشایخ بھی تھے تو نماز کا وقت آ گیا۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی نماز پڑھانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ حالانکہ وہاں ان سے عمر کے اعتبار سے بڑے شیوخ بھی موجود تھے۔[2]

اس قسم کے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مقام ان کے اساتذہ کی نظر میں کیا تھا، جس سے بڑھ کر عزت و منزلت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

فقر و فاقہ:

محدثین کرام رحمہم اللہ کی ایک جماعت فقر و فاقہ میں مبتلا رہی اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا حوصلہ ختم کر دینے اور ہمت کو ہرا دینے والی کوئی چیز غالبًا افلاس سے بڑھ کر

[1] تاریخ بغداد (۳۷/۱۲)

[2] أیضاً

ـ۔ جس میں پھنس کر انسان عزم و استقلال کھو بیٹھتا اور دل و دماغ کی شگفتگی کھو
تا ہے، لیکن محدثین عظام ۔شکر اللہ سعیھم۔ کے لیے اس قسم کی مشکلات ان
شاہراہ علم کے لیے سد راہ نہ بن سکیں۔ کیوں کہ وہ عزم و استقلال کے علاوہ علم ین
ذت میں اس قدر سرشار رہتے کہ انھیں اپنی تکالیف کا احساس تک نہ ہوتا۔

تذکرہ نویسوں نے محدثین کے تذکرہ میں اس قسم کے متعدد واقعات نقل کیے
ان ہی شخصیتوں میں ایک امام دارقطنی رحمہ اللہ بھی تھے۔

طلبِ علم کی زندگی ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد بھی ان کی زندگی نہایت فقر و مسکنت
زری۔ مصر میں آپ ۳۵۷ھ میں تشریف لے گئے اور وہاں کے جن شیوخ سے
ادہ کیا ان میں ایک ''حافظ ابو الفضل جعفر بن فضل المعروف بابن خنزابتہ رحمہ اللہ''
تھے، انھوں نے آپ کی عزت کے ساتھ ساتھ امداد بھی کی۔ ابو الفضل رحمہ اللہ وقت
۔ وزیراعظم ہونے کے علاوہ بہت بڑے محدث بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ امام
نی رحمہ اللہ کا ان کی طرف سفر کرنا محض دولت کی غرض سے نہ تھا، بلکہ اصل مقصد
لِ علم تھا۔ چنانچہ ''کتاب المدبج'' میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ان سے روایت
قل کی ہیں۔[1]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کا ان کے پاس جانے کی وجہ بیان
تے ہوئے لکھا ہے کہ ابو الفضل رحمہ اللہ مصر میں احادیث لکھوایا کرتے تھے اور ان کا
تھا کہ ایک مسند لکھوائی جائے تو امام دارقطنی رحمہ اللہ وہاں گئے اور کافی عرصہ تک ان
پاس رہے اور المسند کی تصنیف کی اور ابو الفضل رحمہ اللہ نے انھیں کافی مال دیا۔[2]

1 تذکرۃ الحفاظ (۲۱۲/۳) البدایۃ (۳۱۷/۱۱)

2 تاریخ بغداد (۲۳٤/۷)

نرم مزاجی وانکساری:

امام دارقطنی رحمہ اللہ نہایت منکسر المزاج اور رقیق القلب تھے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے استاد ابوبکر الرملی ابن النابلسی رحمہ اللہ جو قید کر کے تختہ دار پر لٹکائے گئے تھے، جب ان کا تذکرہ کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے اور فرماتے جب ان کی چمڑی ادھیڑی جا رہی تھی تو اس وقت یہ آیت ان کی زبان پر تھی:

﴿ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٨][1]

انکساری کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے:

"من أحب أن ينظر قصور علمه فلينظر في علل حديث الزهري لمحمد بن يحيىٰ الذهلي"[2]

حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ الازدی المصری جو آپ کے ارشد تلامذہ سے ہیں، فرماتے ہیں کہ جب میں المؤتلف لکھنے لگا تو امام دارقطنی رحمہ اللہ میرے پاس آئے۔ اس سلسلے میں میں نے ان سے استفادہ کیا اور ان تمام مضامین کو المؤتلف میں جمع کر دیا۔ جب تصنیف سے فارغ ہوا تو امام موصوف نے مجھے کہا اس کی قراءت کرو۔ میں نے عرض کی: حضرت! یہ سب کچھ آپ ہی کا تو فیض ہے۔ فرمانے لگے: نہیں نہیں مجھ سے تو نے تھوڑی سی روایات دریافت کی ہیں۔ دوسرے شیوخ کی مسموعات بھی تو تو نے اس میں جمع کی ہیں، چنانچہ ان کے اس اصرار پر مجھے اس کی قراءت کرنا پڑی۔[3]

رجاء بن محمد المعدل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام دارقطنی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ کیا اپنے جیسا متبحر عالم آپ نے دیکھا ہے، فرمانے لگے:

---

[1] معجم البلدان (٤/٧٢٤)

[2] تذكرة الحفاظ (٣/١٠٢)

[3] تذكرة الحفاظ (٣/٢٣٦)

"قال اللّٰہ تعالیٰ: فلا تزکوا انفسکم"[1]

…یثِ نعمت:

اللہ جل شانہ نے آپ کو جس علم وفضل کی دولت سے نوازا تھا اسے وہ اچھی
… سمجھتے تھے اور کبھی کبھار تحدیثِ نعمت کے طور پر اس کا ذکر بھی کرتے۔ قاضی
… طیب الطبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مجلس میں
… ہوا تو آپ "الوضوء من مس الذکر" کی احادیث بیان فرما رہے تھے،
… فارغ ہوئے تو فرمایا:

"اگر آج احمد رحمہ اللہ بھی ہوتے تو وہ ان احادیث سے استفادہ کرتے۔"[2]

ابو القاسم الازہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ابن ابی الفوارس رحمہ اللہ نے امام
…نی رحمہ اللہ سے ایک حدیث کی علت یا اس کے راوی کے متعلق سوال کیا، جب وہ
… دے چکے تو فرمایا: "یا أبا الفتح لیس بین المشرق والمغرب من
… هذا غیري"[3]

نیز فرمایا کرتے: اے اہلِ بغداد جان لو جب تک میں زندہ ہوں کسی کو
…م صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی جرأت نہیں۔[4]

امام دارقطنی رحمہ اللہ اور ان کے معاصرین

اس سلسلے کو ہم دو انواع پر تقسیم کرسکتے ہیں: ایک باعتبار منافرت وغیرہ کے ا…

---

1 …(۱۸۸/۳)

…خ بغداد (۳۸/۱۲) طبقات الشافعیه (۳۱۱/۲)

…خ بغداد (۳۹/۱۲) طبقات الشافعیه (۳۱۱/۲)

… الموضوعات (۴۵/۱)

ایک ...عتبار فضل و مرتبت کے۔ مشہور ہے: "المعاصرة أصل المنافرة" ا...
بڑے بڑے محدثین بھی اس بشری کمزوری سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ بنابریں محدثی...
کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ معاصر کی بلا سبب جرح قبول نہیں ہوتی۔ امام نسائی رحمہ اللہ
کے ...مد بن صالح رحمہ اللہ، ابراہیم النخعی رحمہ اللہ کے شعبی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے ا...
اسحاق رحمہ اللہ کے متعلق جو اقوال جرح و تعدیل کی کتابوں میں منقول ہیں وہ دراصل ا...
قبیل سے ہیں، جن کی طرف محققین نے التفات تک نہیں کیا۔

تاہم امام دارقطنی رحمہ اللہ کا دامن اس قسم کی آلودگیوں سے بالکل مبرا تھا۔ ا...
زمانہ کے اصحابِ فضل ہی نہیں، بلکہ اپنے تلامذہ کی تعریف و توصیف میں بھی ...
رطب اللسان نظر آتے ہیں، چنانچہ جب مصر سے واپس آئے تو "البرقانی" نے دریاف...
کیا ...پ نے کسی کو ایسا پایا جو علم و فہم کا مالک ہو تو اس کے جواب میں فرمایا: ہاں ا...
نوجوان عبدالغنی جو آگ کا شعلہ تھے۔ پھر ان کے بارے میں بڑے توصیفی کلما...
کہے۔ منصور بن علی الطرسوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب امام دارقطنی رحمہ اللہ نے مصر ...
چلے جانے کا ارادہ کیا تو ہم انھیں الوداع کہنے آئے۔ ہم سے رہا نہ گیا تو ان کی جدائی ...
رونا شروع کر دیا۔ فرمانے لگے: روتے کیوں ہو عبدالغنی جو تمھارے پاس ہے۔

عبداللہ بن ابراہیم الاصیلی رحمہ اللہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے اس شان کا ...
میں... آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ الغرض اس قسم کے اور بھی واقعات اس بات ...
شہادت دیتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ میں معاصرت کی بنا پر منافرت جو ایک ...
کمزوری اور قدرتی امر ہے، سے مبرا تھے۔ بلکہ وہ ہر صاحبِ فضل کا اعتراف کر...
اور اس سے استفادہ کرتے۔

(1) تذکرة الحفاظ (۳/۳۳۶)

رہی بات فضل و مرتبت کی تو جس کو رجال و سیر کی کتابوں کو کھنگالنے کی
سعادت نصیب ہوئی ہو وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ امام
دارقطنی رحمہ اللہ جیسی شخصیت ان کے معاصرین میں مفقود تھی۔ بعض فنون میں اگرچہ کسی
صاحب کو ان پر فضیلت دی جا سکتی ہے، لیکن باعتبار مجموعی تو ان کا پلہ تمام سے بھاری
ہے۔ اگر کوئی ان میں مورخ ہے تو حدیث و رجال جیسے وسیع علم میں وہ ملکہ نہ حاصل کر
سکا جو امام موصوف کو میسر تھا۔ اور اگر کوئی حدیث و رجال کا ماہر ہے تو علل حدیث
جیسے دقیق فن کی بھول بھلیوں سے وہ ناآشنا تھا۔ جیسا کہ آیندہ صفحات میں اس کی
مزید تفصیل آ رہی ہے۔ ہم یہاں صرف ان کے چند ایک ممتاز معاصرین کی
فہرست مع تراجم اختصار سے نقل کرتے ہوئے فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔

عمر بن احمد بن عثمان المعروف بابن شاہین (م ۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء)

ان کی رفعتِ شان، قوتِ حافظہ اور کثرتِ تصانیف سے کسی کو انکار نہیں ہو
سکتا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا تذکرہ ”الحافظ المفید المکثر محدث
العراق“ جیسے شاندار الفاظ سے شروع کیا ہے۔ ابن ابی الفوارس رحمہ اللہ ان کی تصانیف
کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ثقة مأمون صنف مالم يصنفه أحد“[1]

ان تمام اوصاف کے باوجود محمد بن عمر الداودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ابن شاهين بقية الشيوخ إلا أنه كان لحاناً ولا يعرف الفقه“[2]

اس کے برعکس فقہ میں جو مقام دارقطنی رحمہ اللہ کو حاصل تھا اس کا اندازہ خطیب

1 تذكرة الحفاظ (۱۸٤/۳)

2 [illegible]

بغدادی رحمہ اللہ کے اس قول سے ظاہر ہے:

"ومنها المعرفة بمذاهب الفقهاء فإن كتاب السنن الذي صنفه يدل على أنه كان ممن اعتنىٰ بالفقه"[1]

یہی نہیں بلکہ ہم "الداودی" ہی کے بیان سے نقل کر آئے ہیں کہ دارقطنی اور ابن شاہین رحمہ اللہ ایک دفعہ اکٹھے ہوئے تو ابن شاہین رحمہ اللہ اس قدر رعب میں آگئے کہ ڈر سے بول بھی نہ سکے۔

محمد رحمہ اللہ بن محمد بن احمد ابو احمد الحاکم النیسابوری الکرابیسی (م ۳۷۸ھ/ ۹۸۸ء):

اپنے وقت کے کبار محدثین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ العلل کے موضوع پر ان کی کتاب بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، لیکن العلل میں جو مقام امام دارقطنی کو حاصل ہے وہ امام ابو احمد رحمہ اللہ کو بھی میسر نہیں۔ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

"درفن علل حدیث واسماء الرجال بے نظیر وقت یگانہ عصر خود بود"[2]

اگر یہاں ہم ابو عبداللہ الحاکم رحمہ اللہ کا ذکر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف امام دارقطنی رحمہ اللہ اور امام ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ دونوں کے شاگرد ہیں۔ بایں صورت شاگرد کی رائے ہی اقرب الی الصواب تصور ہوگی، کیوں کہ وہ دونوں کے علم وفضل سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"هو حافظ عصره بهذه الديار"[3]

---

[1] تاريخ بغداد (۱۲/۳۵)

[2] بستان المحدثين

[3] تذكرة الحفاظ (۳/۱۷۵)

یعنی وہ دیارِ خراسان میں اپنے وقت کے یگانہ تھے۔ اس کے مقابلے میں امام
...نی رحمہ اللہ کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"صار الدارقطني أوحد عصره في الحفظ والفهم والورع"[1]

شاگردِ رشید کی اس شہادت سے ان دونوں بزرگوں میں جو تفاوت ہے وہ
...عیاں ہے۔ علاوہ ازیں حافظ ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ کا آخری عمر میں حافظہ بھی خراب
...تھا۔ جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے، لیکن امام
...ن رحمہ اللہ کا حافظہ تا آخر سلامت رہا۔ بایں وجہ بھی امام صاحب کا مقام ان سے
...بلند و برتر ہے۔

...مد رحمہ اللہ بن حبان بن احمد المعروف بابن حبان (م ۳۵۴ھ/ ۹۶۵ء):

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے معاصرین میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ
ان کے متعلق فرماتے ہیں:

"كان من أوعية العلم في اللغة والحديث والوعظ ومن عقلاء الرجال"[2]

صحیح ابن حبان ان کی مشہور تصنیف ہے، لیکن اس میں انھوں نے تساہل سے
...ہے۔ مجہول الحال کو ثقہ کہنے میں ان کا تساہل مشہور ہے اور دوسری طرف
...جرح میں متشدد ہیں، جس کی بنا پر ائمہ فن نے ان کی اس قسم کی جرح و تعدیل
...سان نہیں دیکھا۔ ان کے تشدد کا ذکر علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال میں
...ن عمرو اور عثمان بن عبدالرحمان کے ترجمہ میں کیا ہے۔

---

1 ... (۱۸۷/۳)

2 ...ت الشافعیہ (۱۴۱/۲)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"ابن حبان ربما جرح الثقة حتى كأنه لا يدري ما يخرج من رأسه"[1]

ان سے قبل حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے افلح بن سعید المدنی کے ترجمہ میں بھی یہ الفاظ کہے ہیں۔ رہا ان کا مجہول الحال کو ثقہ کہنا تو اس کے متعلق علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقد علم أن ابن حبان ذكر في هذا الكتاب الذي جمعه في الثقات عددا كثيراً وخلقاً عظيماً من المجهولين الذي لا يعرف من هو ولا غيره أحوالهم"[2]

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "لسان المیزان" کے مقدمہ اور علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے "الرسالة المستطرفه" (ص: ۱۲) میں بھی اس کی صراحت کی ہے۔ خلاصۃ تذہیب الکمال کے حاشیہ میں منقول ہے۔

"وثقه ابن حبان ولا يعتد بتوثيقه وحده"[3]

الغرض ان کے اس رویہ کی بنا پر ائمہ جرح وتعدیل نے ان سے اختلاف کیا ہے مگر امام دارقطنی رحمہ اللہ ان سب عیوب سے پاک ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں معتدلین میں شمار کیا ہے اور بلا اختلاف محدثین متاخرین نے ان کی توثیق وتضعیف پر اعتماد کیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

---

[1] القول المسدد

[2] الصارم المنكي (ص: ٩٣)

[3] الخلاصة ترجمه سليمان بن ابي عبيد

محمد رحمہ اللہ بن الشیخ ابی یعقوب اسحاق المعروف بابن مندہ

(م ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء):

حفاظِ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ابن ناصر الدین رحمہ اللہ انھیں 'کوہِ علم' کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔[1] ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ابن ناصر الدین ہی کا بیان ہے کہ جب وہ سفر سے واپس لوٹے تو ان کی کتابیں چالیس اونٹوں پر تھیں۔[2]

ابو عبداللہ محمد رحمہ اللہ بن عبداللہ المعروف بابن البیع النیسابوری:

موصوف امام حاکم صاحب المستدرک کے نام سے مشہور ہیں۔ ۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ حسنِ تصنیف کی انھوں نے دعا بھی مانگی تھی۔ جو بقول مورخین درجہ قبولیت کو پہنچی۔ ابو حازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام حاکم رحمہ اللہ سے سنا، فرماتے تھے:

"شربت ماء زمزم وسألت الله أن يرزقني حسن التصنيف"[3]

امام دارقطنی رحمہ اللہ سے ابن مندہ رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا:

"ابن البيع أتقى حفظاً"

"حفظ کے اعتبار سے امام حاکم رحمہ اللہ ابن مندہ رحمہ اللہ سے زیادہ بہتر ہیں۔"

محمد بن طاہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حافظ سعد بن علی الزنجانی رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ چار حفاظ جو ایک دوسرے کے معاصر ہیں، ان میں احفظ کون ہے؟ تو

[1] شذرات الذهب (۳/۱٤٦)

[2] أيضاً

[3] تذكرة الحفاظ (۳/۲۲۳)

انھوں نے فرمایا: تمھاری مراد کیا ہے؟ میں نے کہا: ''دارقطنی رحمہ اللہ بغداد میں، عبدالغنی رحمہ اللہ مصر میں، ابن مندہ رحمہ اللہ اصبہان میں اور الحاکم رحمہ اللہ نیشاپور میں۔'' تو وہ لمحہ بھر خاموش رہے، پھر فرمایا:

''دارقطنی عللِ حدیث کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے، عبدالغنی انساب میں، ابن مندہ احادیث میں اور حاکم تصنیف میں ان سے بہتر ہیں۔''[1]

لیکن اگر اس بحث کو ذرا وسیع کیا جائے اور بحیثیت مجموعی ان ائمہ کرام کے مراتب و مدارج کو پرکھا جائے تو حقیقتِ حال کچھ اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ امام حاکم رحمہ اللہ اور ابن مندہ رحمہ اللہ کے درمیان جو تفاوت ہے وہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے تبصرہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ رہے حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ تو وہ امام دارقطنی کے خوشہ چیں ہیں اور ''قال أستاذي وسمعت أستاذي'' کہتے نظر آتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ کا علمی میدان امام دارقطنی رحمہ اللہ کے مقابلے میں کس قدر وسیع ہے۔ حسنِ تصنیف جس کا سہرا ''الزنجانی'' نے امام حاکم کے سر پر دھرا ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک تاریخ و سیر میں ان کے تذکرہ کا تعلق ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ تصنیف کے اعتبار سے بھی امام حاکم رحمہ اللہ سے کسی صورت کم نہ تھے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی سنن میں گو ضعیف اور منکر و شاذ وغیرہ روایات آگئی ہیں، لیکن اس کتاب کی وہ حیثیت نہیں، جو امام حاکم رحمہ اللہ کی ''المستدرك'' کو ہے۔ اس میں انھوں نے اگرچہ کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ تاہم محققین نے ان کی تصحیح پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ تو اس قدر ان سے نالاں ہیں کہ کہیں انھیں

[1] أیضاً (۲۳۳/۳)

ہل جیسے قبیح الفاظ سے یاد کرتے ہیں[1] اور کہیں یہ کہا ہے کہ حاکم کو ان جیسی حدیث کو صحیح کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے حیا نہیں آتی۔[2]

یہی نہیں بلکہ وہ چونکہ شیعیت سے متاثر تھے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں ایسی روایات نقل کی ہیں، جنھیں محدثین نے موضوع کہا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ولیته لم یصنف المستدرك فإنه غض من فضائله بسوء تصرفه“[3]

ابن عراق رحمہ اللہ نے تنزیہ الشریعۃ کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے المستدرک کی موضوع روایات کو جمع کیا ہے جو ایک سو سے متجاوز ہیں۔ لہٰذا امام حاکم رحمہ اللہ کے متعلق ”الزنجانی رحمہ اللہ“ کا یہ تجزیہ کچھ محلِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ امام دارقطنی رحمہ اللہ بعض فنونِ حدیث کے مبتکر ہیں، جن کا متقدمین کے کلام میں تذکرہ تک نہیں ملتا اور ان میں سب سے پہلے مصنف ومؤلف ہونے کا شرف بھی انھی کو حاصل ہے۔ جس کا ذکر آیندہ اوراق میں آرہا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ثم سبعة من الحفاظ في ساقتهم أحسنوا التصنيف وعظم النفع بتصانيفهم أبو الحسن الدارقطني ثم الحاكم أبو عبد الله النيسابوري ثم أبو محمد عبد الغني بن سعيد إلخ“[4]

---

1. تلخيص المستدرك (٢/٦١٧)
2. ميزان الاعتدال (٣١٩/٣)
3. تذكرة الحفاظ (٢٣٩/٣)
4. غريب

علامہ نووی رحمہ اللہ کے اس کلام سے تصنیف کے اعتبار سے بھی امام دارقطنی رحمہ اللہ کا نام سرفہرست نظر آتا ہے اور یہی بات قرینِ قیاس اور اقرب الی الدلائل ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ کے نزدیک جو مقام و مرتبہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کا ہے اسے ابوذر رحمہ اللہ یوں بیان کرتے ہیں:

"میں نے حاکم سے پوچھا کیا آپ نے دارقطنی جیسا کسی کو دیکھا ہے؟ تو فرمایا: انھوں نے تو خود اپنی مثل کسی کو نہیں پایا میں نے کیسے دیکھ لیا۔"[1]

اس سے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی شخصیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، بلکہ اپنے اس فضل و کمال کا اعتراف تو خود امام دارقطنی رحمہ اللہ کو بھی تھا۔ رجاء بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے اپنے جیسا کسی صاحب کو دیکھا ہے تو فرمانے لگے: "قال اللہ تعالیٰ: لا تزکوا انفسکم" میں نے عرض کی میرا یہ مقصد نہیں، تو پھر فرمایا:

"إن كان في فن واحد فقد رأيت من هو أفضل و أما من اجتمع فيه ما اجتمع فيّ فلا"[2]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے گو بعض فنون میں بعض محدثین درجہ کمال رکھتے تھے اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے، لیکن مجموعی اعتبار سے ان کا کوئی بھی ہم پلہ نہ تھا، جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے علم و فضل کا اعتراف:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کو معاصرین محدثین نے جس قدر و منزلت کی نگاہ سے

[1] تذكرة الحفاظ (۱۸۸/۳)

[2] أيضاً تاريخ بغداد (۳۵/۱۲)

ہا ہے، اس کا مختصر ذکر ہم مختلف مقامات پر کر آئے ہیں۔ یہاں ہم انھی اقوال کو
زیادات نقل کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دارقطنی حفظ وفہم اور ورع میں یگانہ روزگار تھے اور قراءت اور نحو کے امام تھے، ان کے متعلق میں نے جو کچھ سنا انھیں اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔''[1]

قاضی ابو الطیب رحمہ اللہ طاہر بن عبداللہ الطبری فرماتے ہیں:

''وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور بغداد میں ان کے سوا کسی کے علوِ مرتبت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔''[2]

''امام حاکم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے کسی کو دارقطنی رحمہ اللہ جیسا دیکھا ہے تو انھوں نے فرمایا: میں نے کیا خود انھوں نے اپنی مثل کسی کو نہیں دیکھا۔''[3]

حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''احادیثِ رسول پر تین شخص اپنے اپنے زمانے میں بہترین کلام کرنے والے تھے: ابن المدینی رحمہ اللہ، موسیٰ بن ہارون رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ۔''[4]

حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ جب کسی بات کی حکایت امام دارقطنی رحمہ اللہ سے کرتے تو فرماتے:

''قال أستاذي، سمعت أستاذي''[5]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

---

1. تذکرۃ الحفاظ (۳/۱۸۷) طبقات الشافعیہ (۲/۳۱۰)
2. تاریخ بغداد (۱۲/۳۷)
3. أیضاً (۱۲/۳۶) تذکرۃ الحفاظ (۳/۱۸۸)
4. أیضاً (۳/۱۸۹) شذرات الذهب (۳/۱۱٦)
5. تاریخ بغداد (۱۲/۳٦)

"كان فريد عصره، وقريع دهره، ونسيج وحده، و إمام وقته. نتهى إليه علم الأثر والمعرفة بعلل الحديث، وأسماء الرجال رأحوال الرواة، مع الصدق والأمانة، والفقه والعدالة وقبول لشهادة، وصحة الاعتقاد، وسلامة المذهب، والاضطلاع بعلوم سوى علم الحديث، منها القراآت، ومنها المعرفة بمذاهب الفقهاء، ومنها المعرفة بالأدب والشعر إلخ" (1)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"الحافظ الكبير أستاذ هذه الصناعة، وقبله بمدة وبعده إلى زماننا هذا، سمع الكثير، وجمع وصنف وألف وأجاد وأفاد، وأحسن النظر والتعليل والاعتقاد، وكان فريد عصره ونسيج وحده، و إمام دهره في أسماء الرجال وصناعة التعليل، والجرح والتعديل، وحسن التصنيف والتأليف واتساع الرواية، والاطلاع التام في الدراية" (2)

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقد اجتمع له معرفة الحديث، والعلم بالقراءة والنحو والفقه والشعر، مع الإمامة والعدالة وصحة العقيدة" (3)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ سے کہا گیا آپ حافظ ابو بکر رحمہ اللہ ہیں؟ تو انھوں نے فر. میں احمد بن علی بن ثابت الخطیب ہوں۔ حافظہ تو امام دارقطنی رحمہ اللہ پر ختم ہوگیا ہے۔

(1) تاریخ بغداد (۳٤/۱۲)

(2) البدایہ (۳۱۷/۱۲)

(3) البدایہ (۳۱۷/۱۲)

(4) تذکرۃ الحفاظ (۳۱۷/۳)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ انھیں رجال کا امام قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان کی جرح و تعدیل کو وہی مقام حاصل ہے جو امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی اور ان جیسے دیگر حضرات کو احکام اور حلت و حرمت کی معرفت میں حاصل تھی۔''[1]

علامہ السبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الحافظ المشهور، شيخ الإسلام، صاحب المصنفات، إمام زمانه، وسيد أهل عصره، وشيخ أهل الحديث''[2]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ میں نے حمزہ بن محمد بن طاہر الدقاق کے خط سے یہ لکھا ہوا دیکھا:

جعلناك فيما بيننا ورسولنا
وسيطاً فلم تظلم ولم تتحوب
فأنت الذي لولاك لم يعرف الورىٰ
ولو جهدوا ما صادق من مكذب[3]

محمد بن طاہر المقدسی فرماتے ہیں:

''وہ اپنے زمانے میں اسی طرح تھے، جیسے اپنے زمانے میں امام یحییٰ بن معین تھے۔''[4]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] الرد على البكري (ص: ١٣، ١٤)
[2] طبقات الشافعيه (٣١٠/٢)
[3] تاريخ بغداد (٣٩/١٢)
[4] أطراف الغرائب (٤٥/١)

"الإمام الحافظ المجود شيخ الإسلام علم الجهابذة" [1]

نیز لکھتے ہیں:

"كان من بحور العلم، ومن أئمة الدنيا، انتهى إليه الحفظ ومعرفة علل الحديث ورجاله، مع التقدم في القراءة وطرقها، وقوة المشاركة في الفقه والاختلاف، والمغازي وأيام الناس وغير ذلك" [2]

الغرض امام دارقطنی رحمہ اللہ کی شخصیت ابتدا سے آج تک مسلمہ ہے۔ ہر دور کے اہلِ علم نے انھیں بڑے اچھے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا اور اصحابِ سیر و تذکرہ نے کسی صورت انھیں نظر انداز نہیں کیا۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مسلک:

بعض لوگوں نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کے ان مسائل کے پیشِ نظر جن میں انھوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔ یہ کہا ہے کہ وہ شافعی المسلک تھے۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہیں، کسی عالم کا اپنے تفردات کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی رائے سے متفق ہونا اس کے اجتہاد کی نفی کو مستلزم نہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ جنھیں بقول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فقہی مسائل میں اطلاع تام حاصل تھی، کے متعلق یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ مقلد محض تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی رائے اکثر و بیشتر مسائل میں امام شافعی رحمہ اللہ کے موافق تھی۔ اسی لیے ان کا میلان بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف تھا، جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ میں لکھا ہے۔

---

[1] السیر (۱۲/۴٤۹)

[2] السیر (۱٦/٤٦٠)

علامہ الجزائری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"أما الدارقطني فإنه يميل إلى مذهب الشافعي إلا أنه له اجتهاد، وكان من أئمة السنة والحديث، ولم يكن حاله كحال أحد من كبار المحدثين، فمن جاء على أثره فالتزم تقليد عامة الأقوال إلا في قليل منها مما يعد و يحصر، فإن الدارقطني كان أقوىٰ فى الاجتهاد منه وكان أفقه وأعلم منه" ①

اور یہ حقیقت ہے کہ کسی کی رائے کا امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے کے ساتھ متفق ہونا عیب کی بات نہیں، لیکن بعض احباب نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کے ان مسائل کو دیکھ کر جو امام شافعی کے فتویٰ کے مطابق ہیں ان پر انتہائی عامیانہ اعتراضات کیے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ وہ شافعی المسلک تھے اور اس کی جا و بے جا حمایت کرتے، بلکہ ہر اس حدیث کو ضعیف ٹھہرانے کی کوشش کرتے جو ان کے مسلک کے منافی ہوتی۔

مولانا عبدالعزیز گوجرانوالوی حاشیہ نصب الرایہ میں لکھتے ہیں:

"أقول من مارس كتابه علم أنه قد يتكلم على هذه الأحاديث إلا حديثاً خالف الشافعي فيظهر عواره أو وافقه فيصححه، إن وجد إليه سبيلًا، ويظهر طرفه الموافق لإمامه الخ" ②

"جس کسی نے ان کی کتاب کو گہری نظر سے دیکھا ہے تو اسے یہ معلوم ہو

① توجیہ النظر (ص: ۱۸۵)

② حاشیہ نصب الرایہ (۲/۸)

گا کہ وہ ان احادیث پر کلام کرتے ہیں، جو امام شافعی رحمہ اللہ کے مخالف ہوتی ہے اور اگر کوئی روایت ان کے موافق ہوتی ہے تو اس کی صحت پر پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ان کا یہ طریقہ ہوائے نفس کی بنا پر نہ تھا بلکہ ایک ثقہ راوی جسے بعض نے ضعیف کہا ہو یا کوئی ضعیف ہو اور اسے بعض نے ثقہ بھی کہا ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے امام کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے موافق پہلو کو ذکر کرتے ہیں، بلکہ اکثر شوافع کا یہی معمول رہا ہے۔'' انتھی

یہی نہیں مولوی شفیع احمد بہاری تو ان سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہو۔ یوں گویا ہوئے:

''ان کو شافعیت میں اتنا غلو تھا کہ حمیتِ جاہلیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔''[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے یہ اقوال خود ''حمیت جاہلیت'' سے حامل ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کا دامن اس قسم کی آلودگیوں سے بالکل صاف ہے۔ سنن دارقطنی رحمہ اللہ میں جہاں انھوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے ساتھ انھوں نے ان کے بعض مستدل پر کڑی نکتہ چینی بھی کی ہے، جس کی ایک دو مثالوں نشاندہی ہم یہاں ضروری خیال کرتے ہیں۔

① "باب ولوغ الكلب في الإناء" کے تحت امام دارقطنی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے:

"طهور الإناء إذا ولغ الكلب فيه يغسل سبع مرات، الأولى بالتراب والهرة مرة أو مرتين"

[1] ملاحظہ ''برہان'' ماہ جنوری ۱۹۵۱ء

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''ھذا صحیح'' حالانکہ یہ
سے علم نہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بلی کا جوٹھا نجس نہیں اور نہ ہی اس برتن کو
ھونے کی ضرورت ہے، جس میں بلی نے پانی وغیرہ پیا ہو۔

ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اگر ''حمیت مذہب'' کا رنگ غالب ہو تو وہ
ں روایت کو صحیح قرار نہ دیتے!!

۲) اسی طرح سر کا مسح کے متعلق جو روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ
''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ سر کا مسح کیا'' اسے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
''إسحاق بن یحییٰ ضعیف''

شروح احادیث اور مذاہب اربعہ کی کتب کا مطالعہ کرنے والا طالب علم اس
ت سے بخوبی واقف ہے کہ یہ حدیث امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کے موافق ہے،
ن اس کے باوجود اسے ضعیف کہہ رہے ہیں۔ کیا حمیت مذہبی اسی کا نام ہے؟

پھر اگر امام دارقطنی رحمہ اللہ واقعی شافعیت میں اس حد تک متعصب تھے تو اس
ے نہ صرف ان کی عدالت و دیانت پر حرف آتا ہے جس پر علمائے سلف و خلف کا
ناق ہے بلکہ یہ طریقہ تو ان مبتدعہ فرقوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ جنھوں نے اپنی
لناب بر آری اور مسلک ہی کی احادیث کو اکثر بیان کیا اور بالآخر یہی صورت وضع
یث کا سبب بنی تو کیا امام دارقطنی رحمہ اللہ کو بھی ان ہی کے زمرہ میں کھڑا کیا جائے
؟ ہرگز نہیں۔

اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ ان کے کلام کو فنِ جرح و تعدیل میں
ا فن نے وہی مقام دیا ہے جو فقہ میں امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، سفیان
ی رحمہ اللہ وغیرہ کے اقوال کو ہے، جیسا کہ ابھی ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے

21258

حوالے سے نقل کر آئے ہیں اور متاخرین میں حافظ ابن الصلاح، حافظ ابن حجر، حافظ ذہبی، علامہ سخاوی رحمہم اللہ اور دیگر ائمۂ فن نے انھیں تصحیح وتضعیف میں حجت مانا ہے، جیسا کہ یہ بحث آیندہ صفحات میں آ رہی ہے۔

بات اسی پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ مزید تعجب یہ کہ مولانا عبدالعزیز مذکور زورِ بیان میں یہاں تک فرما گئے:

''وهذا حال كثير من الشوافع''

ہاں اگر وہ ذرا اپنے حنفی بھائیوں کے افعال و کردار کی نشاندہی بھی کر دیتے تو یہ بہتر ہوتا کہ انھوں نے اس میدان میں کیا گل کھلائے ہیں۔ ''حمیتِ جاہلیت'' کے پیشِ نظر کہاں کہاں انھوں نے اپنے مسلک کے مطابق روایات کو ضعیف کہا ہے اور کہاں صحیح۔ ہم اس کی چند مثالیں ذکر کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہی ہیں ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں وہ بھی تو ''عمدۃ القاری'' میں متعدد مواقع پر شوافع کے ساتھ اس ''جرم'' میں شریک نظر آتے ہیں۔ مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مسلک ہے کہ جب امام خطبہ دینے کے لیے منبر پر کھڑا ہو تو سامعین کو السلام علیکم کہے۔ اس پر شوافع نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت اور امام شعبی رحمہ اللہ کی مرسل روایت سے استدلال کیا ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ اس مرسل روایت پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وإن أسنده أحمد من حديث عبد الله بن لهيعة فهو معروف في الضعفاء فلا يحتج به وقال البيهقي: ليس بقوي''[1]

[1] عمدة القاري (٦/٢٢١)

یعنی اسے گو امام احمد رحمہ اللہ نے متصل ذکر کیا ہے، لیکن اس میں عبداللہ بن لہیعہ ہے جو ضعفاء میں معروف ہے۔ بیہقی نے کہا ہے: ''وہ قوی نہیں تو اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔''

لیکن آگے چند صفحات بعد ''باب إذا رأى الإمام رجلًا جاء وهو يخطب أمره أن يصلي ركعتين'' کے تحت اپنے مسلک کی تائید میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے اس اثر:

''الصلاة والإمام على المنبر معصية''

نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''فإن قلت في سند أثر عقبة: عبد الله بن لهيعة. قلت: ماله؟ وقد قال أحمد: من كان مثل ابن لهيعة بمصر'' [1]

اسی بحث میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''وثقه أحمد وكفىٰ به ذلك'' [2]

حالانکہ آگے چل کر ساتویں جلد میں پھر ابن لہیعہ کو ضعیف کہا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ روایت جسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں پیش کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں نے صلاۃ کسوف ادا کی، لیکن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا کہ ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔ یہ روایت چونکہ علامہ عینی رحمہ اللہ کے مسلک کے خلاف تھی بنابریں اس پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قلت: روى البيهقي هذا من ثلاث طرق كلها ضعيفة فرواه من رواية ابن لهيعة عن يزيد بن حبيب عن عكرمة

---

[1] عمدة القاري (٦/٢٣٥)

[2] ايضاً

عن ابن عباس الخ"[1]

ظاہر ہے کہ اس سند میں ضعیف سے مراد "ابن لہیعہ" ہیں اسی طرح (۷/۹۹) پر بھی انھوں نے ابن لہیعہ کو اپنے شیخ العراقی رحمہ اللہ کے قول سے ضعیف کہا ہے۔

بعینہٖ اسی قسم کا معاملہ انھوں نے محمد بن اسحاق صاحب المغازی سے کیا۔ بحث فاتحہ خلف الامام میں تو واشگاف الفاظ میں اسے ضعیف کہہ دیا۔ لیکن جب حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ نے ایسی روایت کو ابن اسحاق کی وجہ سے ضعیف کہا جو مسلکِ احناف کے موافق تھی تو پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے اور یہاں تک فرما دیا:

"إن ابن إسحاق من الثقات الكبار عند الجمهور"[2]

اس کے علاوہ متعدد ایسے مواضع ہمارے سامنے ہیں، جہاں انھوں نے ابن اسحاق کی حدیث کو حسن کہا ہے، لیکن ہم بخوفِ طوالت انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے درست فرمایا ہے:

"لو لم يكن فيه رائحة التعصب المذهبي لكان أجود"[3]

یہی حالت علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کی ہے، جو کچھ انھوں نے کہا یا کیا اس سے قطع نظر ہم یہاں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کا قول ہی ذکر کر دینا کافی خیال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"شیخ ابن ہمام اگرچہ اہلِ طریقت (صوفیوں سے) اور منصف مزاج تھے، لیکن کبھی اپنے مذہب کی حمایت کے لیے حدِ اعتدال سے تجاوز بھی کر

---

[1] عمدة القاري (۷/۹۲)

[2] عمدة القاري (۷/۲۷۰)

[3] الفوائد البهية (ص: ۸٦)

جاتے تھے۔''[1]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ کے اس قول کی تائید میں ہم چند مثالیں بھی ذکر کرتے لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس سلسلے میں نہ ہی زیادہ تفصیل مناسب خیال کرتے ہیں۔ دکھانا صرف یہ مقصود تھا کہ کیا شوافع کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ''مذہبی حمیت'' کے جوش میں احادیث کو صحیح وضعیف کہا کرتے تھے یا اس ''جرم'' میں خود ائمہ حنفیہ ان سے کہیں بازی لے گئے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ جن کی امانت و دیانت پر حفاظ حدیث اور اصحاب الطبقات والسیر کا اتفاق ہو ان پر اس قسم کے بے بنیاد الزامات دھرتے ہوئے ان حضرات کو کچھ بھی اللہ کا خوف نہیں آتا۔ کہنے والے نے بالکل صحیح کہا ہے:

''دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی ہمیشہ شہتیر نظر آتا ہے۔''

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا شافعیت میں غلو کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے۔ جب وہ مصر گئے تو بعض لوگوں کے کہنے پر انھوں نے جہری نماز میں بسم اللہ بالجہر پڑھنے کے ثبوت میں ایک رسالہ لکھا۔ جب اس کی حدیثوں کی صحت کے متعلق مالکیہ نے قسم دلا کر ان سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں کوئی مرفوع روایت تو ثابت نہیں، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعض آثار ملتے ہیں، جن میں سے بعض صحیح اور بعض ضعیف ہیں۔[2]

یہی واقعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے ایک فتویٰ میں ذکر کیا ہے، لیکن اس میں قسم دلانے کا ذکر نہیں۔

---

[1] فیض الباري (١/١٠٧)

[2] نصب الراية (١/٤٥٨)

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس اسلوب سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر ضعیف روایتیں جمع کیں، جن سے ان کا مقصد محض اپنے فقہی مسلک کو موید کرنا تھا اور بس۔

لیکن اس مفروضے کی تردید حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس قول سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے ایک فتویٰ میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"أو يرويها من جمع هذا الباب كالدارقطني والخطيب وغيرهما فإنهم جمعوا ما روي"[1]

یعنی جہر بسم اللہ کی احادیث کا احاطہ دارقطنی اور خطیب نے کیا ہے، جنھوں نے اس باب میں تمام روایات کو جمع کر دیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اس باب کی روایتوں کو جمع کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا اور اس کی وہی حیثیت ہے جو امام نسائی کے رسالہ "مناقب علی رضی اللہ عنہ" کی ہے۔ جس میں انھوں نے حسن، ضعیف بلکہ منکر و موضوع روایات کو بھی جمع کر دیا ہے، جس کی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں شیعیت سے بھی متہم کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک فقہی مسئلہ پر سب روایتوں کو ایک کتابچہ کی شکل میں جمع کر دینے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس محدث کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کی مثال امام نسائی رحمہ اللہ کی کتاب "المناسک" کی ہے، جس میں انھوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کے ادلہ کو جمع کیا ہے۔ بلکہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس کے باوجود فیض الباری میں انھیں حنبلی بتلایا ہے۔ لہٰذا جب وہ کتاب "المناسک" لکھنے کے باوجود حنبلی تھے تو امام دارقطنی رحمہ اللہ کتاب "الجہر بسم اللہ" سے شافعی کیونکر قرار پائے؟

خصوصاً جب کہ انھوں نے اس قسم کی جملہ روایات کے ضعیف ہونے کی

صراحت بھی کر دی ہے، بلکہ ''سنن'' میں تو اس مسئلے میں جہر بسملہ کی روایات کے ضعف کی تصریح کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث:

"إني قسمت الصلاة بيني وبين عبدي نصفين فنصفها له يقول عبدي إذا افتتح الصلاة ببسم الله الرحمٰن الرحيم"

کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''بسم اللہ کے ذکر کرنے میں عبداللہ بن زیاد بن سمعان منفرد ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ ثقات میں سے امام مالک، ابن جریج، روح بن قاسم، ابن عیینہ، ابن عجلان، الحسن بن الحر، ابو اویس رحمہم اللہ وغیرہ نے العلا سے بالاتفاق بسم اللہ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔'' پھر فرماتے ہیں:

"واتفاقهم على خلاف ما رواه ابن سمعان أولىٰ بالصواب"[1]

اہلِ علم حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ یہاں اس روایت کو صحیح قرار دے رہے ہیں، جس سے حنفی مکتبِ فکر کی پرزور تائید ہوتی ہے۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ حنفی نے اسی روایت کو آہستہ بسم اللہ پڑھنے پر نص صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

"هذا قاطع تعلق المتنازعين وهو نص لا يحتمل التأويل ولا أعلم حديثاً في سقوط البسملة أبين فيه"[2]

''یہ حدیث بسم اللہ آہستہ پڑھنے کے لیے سب سے بڑی واضح دلیل ہے، جس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔''

ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس تصریح کے ہوتے ہوئے بھی وہ شافعیت کے ساتھ غلو رکھتے تھے؟ جیسا کہ کہا گیا یا سمجھا گیا ہے۔ طعا

---

[1] سنن دارقطني

[2] نصب الرايه (۱/۳۳۹)

نہیں بلکہ وہ مجتہد تھے جیسا کہ علامہ الجزائری کے بیان میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ:

امام دارقطنی رحمہ اللہ پر جس قدر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ دراصل اس کا سبب ان کی وہ جرح ہے جو انھوں نے حدیث: "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة" کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر کی ہے، فرماتے ہیں:

"لم يسنده عن موسى بن أبي عائشة غير أبي حنيفة والحسن بن عمارة وهما ضعيفان"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس جرح سے علامہ عینی رحمہ اللہ تو اس قدر برہم ہوئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی "حمیت" میں امام دارقطنی رحمہ اللہ ہی کو ضعیف بنانے کا شوق ظاہر فرمایا۔

چنانچہ عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

"لو تأدب الدارقطني رحمه الله واستحى لما تلفظ بهذه اللفظة في حق أبي حنيفة رحمه الله، وبتضعيفه إياه يستحق هو التضعيف"[2]

"امام دارقطنی رحمہ اللہ کو ایسا کہنے سے حیا کرنا چاہیے تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تضعیف کرنے والے کو خود ضعیف قرار دینا چاہیے۔"

اسی طرح "البنایہ شرح ہدایہ" میں لکھتے ہیں:

"من أين له تضعيف أبي حنيفة رحمه الله وهو مستحق للتضعيف"[3]

---

[1] سنن دارقطني (١/١٢٣)

[2] عمدة القاري (٦/١٢)

[3] مقدمة التعليق الممجد (ص: ٣٤)

علامہ عینی رحمہ اللہ کے بعد متاخرین حنفیہ نے ان کے اس قول کو بنیاد قرار دے کر امام دارقطنی رحمہ اللہ کے حق میں وہ کلمات استعمال کیے، جو حدیث کے ادنیٰ طالب علم کے لیے بھی مناسب نہیں چہ جائیکہ امام موصوف رحمہ اللہ کی شخصیت کے حق میں اس قسم کی یاوہ گوئی کی جائے۔ اگر امام دارقطنی رحمہ اللہ صرف اس بنا پر ضعیف ہیں کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ضعیف کہا ہے تو اس ''جرم'' میں وہ منفرد نہیں ہیں، بلکہ دیگر ائمہ جرح و تعدیل بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جن میں امام بخاری اور امام نسائی رحمہما اللہ سرِفہرست ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''النعمان بن ثابت أبو حنيفة مولى بني تميم .... كان مرجيا سكتوا عن رأيه وحديثه''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ جرح جس قدر سخت ہے، اس کا اندازہ علامہ عراقی رحمہ اللہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

''فيه نظر وفلان سكتوا عنه هاتان العبارتان يقولهما البخاري فيمن تركوا حديثه''[2]

اسی طرح علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن داود الواسطی کے ترجمہ میں بھی اس امر کی صراحت کی ہے۔ علامہ سخاوی رقمطراز ہیں:

''وكثيرا ما يعبر البخاري بهاتين العبارتين .... فيمن تركوا حديثه''[3]

---

[1] التاريخ الكبير (٨١/٤، ورق: ٢)

[2] فتح المغيث للعراقي (٤١/٢)

[3] فتح المغيث للسخاوي (ص: ١٦١)

''فیہ نظر اور سکتوا عنه کے الفاظ امام بخاری رحمہ اللہ ایسے راوی کے حق میں استعمال کرتے ہیں، جس کی حدیث کو محدثین نے چھوڑ دیا ہو۔''

اسی طرح امام نسائی رحمہ اللہ نے کتاب الضعفاء میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا تذکرہ دو جگہ کیا ہے۔ پہلے تو صرف ''لیس بالقوي'' پر اکتفا کی ہے، لیکن آگے چل کر فرماتے ہیں:

''ابو حنیفة رحمه الله لیس بالقوي فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطأ علی قلة روایته''[1]

ان کے علاوہ امام علی بن المدینی، امام مسلم، امام احمد، امام عبداللہ بن مبارک، ابن عدی، ابن القطان، حمیدی، العقیلی اور امام حاکم رحمہم اللہ نے بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ضعیف کہا ہے۔ اس بحث کی نہ تفصیل مقصود ہے اور نہ ہی یہاں ایسا مناسب ہے۔ غرض صرف یہ ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرح دیگر محدثین اور ائمۂ جرح و تعدیل نے بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ضعیف کہا ہے۔ اگر امام دارقطنی رحمہ اللہ صرف اس بنا پر قابلِ تضعیف ہیں کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ضعیف کہا ہے تو وہ اکیلے اس ''جرم'' کے مرتکب نہیں، بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر محدثین بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ تو کیا وہ بھی بقول علامہ عینی رحمہ اللہ ''مستحقِ ضعف'' ہیں؟

علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر کلام کرنے والوں کے متعلق جو وتیرہ اختیار کیا ہے وہ اس سے کہیں تعجب خیز ہے، فرماتے ہیں:

''لم أر محدثا فقیها أو فقیها فقط یقدح في أبي حنیفة رحمه الله نعم من کان منهم محدثا فقط فإنه جرح علیه''[2]

---

[1] کتاب الضعفاء والمتروکین (ص: ۵۷)

[2] فیض الباري (۱/ ۱٦۹، ۱۷۰)

”کسی محدث فقیہ یا صرف فقیہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر جرح نہیں کی ہے۔

ہاں جو صرف محدث ہیں۔ انھوں نے البتہ امام صاحب پر جرح کی ہے۔“

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن محدثین نے امام صاحب رحمہ اللہ کی توثیق کی ہے وہ فقیہ تھے اور جنھوں نے جرح کی ہے وہ صرف محدث تھے اور درجۂ فقاہت انھیں میسر نہیں۔ حالانکہ یہ ”معیار“ اس قدر بے جان اور بودا ہے کہ اس کی تردید کی ہم چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ علامہ کشمیری رحمہ اللہ پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو وہ امام بخاری کو مجتہد مانتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”واعلم أن البخاري مجتهد لا ريب فيه“ [1]

اور دوسری طرف فرماتے ہیں: ”جنھوں نے امام صاحب پر جرح کی ہے وہ صرف محدث ہیں۔“ کیا یہاں ان پر ”حمیت جاہلیت“ کا رنگ تو نظر نہیں آتا؟ اور کیا ”حمیت مذہبی“ کے پیشِ نظر انھوں نے جادۂ اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے اصل حقیقت کو نظر انداز تو نہیں کیا؟

رہا امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مجتہد اور فقیہ ہونا تو اس کا ثبوت ہم گزشتہ صفحات میں ذکر کر آئے ہیں، جس کا اعادہ مناسب نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سلسلہ میں رجال و سیر کی کتابوں کے مطالعے سے جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ امام صاحب گو فقہ میں مسلم امام تھے۔ ورع و تقویٰ کے لحاظ سے ان کا مقام بہت بلند تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے فن سے ان کا لگاؤ کم تھا اور حفظِ حدیث کے لیے جس قدر غیر معمولی ضبط کی ضرورت تھی، اس میں بھی کمی تھی۔ (انھوں نے زیادہ سے زیادہ احکامی روایات کو زیرِ نظر رکھا جو ایک

[1] مقدمه فيض الباري (ص: ٥٨)

مجتہد کے لیے اساسی حیثیت رکھتی ہیں) جس کی وجہ سے محدثین نے ان سے اغماض کیا اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ محدثین دینی حمیت کی بنا پر حدیث میں ادنیٰ مسامحت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، جس کا اندازہ امام شعبی رحمہ اللہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

"واللہ لو أصبت تسعا وتسعين مرة وأخطأت مرة لأعدوا علي تلك الواحدة"[1]

اس لحاظ سے ان کے یہ بے لاگ تبصرے قابلِ ستائش ہیں کہ بڑے سے بڑے امام کا علم وفضل اور زہد وتقویٰ بھی ان کی اس حق پسندی وحق گوئی کے مانع نہ بن سکا اور ان کے ان اکابرین کی معمولی غفلت وتساہل کو بھی نظر انداز نہیں کیا، بلکہ جس بات کو بھی وہ حق جانتے اور درست خیال کرتے۔ دیانت و ایمان داری سے اسے بیان کر دیتے۔ حد یہ کہ اگر اس قسم کی کوتاہی کا مرتکب ان کا باپ یا بھائی بھی ہوتا تو وہ اسے بھی معاف نہ کرتے۔ چنانچہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ اپنے والد عبداللہ بن جعفر کے متعلق فرمایا کرتے، میرا باپ ضعیف ہے۔[2] اور محمد بن ابی السری اپنے بھائی حسین کے متعلق فرماتے:

"لا تكتبوا عن أخي فإنه كذاب"[3]

اسی طرح ابو عروبہ حسین رحمہ اللہ مذکور کے متعلق فرماتے ہیں:

"كذاب هو خال أمي"[4]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ (۱/۷۷)

[2] میزان الاعتدال (۲/۲۷)

[3] تہذیب التہذیب (۲/۲٦٦)

[4] تہذیب التہذیب (۲/۲٦٦)

جس سے ان کی دینی حمیت اور غیرتِ ایمانی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بایں وجہ امام دارقطنی رحمہ اللہ یا دیگر محدثین رحمہم اللہ کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انھیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ عناد تھا، ہرگز درست نہیں۔

(۱) سنن دارقطنی اور دیگر تصانیف:

تیسری صدی حدیث کی ترتیب و تدوین کے اعتبار سے نہایت مبارک و مسعود رہی ہے۔ اس سے قبل حدیث میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئیں ان میں مرفوع روایات و فتاوی، آثار و اقوال اور موقوف روایات سے الگ طور پر جمع نہیں کیا گیا تھا۔ اس دور میں تصنیف و تالیف نے ایک نئی راہ اختیار کی، یعنی یہ کہ صرف مسند اور مرفوع روایات کو الگ جمع کیا جانے لگا، جس سے مسانید وجود میں آئیں۔ مسند ابوداود طیالسی، مسند مسدد بن مسرہد، مسند اسد بن موسیٰ اور مسند احمد وغیرہ اسی دور کی تصانیف ہیں۔

تاہم صحیح اور ضعیف روایات کو باہم ممتاز نہ کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے استفادہ نہایت مشکل قرار پایا۔ جب اس کمی کو محسوس کیا گیا تو بعض محدثین کے مشورہ و اشارہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الجامع الصحیح'' کو مرتب کیا۔ انہی کی اقتدا میں امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی صحیح احادیث کو یک جا جمع کیا اور ان کے علاوہ بعض دیگر محدثین نے ایسی کتابیں تالیف کیں، جن میں فقہی ترتیب کو ملحوظ رکھا، جن سے استفادہ آسان ہوا اور وہ کمی زائل ہوگئی، جسے پہلے محسوس کیا جاتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری میں اربابِ علم نے بھی یہی راہ اختیار کی، لیکن ان کی کاوش زیادہ تر جمعِ احادیث پر منحصر تھی۔ اس صدی کی مشہور کتابیں معاجم طبرانی، المستدرک وغیرہ ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی ''سنن'' بھی اسی سلسلے کی ایک نہایت قابلِ قدر کڑی ہے، جو ۴۷۴۹ احادیث پر مشتمل ہے۔ ان کی کتاب کو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز

نے گو طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے، لیکن اس درجہ کی دوسری کتابوں سے ''سنن دارقطنی'' کہیں ارفع و اعلیٰ ہے اور اس میں اگرچہ ضعیف، شاذ اور منکر روایات پائی جاتی ہیں، لیکن اکثر مقامات پر ان کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے اور ان کے معلول ہونے کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ سے ''سنن'' میں بجائے نقص کے خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ علمائے فن نے حسن حدیث کی معرفت کے لیے اسے معیار قرار دیا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ومن مظان الحسن سنن الدارقطني فإنه نص على كثير منه'' [1]

حاجی خلیفہ رحمہ اللہ نے حدیث کی فی الجملہ صحیح کتابوں میں سنن دارقطنی کو بھی شمار کیا ہے، فرماتے ہیں:

''إن السلف والخلف قد أطبقوا على أن أصح الكتب بعد كتاب الله سبحانه وتعالىٰ البخاري ثم مسلم ثم الموطأ ثم بقية الكتب الستة وهي سنن أبي داود والترمذي والنسائي وابن ماجه والدارقطني الخ'' [2]

بالکل اسی قسم کا خیال طاش کبریٰ زادہ نے بھی ظاہر کیا ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ ''التقریب'' میں صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ صحیح احادیث کا معیار ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب کوئی قابلِ اعتماد مصنف یا قابلِ اعتماد تصنیف میں اس کی صحت کی تصحیح کر دی گئی ہو تو وہ حدیث صحیح ہوگی۔''

[1] تدريب الراوي (ص: ٩٨)

[2] كشف الظنون (٦٤١/١)

اس کے بعد معتمد تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے سنن دارقطنی کو بھی ان میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں:

"كسنن أبي داود والترمذي والنسائي وابن خزيمة والدارقطني والحاكم والبيهقي وغيرهما منصوصاً على صحته"[1]

اسی طرح حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اصحابِ کتبِ خمسہ کی وفیات ذکر کرنے کے بعد ان حفاظِ حدیث کی وفیات ذکر کی ہیں، جن کی کتابوں کو بہ نظرِ تحسین دیکھا گیا ان میں بھی امام دارقطنی رحمہ اللہ کا نام سرِفہرست مذکور ہے، فرماتے ہیں:

"وسبعة من الحفاظ في ساقتهم أحسنوا التصنيف وعظم الانتفاع بتصانيفهم في أعصارنا"[2]

اسی طرح علامہ عراقی رحمہ اللہ نے شرح الفیہ میں انہی سات حفاظ حدیث، جن کی کتابوں کو مستحسن قرار دیا گیا ہے، کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وفي هذه الأبيات وفيات أصحاب التصانيف الحسنة بعد الخمسة المذكورين"[3]

جس سے سنن دارقطنی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ اس دور کی قیمتی کتابوں میں شمار ہوتی تھی، جس نے عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کی۔

کسی بھی بڑے مصنف کی تصانیف کی اہمیت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اہل علم نے اس کی تصانیف کو کہاں تک قابلِ اعتنا قرار دیا ہے اور کس حد تک ان کی

[1] تقريب مع التدريب (ص: ٥٨)

[2] مقدمه ابن الصلاح (ص: ٣٤٨)

[3] فتح المغيث للعراقي (١٤٩/٤)

شروح وتعلیقات وغیرہ لکھی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی امام دارقطنی رحمہ اللہ کی تصانیف کو کوئی ... حیثیت حاصل نہیں۔ سنن دارقطنی ہی لیجیے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "إتحاف المهرة" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں دس کتابوں کے اطراف ذکر ... ہیں، ان میں سنن دارقطنی کو بھی شامل کیا ہے، بقیہ کتب کے نام یہ ہیں: موطا مالک، مسند شافعی، مسند احمد، سنن دارمی، ابن خزیمہ، ابن حبان، مستخرج ابوعوانہ، مستدرک حاکم، منتقی ابن جارود، شرح معانی الآثار۔

یوں تو یہ کل گیارہ کتابیں ہو جاتی ہیں، لیکن چونکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے پاس ابن خزیمہ کا مکمل نسخہ نہ تھا۔ علامہ الکتانی رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق اس کا ایک ربع ہی ان کے پاس تھا۔ بایں وجہ انھوں نے دس ہی کا اعتبار کیا ہے۔

علامہ عراقی رحمہ اللہ نے سنن دارقطنی کے رجال پر مستقل کتاب لکھی، جو تہذیب الکمال کے رجال کے علاوہ ہیں۔[1] حافظ قاسم بن قطلوبغا (م ۸۷۹ھ) نے بھی رجال کتب عشرہ میں سنن دارقطنی کو شامل کیا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن الملقن رحمہ اللہ نے چھے کتابوں کے رجال پر کام کیا ہے، ان میں سنن دارقطنی بھی ہے۔[2] اور ... اسحاق المزی رحمہ اللہ نے سنن کی تخریج کی ہے۔[3]

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "الجامع الصغير" میں جن کتابوں کی احادیث کی تخریج کی ہے ان میں سنن دارقطنی کو بھی اپنا ماخذ بنایا ہے اور اس کی علامت "قط" بتلائی ہے اور حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے اس کی رباعیات کو جمع کیا ہے۔[4]

---

(1) لحظ الألحاظ (ص: ٢٣٣)

(2) أيضاً (ص: ٢٠٠) باقی پانچ کتابیں یہ ہیں: مسند احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان، مستدرک حاکم، البیہقی۔

(3) نيل الأوطار (١/٢٠٥) باب ماذا يقال إذا فرغ من الوضوء

(4) فتح المغيث

الغرض طبقہ ثالثہ کی کتابوں میں جو کام امام دارقطنی رحمہ اللہ کی سنن پر ہوا وہ بہت کم کسی کتاب پر ہوا ہوگا، جس سے اس کی اہمیت وافادیت کا پتا چلتا ہے۔

سنن دارقطنی اور اس کے ناقدین:

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ سنن دارقطنی کو طبقہ ثالثہ کی کتابوں میں شمار کیا گیا ہے اور بتصریح شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ طبقہ ثالثہ میں ان کتابوں کا شمار ہوتا ہے، جن میں شاذ، منکر اور غریب روایات پائی جاتی ہیں۔

بنابریں امام دارقطنی رحمہ اللہ کو موجب طعن قرار دینے والوں نے ایک وجہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ انھوں نے ''سنن'' میں شاذ اور منکر روایتیں نقل کی۔ چنانچہ علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ومن أين له تضعيف أبي حنيفة وهو مستحق للتضعيف فإنه روى في مسنده أحاديث سقيمة ومعلولة ومنكرة وغريبة وموضوعة''[1]

''سنن'' کے متعلق بالکل اسی طرح کے الفاظ علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے ''الرسالة المستطرفة''[2] میں کہے ہیں۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''الدار قطني فقد ملا كتابه من الأحاديث الغريبة والشاذة والمعللة وكم فيه من حديث لا يوجد في غيره''[3]

جس کا مقصد یہ ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ''سنن'' میں غریب، شاذ، معلل، ضعیف، منکر بلکہ موضوع روایات کو بھی جمع کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہم ذکر کر

---

[1] مقدمة التعليق الممجد (ص: ٣٤)

[2] الرسالة (ص: ٣١)

[3] نصب الراية (٣٦٠/١)

آئے ہیں، حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ وغیرہ نے سنن کو حسن حدیث کے مظان میں سے شمار کیا ہے اور سنن دارقطنی میں جس قدر ضعیف یا منکر و معلول روایات ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کی وجہ ضعف کو بیان کر دیا ہے، لہٰذا وہ موجبِ طعن قرار نہیں دی جاتیں۔ پھر ہم یہ بھی ذکر کر آئے ہیں کہ اس دور کے ائمہ حدیث نے صحت و سقم کا لحاظ نہیں رکھا، بلکہ ان کا مقصد صرف ذخیرۂ احادیث کو جمع کرنا تھا، لیکن اس کے باوجود امام دارقطنی رحمہ اللہ پھر بھی موجبِ طعن ہیں، جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے تو امام طحاوی رحمہ اللہ کے متعلق ان کی رائے کیا ہے۔ جن کی ''شرح معانی الآثار'' بھی طبقہ ثالثہ کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ امام طبرانی رحمہ اللہ کی معاجم تو ہیں ہی مجموعہ غرائب و مناکیر تو کیا اس وجہ سے انھیں بھی ضعیف کہا جائے گا۔

رجال و سیر کی کتابیں شاہد ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ پر جو الزام علامہ عینی رحمہ اللہ وغیرہ نے عائد کیا ہے۔ متقدمین سے اس قسم کا اعتراض کہیں منقول نہیں ہے۔ اس کے برعکس امام طبرانی رحمہ اللہ پر ان کی معاجم کی وجہ سے یہ اعتراض کیا گیا، لیکن علما نے اس کی طرف التفات تک نہ کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عاب عليه إسماعيل بن محمد بن الفضل التميمي جمعه الأحاديث بالأفراد مع ما فيه من النكارة الشديدة والموضوعات''

تو کیا امام طبرانی رحمہ اللہ کو بھی اس بنا پر ضعیف کہا جائے گا کہ انھوں نے منکر و موضوع روایات جمع کر دی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ انھوں نے صحت کا التزام نہیں کیا۔ ان کا مقصد صرف احادیث کو جمع کر دینا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هذا أمر لا يختص به الطبراني فلا معنى لإفراده اليوم بل أكثر المحدثين في الأعصار الماضية من سنة مأتين وهلم جراً إذا ساقوا الحديث بإسناده اعتقدوا أنهم برؤوا من عهدته. والله أعلم"[1]

بالکل اسی قسم کی بات علامہ ابن عبدالہادی نے کہی ہے:

"إن من عادة الدارقطني و أمثاله أن يذكروا هذا في السنن ليعرف"[2]

یعنی یہ بات امام طبرانی رحمہ اللہ ہی کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ دوسری صدی ہجری سے اکثر محدثین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب وہ حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تو اس طرح خود کو ذمہ داری سے سبکدوش کر لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محدثین نے اس بات کو باعثِ طعن نہیں بنایا، بلکہ اس کے باوجود حافظ عبدالغنی، امام حاکم، خطیب بغدادی، سمعانی، ابن اثیر، علامہ نووی، حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ وغیرہ نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی توثیق کی ہے۔

علاوہ ازیں خود علامہ عینی رحمہ اللہ نے "سنن دارقطنی" کو کتب معتمدہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ عمدۃ القاری میں حدیث: "إنما الأعمال بالنيات" کی تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رواه أيضا أحمد في مسنده والدارقطني وابن حبان والبيهقي ولم يبق من أصحاب الكتب المعتمد عليها من

[1] لسان الميزان (٣/٧٥)

[2] الصارم المنكي (ص: ٦٧)

لم يخرجه سوى مالك فإنه لم يخرجه في موطئه"[1]

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موصوف خود بھی سنن دار قطنی کو کتب معتمدہ میں شمار کرتے ہیں اور ''البنایہ'' میں بحثِ فاتحہ کے تحت جو اس پر تنقید کی ہے، اس کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے حدیث: "من كان له امام فقراءة الإمام له قراءة" کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وجہ سے ضعیف کہا ہے جس سے ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا یہاں یہ تجزیہ و تبصرہ کہاں تک مبنی بر صداقت ہے۔

سنن دار قطنی اور اس کے نسخے:

امام دار قطنی رحمہ اللہ سے سنن کو روایت کرنے والے اگرچہ ان کے متعدد تلامذہ ہیں، لیکن اس کا سلسلہ سند جن حضرات سے قائم ہے وہ تین ہیں:

(1) ابو بکر محمد رحمہ اللہ بن عبدالملک بن بشران۔

(2) ابو طاہر محمد رحمہ اللہ بن احمد بن محمد۔

(3) ابو بکر احمد رحمہ اللہ بن محمد بن احمد البرقانی۔

ان کے علاوہ ''سنن دار قطنی'' گو ابو منصور محمد رحمہ اللہ بن محمد النوقانی، ابو الطیب طاہر رحمہ اللہ بن عبداللہ الطبری، ابو الحسن محمد رحمہ اللہ بن علی بن عبداللہ المہتدی باللہ کی روایت سے بھی مروی ہے۔ لیکن زیادہ تر وہی نسخے مشہور ہیں، جو پہلے تین حضرات سے منقول ہیں۔ ان تینوں نسخوں میں گو اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن اصولاً ان میں کوئی فرق نہیں۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی ان تینوں نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''و درمیان ایں ہر سہ نسخہ تفاوت و اختلاف واقع است اما در تقدیم و تاخیر و زیادت و نقصان در نسبت بعض رواۃ و در الفاظ نیز، اما در اصل حدیث تغیر

[1] عمدة القاري (٢٣/١)

اختلاف نیست، احادیث در ہر نسخہ ازیں نسخہ سہ گانہ بالاستیفا مذکورند مگر کتاب السبق کہ در روایت ابن عبدالرحیم موجود نیست۔''[1]

ہندوستان میں جو نسخہ رائج ہے وہ ابن بشران کا روایت کردہ ہے۔ حضرت مولانا محمد شمس الحق ڈیانوی مؤلف عون المعبود رحمہ اللہ کی محنت و کاوش سے یہ نسخہ منصۂ شہود پر آیا۔ خود ان کے پاس بھی ایک قلمی نسخہ موجود تھا۔ دوسرا نسخہ شیخ عبدالغنی رحمہ اللہ محدث کا نسخہ جناب مولانا سید نواب صدیق حسن خان صاحب سے مل گیا اور ایک تیسرا نسخہ مولانا رفیع الدین صاحب بہاری رحمہ اللہ سے ملا، جو اگرچہ ناقص تھا، لیکن تھا بہت قدیم اور صحیح۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر بائیس حفاظ و محدثین کے دستخط تھے۔ جن میں حافظ ابو الحجاج رحمہ اللہ دمشقی، عبدالمومن رحمہ اللہ بن خلف دمیاطی، عبدالرحیم رحمہ اللہ بن حسین زین الدین عراقی، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، شیخ عبیداللہ رحمہ اللہ بن عمر الفاسی، شیخ صالح الفلانی رحمہ اللہ جیسے اساطینِ حدیث بھی شامل ہیں۔[2]

مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے اپنے نسخہ کا ان کے ساتھ مقابلہ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کتبِ اطراف و تخریج وغیرہ کی مدد سے بھی متن کی تصحیح کی کوشش کی اور ساتھ ہی ایک مختصر مگر مفید حاشیہ بھی تحریر فرمایا جو ''التعلیق المغنی'' کے نام سے طبع ہے۔

التعلیق المغنی کے علاوہ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے دو درجن سے زائد مختلف اہم مباحث پر کتابیں لکھیں جن میں ''غایۃ المقصود، عون المعبود، شرح سنن ابی داود اور اعلام أھل الاثر بأحکام رکعتي الفجر'' ان کا شاہکار مانا جاتا ہے۔

ضروری تنبیہ: محدث ڈیانوی نے ان تینوں نسخوں کی تفصیل میں جو ایک نسخہ،

[1] بستان المحدثین (ص: ٤٨)

[2] اشتہار کتب نادرہ جو کہ سنن دارقطنی (ط ہند) کے آخر میں ہے۔

'' نسخہ البرقانی'' کا بحوالہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ذکر کیا ہے اور پھر اسی بنا پر اس کا راوی امام ابوبکر محمد بن احمد بن غالب المعروف بالبرقانی قرار دیا ہے۔ یہ محل نظر ہے۔ ممکن ہے شاہ صاحب کی بستان المحدثین کے قلمی نسخہ میں یوں ہی البرقانی ہو مگر اس کے مطبوعہ نسخہ ۱۹۱۵ء مجتبائی دہلی اور دیگر مطبوعہ نسخوں میں ''التوقانی'' ہے، مگر نہ ''البرقانی'' صحیح ہے نہ ''التوقانی'' صحیح ہے، بلکہ السنن کے تیسرے راوی امام ابومنصور محمد بن محمد بن احمد النوقانی ہیں، جیسا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے المعجم المفهرس (ص: ٤٧) میں ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھیے: سير أعلام النبلاء (٦/١٨)

''سنن دارقطنی'' پر ایک نظر:

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں کم و بیش ۴۷۴۹ احادیث ذکر کی ہیں. جنھیں پچیس کتابوں میں جمع کیا ہے اور سب سے پہلے اپنی سنن کو کتاب الطہارۃ سے شروع کیا ہے۔

حدیث کے ذکر کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ اولاً ایک حدیث کے تمام طرق جمع کر دیتے ہیں، پھر متن ذکر کرنے کے بعد اس کی سند پر کلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی راوی ضعیف ہوتا ہے تو اس پر جرح کرتے ہیں یا پھر اسے حسن یا صحیح قرار دیتے ہیں. اس کے علاوہ کوئی اور علت ہوتی ہے تو اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی سنن کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ علمائے فن نے اسے حدیث حسن کی معرفت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ حدیث حسن کی تصریح یا تو امام بخاری رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے متفرق اقوال میں ملتی ہے یا پھر جامع ترمذی میں ہے، لیکن چونکہ اس کے نسخے مختلف ہیں۔ بنابریں صحیح طور پر اس کا پتا نہیں چل سکتا

الا یہ کہ کوئی صحیح نسخہ مل جائے۔ حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اسی اختلافِ نسخ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تختلف النسخ من كتاب الترمذي في قوله: هذا حديث حسن أو حديث حسن صحيح ونحو ذلك فينبغي ان تصحيح أصلك به بجماعة أصول وتعتمد على ما اتفقت عليه"[1]

شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے اسی الجھن کو رفع کرنے کے لیے جامع ترمذی کے چھے مختلف نسخوں جن میں تین خطی تھے، کو جمع کر کے ایک صحیح ترین نسخہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ مگر ابھی وہ کتاب الصلاۃ ہی مکمل کر پائے تھے کہ جان جاں آفرین کے سپرد کر دی اور یوں یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اس کی تکمیل کی کوشش گو شیخ محمد فواد عبدالباقی اور شیخ ابراہیم عطوہ نے کی۔ لیکن تصحیح متن کا وہ التزام جو شیخ شاکر رحمہ اللہ کے مرہونِ منت تھا، نہ ہو سکا اور اگر اسی نوعیت سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو یقیناً اسے جامع ترمذی کا صحیح نسخہ قرار دیا جاتا۔ جامع ترمذی کے علاوہ سنن ابی داود، سنن نسائی کو بھی اگرچہ مظان حسن سے شمار کیا گیا ہے، لیکن ان کے کلام میں یہ جملہ کہیں لکھنے پڑھنے میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ سنن دارقطنی ہی ایک ایسی کتاب ہے کہ اس میں دارقطنی رحمہ اللہ کئی مقامات پر یہ تصریح فرما دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے مقدمہ میں تصریح کی ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی سند کو بلند کرنے والی سند خماسی ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فنی اعتبار سے اس کی حیثیت بھی ذکر کرتے ہیں۔

---

[1] مقدمة ابن الصلاح (ص: ٣٢)

جس کی چند امثلہ درج ذیل ہیں:

مرسل کی مثال:

"سنن" (ص: ۱۹۵، طبع ہند) میں ایک جگہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ایک حدیث ان الفاظ سے ذکر کی ہے:

"حدثنا أبو بكر عبد الله بن سليمان بن الأشعث: ثنا محمود بن آدم: ثنا الفضل بن موسىٰ: ثنا عبد الله بن سعيد بن أبي هند عن ثور بن يزيد، عن عكرمة، عن ابن عباس قال: كان رسول الله ﷺ يلتفت في صلاته يمينا وشمالا، لا يلوي عنقه خلف ظهره" (رقم: ۱۸۳۹)

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"فضل بن موسیٰ اسے متصل ذکر کرنے میں منفرد ہیں اور اس کے دوسرے ساتھی عبداللہ بن سعید اسے مرسل بیان کرتے ہیں۔"

چنانچہ اس کے بعد انھوں نے یہی روایت بواسطہ "وكيع ثنا عبد الله بن سعيد بن أبي هند عن رجل من أصحاب عكرمة قال: كان رسول الله ﷺ" الحدیث ذکر کی ہے۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ "فضل بن موسیٰ" کے دوسرے رفیق امام وکیع رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ سلسلۂ سند تبع تابعی تک ہی بیان کیا ہے۔

فائدہ: اصولِ حدیث کا طالب علم اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ حدیث مرسل اور منقطع میں فرق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ روایت عکرمہ کے شاگرد ثور بن یزید سے مروی ہے اور وہ تبع تابعی ہیں تو یہ روایت مرسل نہیں، بلکہ منقطع ٹھہری۔ امام

دارقطنی رحمہ اللہ کا اسے مرسل کہنا کیونکر صحیح ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ منقطع اور مرسل کا یہ فرق اکثر ائمۂ اصول کے نزدیک اگرچہ درست ہے، لیکن ائمہ محدثین اسے ایک ہی معنی پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کا شمار بھی ان ہی اصحابِ فکر میں ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین ہزاروی رحمہ اللہ علامہ نووی رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں:

''وبلحاظ ہمیں معنی ابو زرعۃ رازی و ابو حاتم و دارقطنی و بیہقی اطلاق مرسل بر منقطع کردہ اند و ابو داود در مراسیل ہمبرین اصطلاح رفتہ و ہمچنیں بخاری دربعض مواضع صحیح خود ...الخ،،[1]

اسی طرح علامہ الجزائری رقمطراز ہیں:

"وقد أطلق المرسل على المنقطع من أئمة الحديث أبو زرعة و أبو حاتم والدارقطني"[2]

بایں وجہ جب امام دارقطنی رحمہ اللہ کی یہی اصطلاح ہے تو اعتراض کی قطعاً گنجایش نہیں۔

حسن کی مثال:

''سنن'' (ص: ١٢٧) میں ایک حدیث کی سند یوں بیان کرتے ہیں:

"ثنا محمد بن إسماعيل الفارسي: ثنا يحيىٰ بن عثمان بن صالح: ثنا إسحاق بن إبراهيم: حدثني عمرو بن الحارث:

---

[1] تصحيح النظر شرح نخبه الفكر

[2] توجيه النظر (ص: ٢٤٣)

حدثني عبد الله بن سالم عن الزبيدي، حدثني الزهري عن أبي سلمة وسعيد عن أبي هريرة قال: كان النبي ﷺ إذ فرغ من قراءة أم القرآن رفع صوته وقال: آمين"

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"هذا إسناد حسن" (رقم: ١٢٥٨)

صحیح کی مثال:

اسی باب میں ایک جگہ ایک روایت کی سند یوں نقل کرتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن جعفر بن خشيش: ثنا الحسن بن أحمد بن أبي شعيب: ثنا محمد بن سلمة عن أبي عبد الرحيم، عن زيد بن أبي أنيسة، عن أبي إسحاق، عن عبد الجبار بن وائل، عن أبيه قال: صليت خلف رسول الله ﷺ قال: فلما قال: ولا الضالين، قال: آمين، مد بها صوته"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"هذا إسناد صحيح" (رقم: ١٢٥٦)

منکر کی مثال:

"حدثنا محمد بن مخلد: نا أحمد بن إسحاق بن صالح الوزان: ثنا إسحاق بن موسىٰ الأنصاري: ثنا عاصم بن عبد العزيز عن أبي سهيل، عن عون، عن ابن عباس عن النبي ﷺ قال: يكفيك قراءة الإمام خافت أو قرأ، قال أبو موسىٰ قلت: لأحمد بن حنبل في حديث ابن عباس هذا

في القراءة، فقال: هذا منكر" (دارقطني: ۱/۳۲۲، رقم: ۱۲۵۱)

الغرض اسی طرح امام دارقطنی رحمہ اللہ نے متعدد مقامات پر حدیث کے ضعیف، شاذ، مرسل، منکر، حسن یا صحیح ہونے کی صراحت کی ہے، جس سے ان کے علم و فضل اور علم حدیث سے گہرے تعلق کا پتا چلتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان کی سنن کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"والدارقطني صنف سننه ليذكر فيها غرائب السنن وهو في الغالب يبين حال ما رواه وهو أعلم الناس بذلك"[1]

"انھوں نے سنن اس لیے تصنیف کی ہے کہ غرائب کا ذکر کریں اور اکثر اوقات ان کی حالت بھی ذکر کر دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ اس فن کو خوب جانتے تھے۔"

بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن دارقطنی صحاح ستہ کے علاوہ روایات کو جمع کرنے کے لیے تألیف کی گئی ہے، تاکہ باقی ماندہ فقہی روایات کے طرق اور ان پر فنی گفتگو ایک جگہ پر مدون ہو جائیں۔

چنانچہ "رسالہ تسعینیہ" میں لکھتے ہیں:

"و أبو الحسن مع تمام إمامته في الحديث فإنه إنما صنف هذه السنن كي يذكر فيها الأحاديث المستغربة في الفقه ويجمع طرقها فإنها هي التي يحتاج فيها إلى مثله"[2]

یہاں ہم اس بات کی وضاحت ضروری خیال کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کے

[1] الرد على البكري (ص: ۲۰)
[2] فتاوی شیخ الإسلام (۲۵۱/۵) طبع قدیم

الفاظ ''غرائب السنن'' وغیرہ سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں تمام غرائب موضوع ہیں، جنھیں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے نقل کر دیا ہے۔ جیسا کہ بعض احباب نے سمجھا ہے، لیکن ایسا نہیں، بلکہ ان کی مراد وہ روایات ہیں جو صحاح ستہ سے خارج ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کتاب الوتر میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے یوں نقل کی ہے:

''قال رسول الله ﷺ لا توتروا بثلاث أوتروا بخمس أو بسبع ولا تشبهوا بصلاة المغرب''[1]

یہ روایت ان الفاظ سے اصولِ ستہ میں مذکور نہیں، لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں جیسا کہ انھوں نے صراحت بھی کی ہے تو ایسی روایات ہی کو ''غرائب السنن'' سے موسوم کیا گیا ہے اور اصولِ حدیث کا یہ قانون مسلم ہے کہ ہر غریب روایت ضعیف نہیں ہوتی۔

سنن دارقطنی رحمہ اللہ کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ بسا اوقات ایک راوی پر جرح کرتے ہیں، حالانکہ وہ جرح مرجوح ہوتی ہے۔ ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال میں اختلاف اور اس میں راجح پہلو ایک علاحدہ امر ہے، ہم یہاں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی جس جرح کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اس کی نوعیت یہ ہے کہ بسا اوقات وہ کسی راوی کو عدمِ معرفت کی بنا پر مجہول کہتے ہیں، حالانکہ وہ مجہول نہیں ہوتا، مثلاً:

① ''باب زكاة الحلي'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث بواسطہ ''محمد بن عطا عن عبد الله بن شداد بن الهاد'' مروی ہے اسے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] سنن دارقطني (٢/٢٤)

"محمد بن عطاء مجهول" (رقم: ۱۹۲۸)

لیکن ان کا یہاں محمد بن عطا کو مجہول کہنا صحیح نہیں۔ محمد بن عطا سے مراد یہاں محمد بن عمرو بن عطا ہیں۔ راوی نے جب اسے دادا کی طرف منسوب کیا تو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کو ایک دوسرا راوی خیال کرتے ہوئے مجہول کہہ دیا۔ محدث نیانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

"قال البيهقي في المعرفة وهو محمد بن عمرو بن عطاء لكنه لما نسب إلى جده فظن الدارقطني أنه مجهول وليس كذلك"

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مطابقت میں حافظ عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی "احکام" میں اسے مجہول کہا ہے، لیکن حافظ ابن القطان رحمہ اللہ نے اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب سنن کی سند میں محمد کو دادا کی طرف منسوب کیا گیا تو دارقطنی رحمہ اللہ اسے پہچان نہ سکے تو اسے مجہول کہہ دیا اور عبدالحق نے انہی کی متابعت میں اسے مجہول کہہ ڈالا، حالانکہ محمد بن عمرو بن عطاء ثقات سے ہیں۔"

لیکن اس قسم کے سہو اور عدمِ معرفت کی بنا پر امام دارقطنی رحمہ اللہ کی رفعت شان اور علوِ مرتبت پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا اس قسم کے امور کو اگر باعثِ طعن قرار دیا جائے تو شاید محدثین میں سے کوئی بھی ایسے طعن سے محفوظ نہ رہے۔

بعض کتبِ صحاح سے تقابل:

امام دارقطنی رحمہ اللہ "سنن" میں بسا اوقات ائمہ ستہ سے روایت بیان کرتے ہوئے ان کی کتاب اور اس روایت کے الفاظ وغیرہ میں باہم اتفاق یا اختلاف بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب الصیام میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو روایت بواسطہ

مالک عن نافع بایں الفاظ مروی ہے:

"...ل رسول اللہ ﷺ لا تصوموا حتی تروا الھلال" (الحدیث)

سے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"...ہو فی الموطأ عن نافع و ابن دینار عن ابن عمر"

یعنی موطأ میں یہ روایت نافع اور ابن دینار عن ابن عمر کے واسطہ سے مروی ہے جس... سے وہ گویا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نافع کی متابعت ابن دینار نے بھی کی ہے یہ علا...ہ بات ہے کہ امام مالک نے ابن دینار کی روایت کو موطأ میں علاحدہ بیان کیا ہے۔ ا...س طرح چند روایات کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو روایت بواسطہ آدم "ثنا ش...عبۃ ثنا محمد بن زیاد" نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

فان غبّي عليكم الشهر فعدوا ثلاثين يعني عدوا شعبان ثلاثين" (رقم: ۲۱٤۷)

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "یہ روایت صحیح ہے اور آدم نے شعبہ... سے اسی طرح بیان کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے "الصحیح" (رقم ۱۹۰۹...) میں آدم عن شعبہ ہی کے واسطہ سے اسے یوں بیان کیا ہے: "فعدو... شعب... ثلاثین" اور درمیان میں "یعنی" کا لفظ نہیں کہا تو یہاں امام دارقطنی رحمہ اللہ صحیح ...اری اور سنن کی اس روایت میں ایک باریک فرق بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ "فع...وا شعبان ثلاثین" کے الفاظ دراصل راوی کی تفسیر ہے نہ کہ یہ الفاظ بھی مرفو... ہیں۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے مرفوع ہی ذکر کر دیا ہے، جس سے اما... دارقطن... رحمہ اللہ کی دقتِ نظر اور جودتِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے اس اعتراض و الزام کا جو جواب "التعلیق المغنی" میں...

دیا ہے۔ اہلِ علم کے لیے اس کی طرف مراجعت ضروری ہے تاہم ہم یہ ضرور کہیں گے کہ "فعدوا شعبان ثلاثین" کے الفاظ میں رفع و عدمِ رفع کا سوال نہیں۔ جیسا کہ "تعلیق المغنی" کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے، بلکہ آدم کی روایت میں ان کے مدرج ہونے کا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے مدرج ہونے کی صراحت نہیں کی۔ جس سے آدم کی روایت میں یہ جملہ مرفوع معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ راوی کی تفسیر ہے، جیسا کہ سنن دارقطنی میں صراحتاً مروی ہے اِلا یہ کہ آدم کبھی تو اسے بطورِ تفسیر ذکر کرتے ہوں اور کبھی بغیر تفسیر کے یعنی اسے مرفوعاً ہی ذکر کرتے ہوں۔ اور امام بخاری نے جیسے سنا، اسی طرح بیان کیا ہے۔ مزید دیکھیے: "فتح الباري" (١٢١/٤)

سنن دارقطنی کے مطالعہ کے دوران ہمیں بعض دیگر کتبِ حدیث کے ساتھ اس کی احادیث کے معارضہ و مقابلہ کے وقت ہی ایک اہم چیز نظر آئی، جسے ہم اصحابِ ذوق کے لیے ذکر کر دینا نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ: "باب ذكر الركوع والسجود وما يجزئ فيهما" کے تحت حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے جو روایت بواسطہ "يزيد بن هارون أنا شريك عن عاصم بن كليب عن أبيه عن وائل" مروی ہے اس کے ذکر کرنے کے بعد امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لم يحدث به عن عاصم بن كليب غير شريك و شريك ليس بالقوي فيما يتفرد به والله أعلم"[1]

"عاصم سے روایت کرنے میں شریک منفرد ہے اور وہ قوی نہیں، جب کہ وہ منفرد ہو۔"

---

[1] سنن دارقطني (٣٤٥/١، رقم: ١٢٩١)

اسی طرح اس روایت پر کلام کرتے ہوئے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا نعرف أحدا رواه غير شريك" [1]

لیکن "زوائد ابن حبان" میں یہی روایت یزید بن ہارون کے طریق سے بواسطہ اسرائیل عن عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل مروی ہے۔ [2]

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ "شریک بن عبداللہ النخعی" اس روایت میں منفرد ہے صحیح نہیں، بلکہ اس کی متابعت اسرائیل سے ثابت ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس متابعت کا ثبوت محلِ نظر ہے، کیونکہ عاصم بن کلیب کے تلامذہ میں اسرائیل نامی کسی شاگرد کا نام کتبِ رجال میں ہمیں نظر نہیں آیا اور نہ ہی اسرائیل کے مشایخ میں عاصم بن کلیب کہیں نظر آتے ہیں۔ واللہ أعلم

یہی نہیں بلکہ "صحیح ابن حبان" کا ایک خطی نسخہ حضرت پیر محب اللہ دامت برکاتہم کے کتب خانہ میں موجود ہے، جس میں عاصم بن کلیب کا شاگرد شریک ہی مذکور ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ موارد الظمآن کے نسخہ میں تصحیف ہے اور امام دارقطنی رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ شریک اس میں منفرد ہے، یہی صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم

ائمہ ستہ سے طریق روایت:

سنن دارقطنی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ ائمہ صحاح ستہ کے ایک واسطہ سے شاگرد ہیں۔

---

[1] ترمذي مع التحفه (۲۲۸/۱)

[2] موارد الظمآن (ص: ۱۳۲)

چنانچہ وہ امام بخاری رحمہ اللہ سے بواسطہ الحسین بن اسماعیل، احمد بن سلیمان اور محمد بن ہارون، امام مسلم سے بواسطہ محمد بن مخلد، امام نسائی سے بواسطہ حسن بن الخضر المعدل اور محمد بن القاسم ابو بکر اور امام ابو داود سے بواسطہ محمد بن یحییٰ بن مرداس، محمد بن مخلد اور اسماعیل بن محمد بن الصفار روایت کرتے ہیں۔

اب ہم آخر میں سنن دارقطنی کی طبع جدید و قدیم کے متعلق اس بات کی وضاحت ضروری خیال کرتے ہیں کہ طبع جدید کے ناشرین نے اس کی تصحیح کا التزام نہیں کیا۔ طبع قدیم میں حاشیہ پر جو نسخوں کا اختلاف ذکر کیا گیا تھا۔ اس کا بھی قطعاً اہتمام نہیں کیا۔ جس سے بسا اوقات متن کی عبارت میں عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ سنن دارقطنی طبع بیروت کا مطالعہ کرتے ہوئے ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے سامنے اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ تاہم صرف ایک کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، چنانچہ: "باب القهقهة في الصلاة وعللها" کے تحت امام دارقطنی رحمہ اللہ ایک جگہ ابو العالیہ کی روایت پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كان أربعة يصدقون من حديثهم ولا يبالون ممن يسمعون الحديث: الحسن وأبو العالية و حميد بن هلال قال الشيخ ولم يذكر الرابع"

بعینہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تہذیب التہذیب" (۵۲/۳) میں حمید بن ہلال کے ترجمہ میں یہ صراحت کی ہے کہ شیخ نے تین کا ذکر تو کیا ہے، لیکن چوتھے راوی کا نام نہیں لیا۔ البتہ سنن کے بعض نسخوں میں داود بن ابی ہند کا نام ملتا ہے۔

اسی طرح محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے سنن طبع قدیم کے حاشیہ پر نسخہ کی علامت ذکر کرتے ہوئے چوتھے راوی کا نام داود بن ابی ہند بتلایا ہے۔ لیکن طبع جدید میں داود

بن ابی ہند کو متن میں ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ "ولم يذكر الرابع" کے الفاظ بھی جوں کے توں رہنے دیے ہیں۔ جس سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ طبع جدید کے ناشرین نے اس کی تصحیح کا کس قدر اہتمام کیا ہے۔

حدیث قلتین اور سنن دارقطنی:

سنن دارقطنی کے بعض مقامات خصوصیت کے حامل ہیں، جن میں ایک مقام "حدیث قلتین" کے جملہ طرق کی وضاحت ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے علاوہ اگرچہ دیگر محدثین نے بھی متعدد طرق سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ تاہم اس کے جملہ طرق کا جو استیعاب امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کیا ہے کسی دوسری کتاب میں اس کا ملنا مشکل ہے۔ اسی بنا پر متاخرین نے اس سلسلہ میں جس قدر ابحاث قلمبند کی ہیں وہ کسی بھی صورت امام دارقطنی رحمہ اللہ کی سنن سے مستغنی نہیں ہو سکے اور اس ایک حدیث کے بیان کرنے میں امام موصوف کی ثقاہت اور قوتِ حافظہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

"حدیث قلتین کی اسانید کا بڑی کثرت سے احاطہ کیا ہے، چنانچہ اس کی چون (۵۴) اسانید ذکر کی ہیں۔ ازاں جملہ نو اسانید سے یہ الفاظ منقول ہیں: "إذا كان الماء أربعين قلة" اور ان میں سے اول جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ سے مروی ہے اور ان اسانید کی تضعیف بھی کی ہے۔ باقی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور ان میں بھی بعض روایات میں تو "لم ينجس" کے الفاظ واقع ہیں اور بعض میں "لم ينجسه بشيء" آیا ہے۔ رہے دوسرے پینتالیس (۴۵) طریق جن میں ایک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ہے اور وہ اس حدیث کو ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں:

"ما بلغ من قلتين فما فوقها ذلك لم ينجسه شيء" اور دوسرا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ اس حدیث کو ان الفاظ سے ذکر کرتے ہیں: "إذا كان الماء قلتين فصاعدا لم ينجسه شيء" اور باقی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، جن میں بعض روایات تو اس طرح پر ہیں: "عن ابن عمر عن النبي ﷺ" اور بعض "عن ابن عمر عن أبيه" اور دونوں میں یہی لفظ ہیں: "إذا كان الماء قلتين" حاصل یہ کہ سب امور ان کے قوتِ حافظہ اور استیفا پر دلالت کرتے ہیں۔[1]

حدیثِ قلتین کے علاوہ بھی اگر سنن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے متعدد مقامات نظر آتے ہیں۔ جہاں انھوں نے اسانید کو کافی حد تک جمع کرنے اور اختلافِ روایات کی وضاحت کرنے میں بڑی تندہی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ جن میں سے حدیث: "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة" حدیث: "القراءة بسم الله" اور حدیث: "القهقهة في الصلاة" خصوصاً قابلِ مطالعہ ہیں۔

② کتاب العلل:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی دوسری اہم کتاب "کتاب العلل" ہے علمِ حدیث کی مختلف انواع میں اسی نوع یعنی "معرفۃ العلل" کا علم سب سے اجل و اشرف اور انتہائی مشکل ہے، جس میں راوی کے ضعیف ہونے کی بنا پر تو کلام نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات ایک حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہے، لیکن اس میں بعض ایسے خفی عیوب ہوتے ہیں، جن کی بنا پر وہ روایت درجۂ اعتبار سے ساقط ہوتی ہے اور اسی قسم کے علم کا نام "معرفۃ العلل" ہے۔ معلل حدیث کی تعریف میں علما نے لکھا ہے کہ

---

[1] بستان المحدثین (ص: ٤٨)

جس میں کسی ایسی مخفی علت کا پتا چلے جس سے حدیث میں قدح وارد ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ حدیث بظاہر ضعف سے سالم نظر آتی ہو، محدثین اس کا نام معلول بھی رکھتے ہیں جو "عَلَّ" فعل ماضی سے اسم مفعول ہے، اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ بہتر یہ ہے اسے لغتاً "معلَّ" دولام سے پڑھا جائے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث معلل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هو من أغمض أنواع الحديث وأدقها ولا يقوم به إلا من رزقه الله تعالىٰ فهما ثاقباً و حفظاً واسعاً ومعرفة تامة بمراتب الرواة وملكة قوية بالأسانيد والمتون"[1]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس فن کی مثال درہم کی سی ہے کہ ان میں درہم کھرے بھی ہوتے ہیں اور کھوٹے بھی۔ لیکن ان کی حقیقت کو ایک کامیاب جوہری ہی پا سکتا ہے۔ اسی طرح علم حدیث کی مثال ہے ان میں بعض احادیث ضعیف ہوتی ہیں بعض صحیح اور بعض میں علت غامضہ ہوتی ہے، لیکن اس کا پتا وہی شخص لگا سکتا ہے، جسے اس فن میں مہارت تامہ میسر ہو، بلکہ بعض اہلِ علم نے تو اس فن کو وہبی یا الہامی بھی کہا ہے اور یہی وہ خاردار وادی ہے جس میں ہر شخص قدم نہیں رکھ سکتا، بلکہ جسے قدرتِ الٰہی نے اپنے خصوصی فیضان سے فہم ثاقب اور حفظ واسع سے نوازا ہو وہی اس وادی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: "محدثین کی قلیل جماعت نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔"

دیگر اصحابِ علل

ہم یہاں ان محدثین کرام کا ذکر مناسب خیال کرتے ہیں، جنھوں نے اس فن پر

[1] شرح نخبة الفكر، توضيح الأفكار (٢/٢٩)

کتابیں لکھی ہیں، تاکہ ان کی اور امام دارقطنی رحمہ اللہ کی ''العلل'' میں فرق واضح ہوسکے۔

(۱) امام علی بن مدینی رحمہ اللہ (م ۲۳۴ھ/۸۴۸ء):

امام بخاری کے استاد ہیں اور اس فن پر غالباً سب سے پہلے انھوں نے ہی کتاب لکھی ہے امام ابو حاتم فرماتے ہیں:

''كان ابن المديني علما في معرفة الحديث والعلل''[1]

امام ابن المدینی کی کتاب ''العلل و معرفة الرجال'' کا کچھ حصہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوگیا ہے۔

(۲) امام محمد رحمہ اللہ بن اسماعیل بخاری (۲۵۸ھ/۸۸۶ء):

تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں حافظ دنیا کے لقب سے یاد کیا ہے علل حدیث میں جس قدر انھیں عبور حاصل تھا اس کا اندازہ احمد بن حمدون رحمہ اللہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں: میں نے ایک جنازے میں امام بخاری رحمہ اللہ کو دیکھا کہ محمد رحمہ اللہ بن یحییٰ الذہلی ان سے اسما اور عللِ حدیث کے متعلق سوال کرتے تھے تو وہ اس طرح جواب دیتے جاتے، جیسا کہ ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ پڑھ رہے ہیں۔[2]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''لم أر أحدا بالعراق ولا بخراسان في معنى العلل والتاريخ ومعرفة الأسانيد أعلم من محمد بن إسماعيل''[3]

---

[1] تذكرة الحفاظ (۲/۱۵) تهذيب التهذيب (۷/۳۵)

[2] هدي الساري

[3] تاريخ بغداد (۲/۲۷)

الغرض امام بخاری رحمہ اللہ کا اس فن میں ماہر ہونا کسی بھی صاحبِ علم سے مخفی نہیں. یکن حافظ مسلمہ بن قاسم اندلسی (م۳۵۳ھ) کا خیال ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کو العلل میں جو مقام حاصل ہے وہ دراصل ان کی اپنی کوشش وسعی کا ثمرہ نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ علی بن المدینی رحمہ اللہ کی کتاب ''العلل'' ان کے کہیں چلے جانے کے دوران میں ان کے صاحبزادے کو مال کا طمع دے کر ایک دن کے لیے حاصل کی اور وہ کاتبوں سے لکھوالی۔ جب علی بن المدینی رحمہ اللہ سفر سے واپس آئے تو اس پر جب وہ گفتگو کرنے لگے تو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب کی عبارتیں کو اپنی طرف سے علی بن المدینی رحمہ اللہ کے سامنے پیش کیا تو وہ اس معاملے کو سمجھ گئے اور سخت رنجیدہ ہوئے بالآخر اسی رنج والم میں انتقال فرما گئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کتاب کی بدولت ان سے مستغنی ہوئے اور خراسان جا کر ''الصحیح'' کی تصنیف میں مشغول ہو گئے۔''

لیکن یہ مسلمہ کی سراسر بدگمانی ہے جو خلافِ واقع ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب التہذیب میں امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ان کا یہ اعتراض نقل کر کے لکھا ہے:

''وإنها غنية عن الرد لظهور فسادها وحسبك أنها بلا إسناد وأن البخاري لما مات علي كان مقيماً ببلاده والعلل لابن المديني قد سمعها منه غير واحد غير البخاري فلو كان ضنينا بها لم يخرجها إلى غير ذلك من وجوه البطلان لهذه الأخلوقة والله الموفق''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس جواب سے گو ہمیں اتفاق ہے کہ مسلمہ بن قاسم

[1] تهذيب التهذيب (۹/۵۵)

نے اس قصہ کی کوئی سند پیش نہیں کی، لیکن سند تو کجا خود مسلمۃ کی حالت یہ ہے کہ اندلس کے رہنے والوں نے اسے کذاب تک کہا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"كان القوم بالأندلس يتحاملون عليه وربما كذبوه و سئل القاضي محمد بن يحيىٰ بن مفرج عنه فقال: لم يكن كذابا ولكن كان ضعيف العقل وقال أبو جعفر المالقي: فيه نظر"[1]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مسلمة بن قاسم القرطبي كان في أيام المستنصر الأموي ضعيف"[2]

لہٰذا اس جیسے ضعیف بلکہ کذاب اور ضعیف العقل راوی کی بے سند بات کو معتبر قرار دے کر امام بخاری رحمہ اللہ کی عدالت و امانت کو داغدار کرنا انصاف کے گلے پر چھری چلانے کے مترادف ہے۔

③ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

"العلل ومعرفة الرجال" بروایت عبداللہ بن احمد شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صبحي صالح نے ذکر کیا ہے کہ اس کا مخطوط مکتبہ ظاہریہ میں موجود ہے، لیکن اس کا حجم انتہائی تھوڑا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"مخطوط الظاهرية مجموع ٤٠ وهو عبارة عن ٢٣ ورقة

---

[1] لسان الميزان (٦/٣٥)

[2] ميزان الاعتدال (٣/٣٥)

سر القطع الصغير مضموم إلى مجلد يشتمل على عدة
رسائل تبلغ ٣٢٥ ورقة بخطوط مختلفة"[1]

ظاہر ہے کہ کتاب ''العلل'' کا یہ مخطوط ناقص ہے۔

④ امام ابو زرعہ رحمہ اللہ:

اپنے زمانہ کے کبار حفاظِ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ''العلل'' پر کتابوں کا ذکر کرنے والوں نے ان کی کنیت ہی نقل کرنے پر اکتفا کی ہے، حالانکہ ابو زرعہ کی کنیت سے دس ایسے محدث ہیں، جن کا شمار حفاظِ حدیث میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہیں:

① ابو زرعہ المصری حیوۃ بن شریح م ۱۵۸ھ۔

② ابو زرعہ الدمشقی عبدالرحمان بن عمرو م ۲۸۱ھ۔

③ ابو زرعہ رازی احمد بن حسین ۳۷۵ھ۔

④ ابو زرعہ الرازی عبیداللہ بن عبدالکریم ۲۶۴ھ وقیل ۲۶۸ھ۔

⑤ ابو زرعہ الاستراباذی احمد بن بندار بن محمد ۳۸۲ھ۔

⑥ ابو زرعہ الدمشقی محمد بن عبداللہ بن عبداللہ ۳۶۰ھ۔

⑦ ابو زرعہ الرازی روح بن محمد ۴۲۳ھ۔

⑧ ابو زرعہ رحمہ اللہ الکشی محمد بن یوسف الجرجانی ۳۹۰ھ۔

⑨ ابو زرعہ الیمنی محمد بن ابراہیم ۳۶۰ھ۔

⑩ ابو زرعہ الجرجانی احمد بن حمید الصید لانی۔ یہ امام یحییٰ بن القطان کے تلامذہ سے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان کا سنِ وفات ذکر نہیں کیا۔

یہ ہیں وہ دس حفاظِ حدیث جو ابو زرعہ کی کنیت سے مشہور ہیں۔ اب دیکھنا یہ

[1] علوم الحديث (ص: ١٨٧)

تب ان میں علل حدیث کے ماہر کون تھے، کس نے اس موضوع پر کتاب لکھی ہے؟ تو ان کے تراجم جملہ متداول کتب کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کے ماہران میں سے تین بزرگ ہوئے ہیں:

① ابو زرعہ الجرجانی احمد بن حمید۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حافظ عارف بالعلل"[1]

② ابو زرعہ الرازی عبیداللہ بن عبدالکریم۔

حفاظِ حدیث میں شمار ہوتے ہیں معرفتِ علل میں ان کے مقام کا اندازہ ابن ابی حاتم کی العلل سے لگایا جا سکتا ہے۔

③ ابو زرعہ الدمشقی عبدالرحمان بن عمرو۔

ابو زرعہ عبدالرحمان بن عمرو کے ترجمہ میں اگرچہ حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، ابن کثیر، اور ابن العماد رحمہم اللہ وغیرہ نے تصریح نہیں کی کہ انھوں نے اس فن پر کتاب لکھی یا وہ علل کے حافظ تھے۔ تاہم حاجی خلیفہ رحمہ اللہ نے "کتاب العلل" انھی کی طرف منسوب کی ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

"كتاب العلل لأبي زرعة عبد الرحمان بن عمرو الضبي"[2]

یہاں یہ بات یقیناً فائدے سے خالی نہ ہو گی کہ عبدالرحمن ابو زرعہ رحمہ اللہ کی نسبت میں اصحابِ تراجم نے اختلاف کیا ہے۔ حاجی خلیفہ رحمہ اللہ سے ہم نقل کر آئے

[1] تذكرة الحفاظ (١٢/٣)

[2] كشف الظنون (٤٤٠/٢)

ہیں و النصبی کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب التہذیب ابن العماد رحمہ اللہ نے شذرات الذہب، علامہ السمعانی نے الانساب اور حافظ ذہبی نے مشتبہ النسبۃ اور التذکرہ میں النصری ذکر کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ میں البصری نقل کیا ہے، غالباً البصری النصری سے تصحیف ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم

⑤ یعقوب بن شیبہ السدوسی البصری (م۲۶۲ھ/۸۷۵ء):

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح نخبۃ الفکر اور صبحی صالح نے ان کا نام یعقوب بن ابی شیبہ رحمہ اللہ لکھا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ شرح نخبۃ الفکر میں شاید کاتب سے سہو ہو گیا ہے، لیکن ڈاکٹر موصوف نے اسے جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اصحاب تراجم نے یعقوب بن شیبہ ہی لکھا ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"یعقوب بن شیبة السدوسي البصري الحافظ أحد الأعلام وصاحب المسند المعلل الذي ما صنف أحد أكبر منه ولم يتمه"[1]

علامہ الجزائری رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو دو سو جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

"إنه ألف مسندا معللًا غير أنه لم يتم ولو تم لكان في نحو مائتي مجلد والذي تم منه هو مسند العشرة والعباس وابن مسعود و عتبة بن غزوان والبعض الموالي وعمار"[2]

---

[1] عبر في خبر من غبر (۲/۲۵) شذرات الذهب (۲/۱٤۷)

[2] توجيه النظر (ص: ۳۲٦)

علامہ عراقی رحمہ اللہ نے بھی شرح الفیہ میں اس کی اہمیت کو سراہا ہے اور الا زہری سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض شیوخ سے سنا کہ یعقوب بن شیبہ کی ایک جلد جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسند روایات مروی ہیں وہ ایک سو اجزاء پر مشتمل ہے۔ [1] جس سے ان کی کتاب کی جامعیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ (م ۲۷۷ھ):

ان کا نام محمد بن ادریس ہے، مشہور حفاظِ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أحد أئمة الحفاظ الأثبات العارفين بعلل الحديث والجرح والتعديل" [2]

(۷) امام عبدالرحمان بن ابی حاتم رحمہ اللہ (م ۳۲۷ھ):

یہ امام ابو حاتم مذکور کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"له كتاب العلل المصنفة المرتبة على أبواب الفقه" [3]

بعض اہلِ علم نے تو ان کی کتاب کو حسنِ ترتیب کے اعتبار سے "العلل للدارقطني" پر ترجیح دی ہے۔ چنانچہ علامہ الجزائری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كتاب العلل للحافظ أبي الحسن على بن عمر الدارقطني خمس مجلدات وسطىٰ اطلعت عليه فرأيته

---

[1] فتح المغيث للعراقي (۹٦/۳)

[2] البداية (۵۹/۱۱)

[3] البدايه (۱۹۱/۱۱)

جم الفوائد إلا أن كتاب العلل لابن أبي حاتم أحسن ترتيباً وأقرب لاستفادة الناس منه"[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی یہ کتاب دو جلدوں میں نو سو (۹۰۰) سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ فاضل محمد نصیف رئیس جدہ کی کوشش سے مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ اگر اس کا تفصیلی انڈکس ہوتا تو افادیت کو مزید چار چاند لگ جاتے۔ حافظ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس میں تین ہزار معلول احادیث ذکر کی ہیں جو دراصل ان اسئلہ واجوبہ پر موقوف ہیں، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے والدِ محترم اور امام ابو زرعہ الرازی رحمہما اللہ سے کیے تھے۔

علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حافظ ابن عبدالهادی رحمہ اللہ نے اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی، لیکن وہ اسے مکمل نہیں کر سکے۔ اس کا ایک جز طبع ہوا ہے۔[2]

⑧ امام مسلم رحمہ اللہ بن حجاج القشیری (م ۲۶۱ھ):

امام بخاری رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد اور "الصحیح" کے مصنف ہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس فن پر سب سے پہلے انھوں ہی نے کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ محب الدین الخطیب کتاب العلل لابن ابی حاتم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"أول من صنف فيه ما نعلم الإمام مسلم بن حجاج القشيري صاحب الجامع الصحيح"[3]

لیکن ان کا یہ خیال محلِ نظر ہے۔

---

[1] مقدمہ کتاب العلل لابن أبي حاتم (ص:۱)

[2] الرسالة المستطرفه (ص:۱۲۲)

[3] مقدمہ کتاب العلل (ص:۱)

⑨ امام ابوعیسیٰ رحمہ اللہ الترمذی (م ۲۷۹ھ):

امام ابوعیسیٰ ترمذی کی العلل میں دو کتابیں ہیں۔ ایک ''العلل الصغیر'' جو جامع ترمذی کے آخر میں ملحق ہے اور دوسری ''العلل الکبیر''۔

محدث مبارکپوری فرماتے ہیں:

''فيه معظم النقل عن شيخه البخاري''[1]

متاخرین میں حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ (م ۷۹۵ھ) نے العلل الصغیر کی شرح لکھی ہے، جس کے متعلق علامہ کوثری رحمہ اللہ کا خیال ہے:

''غزير العلم جليل الفوائد جم النقول الشاردة لا يستغني عنه من يعني بالعلل ومصطلح الحديث''[2]

⑩ حافظ زکریا رحمہ اللہ بن یحییٰ البصری الساجی (م ۳۰۷ھ):

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب ''العلل'' کا تذکرہ ان الفاظ سے کیا ہے:

''له كتاب جليل في علل الحديث يدل على تبحره في هذ الفن''[3]

⑪ ابوبکر الاثرم رحمہ اللہ:

ان کا نام احمد بن محمد بن ہانی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''له كتاب في العلل''[4]

---

[1] تحفة الأحوذي

[2] تعليق لحظ الألحاظ (ص: ١٨٢)

[3] تذكرة الحفاظ (٢/٢٥٠) الرسالة (ص: ١٢٢)

[4] تذكرة الحفاظ (٢/١٣٥)

⑫ ابو علی رحمہ اللہ بن حسین بن علی النیسابوری (م ۳۴۹ھ):

علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔

⑬ حافظ ابو بکر رحمہ اللہ احمد بن محمد الخلال (م ۳۱۱ھ):

حنبلی مسلک رکھتے تھے، بلکہ فقہ حنبلی کو مرتب کرنے میں ان کا بڑا عمل دخل ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مؤلف علم أحمد وجامعه ومرتبه"

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب العلل کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

"صنف كتاب العلل في عدة مجلدات"[1]

⑭ ابو عبداللہ رحمہ اللہ محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوری (م ۴۰۵ھ):

ان کا مختصر تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔

⑮ عمرو رحمہ اللہ بن علی الفلاس (م ۲۴۹ھ):

یہ امام ابو زرعہ رحمہ اللہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ کے استاد ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وقد صنف المسند والعلل والتاريخ"[2]

⑯ ابو علی حسن رحمہ اللہ بن محمد الزجانی:

ان کی کتاب کا ذکر حاجی خلیفہ نے کیا ہے۔[3]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ (۷/۳) الرسالہ (ص: ۱۲۲)

[2] تہذیب التہذیب (۸۱/۸)

[3] کشف الظنون (۱۱۲۰/۲)

(۸) ابو جعفر محمد رحمہ اللہ بن عبداللہ بن عمار الموصلی (م ۲۴۲ھ):

نے بھی العلل پر ایک کتاب لکھی ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا بیان ہے:

"له كتاب كبير في الرجال والعلل"

یزید الازدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "الموصلی" کو حدیث وعلل کا فہم حاصل تھا۔ [1]

(۹) عبداللہ رحمہ اللہ بن ابو علی البلخی (م ۲۹۴ھ):

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے:

"وصنف كتاب العلل وكتاب التاريخ" [2]

متقدمین میں سے جن اہلِ علم وفضل نے العلل جیسے مشکل وادق فن پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے اکثر کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ ان کے علاوہ متاخرین نے بھی اس فن پر طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ کی کتاب کا نام "العلل المتناهية في الأحاديث الواهية" ہے، لیکن اس میں انھوں نے جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں، جیسا کہ علامہ الکتانی نے لکھا ہے۔ [3]

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب کا نام "الزهر المطلول في الخبر المعلول" ہے۔

علل حدیث میں "العلل" للدارقطنی کی اہمیت:

العلل کے موضوع پر اگرچہ متعدد اہلِ علم نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان تمام

---

(1) تذکرة الحفاظ (۲/۷۱)

(2) أيضاً (۲/۲۳۳)

(3) الرسالة (ص: ۱۲۲)

میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی علل بمنزلہ آفتاب ہے۔ علامہ بلقینی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ علل میں بن مدینی، ابن ابی حاتم اور الخلال رحمہم اللہ نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان تمام سے جامع کتاب امام دارقطنی کی کتاب ہے۔[1]

امام حمیدی الاندلسی رحمہ اللہ (م ۴۸۸ھ) صاحب "الجمع بین الصحیحین" فرماتے ہیں:

"علم حدیث کے طالب علموں کو تین فنون پر بالخصوص مہارت حاصل ہونی چاہیے: ① العلل۔ اس فن پر سب سے بہترین کتاب امام دارقطنی رحمہ اللہ کی ہے۔ ② المؤتلف والمختلف۔ اس میں سب سے بہترین کتاب امیر ابن ماکولا کی ہے۔ ③ شیوخ کی وفات کا علم۔ لیکن اس پر کوئی جامع کتاب نہیں۔ میرا اپنا ارادہ ہے کہ اس فن پر ایک جامع کتاب لکھوں گا۔ امیر ابن ماکولا نے مجھے کہا ہے کہ اس کی ترتیب سنین اور حروف تہجی کے مطابق رکھنا۔"

ابن طرخان رحمہ اللہ جو امام حمیدی رحمہ اللہ کے تلامذہ سے ہیں، فرماتے ہیں:

"امام حمیدی "الجمع بین الصحیحین" میں اس قدر مشغول ہوئے کہ وہ اس فن پر کچھ لکھ نہ سکے۔"

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس قصے کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"میں نے امیر ابن ماکولا کے اس اشارے کو قبول کیا اور اسی ترتیب سے تاریخ اسلام کو مرتب کیا۔"[2]

---

[1] تدریب الراوي (ص: ۱٦۷)

[2] تذكرة الحفاظ (٤/ ١٩)، الرسالة (ص: ۱۷۲)، تدريب الراوي (ص: ٥٠٥)، الإعلان بالتوبيخ (ص: ۳۳٥)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

"إن شئت أن تبين براعة هذا الإمام فطالع العلل له فإنك تندهش ويطول تعجبك"①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقد جمع أزمّة ما ذكرناه كله الحافظ الكبير أبو الحسن الدارقطني في كتابه في ذلك وهو من أجل كتاب بل أجل ما رأيناه وضع في هذا الفن لم يسبق إلى مثله وقد أعجز من يريد أن يأتي بعده فرحمه الله وأكرم مثواه"②

الدکتور صبحی صالح فرماتے ہیں:

"إن لأبي الحسن الدارقطني كتاباً جليلًا في هذا الباب وأعجز به من يريد أن يأتي بعده"③

یعنی اس فن پر امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کتاب جلیل القدر ہے اور ان کے بعد جو بھی اس فن پر لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ جس سے اس کی جامعیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محدثین نے حدیث کے طالب علم کے آداب میں شمار کیا ہے کہ وہ امام احمد رحمہ اللہ اور امام دارقطنی رحمہ اللہ کی علل پر حاوی ہو۔④

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی یہ کتاب علامہ الکتانی رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق بارہ

① تذكرة (١٨٩/٣)

② الباعث الحثيث (ص: ٧٣)

③ علوم الحديث (ص: ١٨٧)

④ تدريب الراوي (ص: ٣٥٢)

جلدوں پر مشتمل ہے۔[1] لیکن زرکلی کا خیال ہے کہ یہ تین جلدوں میں ہے۔[2] علامہ الجزائری کا قول ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ پانچ مبسوط جلدوں میں ہے۔

بہر حال یہ کتاب اس فن پر اپنی نظیر آپ ہے اور یہ اختلاف جلدوں کے چھوٹی بڑی ہونے پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے اس کا اختصار بھی کیا ہے، جس کا نام "بلوغ الأمل" ہے۔[3] امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کتاب کا مکمل نام "العلل الواردة في الأحاديث النبوية" ہے جو دارالکتب المصریہ قسم حدیث (۳۹۴) میں موجود ہے، لیکن اس کے چند اوراق دیمک خوردہ ہیں۔[4]

محدث مبارک پوری نور اللہ مرقدہ نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس کا ایک کامل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[5]

ہندوستان میں اس کا ایک ناقص نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے: ثانی، ثالث، خامس۔ ثانی کا نسخہ قدیم سن کتابت تقریباً ۸۰۰ھ اور خطِ نسخ ہے، جو ۳۴۰ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۳۵ سطریں ہیں۔ جزو ثالث کا سن کتابت تقریباً ۱۳۰۹ھ ہے، خطِ نسخ ہے۔ اس میں ۳۶۰ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔ جزو خامس کا سنِ کتابت تقریبا وہی ہے جو ثالث کا ہے، اس میں ۲۶۶ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔[6]

---

(1) الرسالة (ص: ۱۲۲) حاشيه تدريب الراوي (ص: ۳۵۲)

(2) الأعلام (۱۳/۵)

(3) إيضاح المكنون

(4) فہرست دارالكتب المصريه (۱۳۱/۱)

(5) مقدمه تحفة الأحوذي (ص: ۱۶۶)

(6) مجلہ "برہان" دسمبر ۱۹۵۰ء

جناب سیدی و مرشدی مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف مدظلہ العالی سے پتا چلا ہے کہ ''العلل'' کا ایک ناقص نسخہ جناب پیر محب اللہ شاہ صاحب پیر جھنڈا درگاہ شریف حیدر آباد سندھ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اب یہ عظیم کتاب ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس میں (۴۱۲۸) احادیث پر بحث ہے۔

اس وقت العلل للدارقطنی کا جو نسخہ موجود ہے وہ ان کے شاگرد رشید ابوبکر برقانی کا جمع کردہ ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ اپنے حفظ سے املا کرواتے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ برقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو منصور بن الکرخی رحمہ اللہ کا ارادہ تھا کہ وہ معلل احادیث پر مشتمل ایک مسند لکھیں۔ وہ اپنی بیاض امام دارقطنی رحمہ اللہ کو دیتے تو وہ معلل احادیث کی نشاندہی کر دیتے۔ پھر ابو منصور رحمہ اللہ وہ بیاض کاتبوں کے حوالے کر دیتے تو وہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی نشان زدہ احادیث کو علاحدہ لکھ دیتے اور جب وہ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے اس پر تعلیق کا ارادہ کرتے تو امام موصوف ایک دفعہ اس مسودے کو دیکھ لیتے اور حافظہ سے ان احادیث کی علل کا ذکر کرتے جاتے اور وہ لکھتے جاتے۔ جب ابو منصور رحمہ اللہ فوت ہو گئے اور وہ اسے مرتب نہ کر سکے، البتہ وہ کاغذات ویسے ہی محفوظ تھے۔ میں نے دو سال بعد امام دارقطنی رحمہ اللہ سے اجازت چاہی کہ مجھے ان اوراق کو جمع کرنے اور مستقل ترتیب دینے کی اجازت ہے؟ تو انھوں نے اسے قبول فرمایا پھر میں نے اس کی قراءت بھی ان پر کی اور اس کے بعد لوگوں نے اسے میری سند سے نقل کر لیا۔[1]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر البرقانی سے پوچھا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے العلل زبانی لکھوائی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ہاں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ

[1] تاریخ بغداد (۱۲/۳۷، ۳۸)

فرماتے ہیں: یہ بہت بڑی بات ہے، اس سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ دنیا میں سب سے بڑے حافظ تھے: "أحفظ أهل الدنيا"[1]

(۳)، (۴) کتاب الالزامات والتتبع:

علامہ نووی رحمہ اللہ اور بعض دوسرے علما نے اس کا ذکر "الاستدراك والتتبع" کے نام سے کیا ہے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی کتاب ہے، لیکن بعض اہلِ علم نے اسے دو علاحدہ تصانیف قرار دیا ہے۔ جس کا سبب شاید نسخوں کے اختلاف پر موقوف ہے، کیوں کہ بعض نسخوں میں تو کتاب التتبع کو علاحدہ ذکر کیا گیا ہے اور بعض میں اسے الزامات کے ساتھ ہی ملا دیا ہے۔ چنانچہ کتاب "الإلزامات والتتبع" کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں کتاب التتبع کے ابتدا میں لکھا ہے:

"هذا الكتاب في بعض النسخ يوجد منفرداً مترجماً عنه بهذه الترجمة و في النسخة المسموعة على السلفي مضموم مع الإلزامات التي قبله في جزء واحد، ذكر الإلزامات أولاً ثم ذكر هذا بعدها على سياقه من غير أفراد بترجمة. انتهى"

یہی نہیں بلکہ حافظ ابو بکر رحمہ اللہ محمد بن خیر الاموی الاشبیلی نے "فهرست ما رواه عن شيوخه من الدواوين المصنفة في ضروب العلم وأنواع المعارف" میں انھیں دو علاحدہ کتابیں شمار کیا ہے اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ والله أعلم

علامہ الکتانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کتاب الالزامات میں انھوں نے ایسی روایات کو جمع کیا ہے جو صحیح

[1] السير (١٦/٤٥٥)

بخاری و مسلم کی شرط پر ہیں، لیکن صحیحین میں وہ مذکور نہیں۔"[1]

ان احادیث کی تعداد ستر (۷۰) ہے۔ لیکن یہ الزامات و استدراکات اس لیے محل غور نہیں کہ شیخین نے تمام صحیح احادیث کا استیعاب نہیں کیا۔"

رہی "کتاب التتبع" تو اس میں صحیحین کی ان روایات کو جمع کیا ہے، جس میں ان کے نزدیک کسی قسم کی علت پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں بعض ایسی روایات کو ذکر کیا ہے، جن میں فی الجملہ کوئی علت ہوتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ علت علتِ قادحہ بھی ہو۔ چنانچہ وہ کتاب مذکور کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"ذكر أحاديث معلولة اشتمل عليها كتاب البخاري و مسلم أو أحدهما بينت عللها والصواب منها"

اسی حوالے سے ہم چند مثالیں ذکر کرنے پر یہاں اکتفا کرتے ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کتاب التتبع میں مسند عمر رضی اللہ عنہ کے تحت فرماتے ہیں:

"واتفقا على إخراج حديث أبي عثمان: كتب إلينا عمر في الحرير إلا موضع أصبعين وهذا لم يسمعه أبو عثمان وهو كاتبه وهو حجة في قبول الإجازة"

امام موصوف رحمہ اللہ نے یہاں جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح بخاری میں "كتاب اللباس باب لبس الحرير الخ" کے تحت اس سند سے مذکور ہے۔

"حدثنا آدم حدثنا شعبة حدثنا قتادة قال: سمعت أبا عثمان النهدي أتانا كتاب عمرو نحن مع عتبة بن فرقد الخ"

تو اس روایت کو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کتاب التتبع میں ذکر کرتے ہوئے کہا

[1] الرسالة المستطرفة (ص:۲۱)

ہے کہ ابو عثمان کا سماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اجازہ میں یہ روایت حجت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اسی روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"قد نبه الدارقطني على أن هذا الحديث أصل في جواز الرواية بالكتابة عند الشيخين قال ذلك بعد أن استدركه عليهما و في ذلك رجوع منه عن الاستدراك عليه، والله أعلم[1] انتهىٰ.

بالکل اسی نوعیت کی ایک روایت "أبو النضر مولىٰ عمر قال: كتب إليه ابن أبي أوفى" کی ہے جس کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"هو صحيح حجة في جواز الإجازة والمكاتبة"

اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ کتاب التتبع میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کا مقصود محض معلول روایات کو جمع کرنا نہیں، ورنہ ان روایات کو ذکر کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح صحیح مسلم میں حدیثِ طاعون کے بارے میں راویوں کے اختلاف کا امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ذکر کر کے فرمایا ہے کہ اس اختلاف کے باوصف یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث حضرت عبدالرحمان بن عوف کی مسند میں ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید امام دارقطنی رحمہ اللہ کی "کتاب العلل" سے بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں انھوں نے کئی ایک ایسی روایات کو صحیح کہا ہے جنھیں فی الجملہ کتاب التتبع میں ذکر کیا ہے۔

محترم مولانا فیض الرحمان الثوری (رحمہ اللہ) سے جب اس سلسلے میں میری گفتگو

---

[1] فتح الباري (٢٣٤/١)

ہوئی تو انھوں نے میرے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کتاب العلل سے متعدد امثلہ لکھ بھیجیں، جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ یہاں ضروری ہے کہ ناظرین بھی اس کی چند امثلہ ملاحظہ فرمالیں:

① ''کتاب التتبع'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

''و أخرج مسلم حديث الزهري عن أبي الطفيل عن عمر أن النبي ﷺ قال: إن الله يرفع بالقرآن أقواماً وقد خالفه حبيب عن أبي الطفيل عن عمر قوله''

صحیح مسلم کی یہ روایت کتاب فضائل القرآن (۲۷۲/۱) میں ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس کلام سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہاں صحیح مسلم کی مرفوع روایت پر تنقید کی ہے، حالانکہ جب ہم ان کی کتاب العلل کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح مسلم کی اسی مرفوع روایت ہی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''حديث الزهري هو الصواب''

''زہری رحمہ اللہ نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔''

② اسی طرح صحیحین کی ایک روایت جو بطریق ''عمرو عن طاؤس عن ابن عباس عن عمر'' متصل مروی ہے۔[1] اس کے متعلق کتاب التتبع میں فرماتے ہیں:

''وأرسله حماد بن زيد عن عمرو عن طاؤس عن عمر كذلك قال الوليد عن حنظلة عن طاؤس عن عمر'' والله أعلم

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف یہاں اس متصل روایت پر تنقید کر

---

[1] صحيح البخاري (۲۹٦/۱) مسلم (۲۳/۲)

رہے ہیں“ حالانکہ کتاب العلل میں متصل روایت ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

”قول روح بن القاسم و ابن عيينة هو الصواب لأنهما حافظان ثقتان“

”روح اور ابن عیینہ نے عمرو سے جو اسے متصل ذکر کیا ہے تو یہ متصل روایت ہی صحیح ہے۔“

ہم یہاں دو امثلہ کے ذکر کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ اس کی متعدد امثلہ مولانا فیض الرحمان الثوری نے ہمیں لکھ بھیجی تھیں۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔ جس سے گویا یہ بات صاف ہوگئی کہ ”کتاب التتبع“ محض معلول روایات کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ ایسی روایات کو بھی لائے ہیں جو بظاہر معلول نظر آتی ہیں، حالانکہ وہ حقیقتاً معلول نہیں ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

کتاب الالزامات کی طرح کتاب التتبع میں بعض روایات کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اسے امام مسلم رحمہ اللہ لائے ہیں مگر امام بخاری رحمہ اللہ نہیں لائے یا امام بخاری یہ روایت لائے ہیں، امام مسلم نہیں لائے، حالانکہ یہ اعتراض ہی درست نہیں کیونکہ شیخین نے تمام صحیح احادیث جمع کرنے کا اہتمام ہی نہیں کیا۔

کتاب التتبع کو گو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے مسانید کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اس کا التزام صحیح نہیں ہو سکا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق جن احادیث پر امام دارقطنی رحمہ اللہ نے تنقید کی ہے ان کی تعداد دو سو (۲۰۰) ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی تعداد ۱۸۸ بیان کی ہے، جن میں سے ۱۱۰ احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ہیں۔[1] ممکن

[1] مقدمه فتح الباري (ص: ٣٤٦)

ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اکثریت کا لحاظ رکھتے ہوئے دوسو کی تعداد کا ذکر کیا ہو۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اعتراضات متعدد نوعیت کے ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر درج ذیل ہے:

① بسا اوقات انھوں نے ایسی احادیث پر تنقید کی ہے، جن میں بعض راوی اپنے دوسرے ساتھی سے اسناد میں زیادہ ذکر کرتے ہیں اور بعض کم ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الجہاد (۴۳۴/۱) اور امام مسلم رحمہ اللہ نے (۲۴۰/۱، ط پاکستان) ایک حدیث ابن جریج رحمہ اللہ کے واسطہ سے اس سند سے نقل کی ہے:

"ابن جريج عن الزهري عن عبد الرحمٰن بن عبد الله عن أبيه وعمه عبيد الله بن كعب عن كعب أن رسول الله ﷺ الخ"

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سند میں ابن جریج نے زہری اور کعب کے درمیان عبدالرحمان عن ابیہ اور عبیداللہ بن کعب کا واسطہ ذکر کیا ہے لیکن معمر رحمہ اللہ اور عقیل رحمہ اللہ امام زہری رحمہ اللہ سے عبداللہ بن کعب عن ابیہ کا واسطہ ہی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی عبیداللہ کا ذکر نہیں کرتے۔

② بعض روایات اس قسم کی ہیں کہ جنھیں بعض ثقات نے زیادتی متن سے بیان کیا ہے۔ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب العتق (۳۴۳/۱) میں قتادہ کے واسطہ سے ایک حدیث کی سند یوں بیان کی ہے:

"قتادة عن النضر بن أنس عن بشير بن نهيك عن أبي هريرة من أعتق" الحديث

امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اسی سند سے اس روایت کو صحیح (۴۹۱/۱) میں نقل کیا

ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن ابی عروبہ اور جریر بن حازم تو اس روایت میں الاستسعاء کا لفظ قتادہ سے ذکر کرتے ہیں، لیکن شعبہ اور ہشام نے قتادہ رحمہ اللہ سے یہ لفظ ذکر نہیں کیا۔

الغرض اس قسم کی متعدد وجوہ کی بنا پر انھوں نے صحیحین کی روایات پر تنقید کی ہے، جنھیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "هدي الساري" میں ذکر کیا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے "مقدمہ شرح بخاری" میں لکھا ہے کہ یہ تمام کے تمام اعتراضات بعض محدثین کے قواعد ضعیفہ پر مشتمل ہیں، جو کہ جمہور ائمۂ اصول کے خلاف ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"هذا الاستدراك مبني على قواعد بعض المحدثين ضعيفة جداً مخالفة لما عليه الجمهور من أهل الفقه والأصول وغيرهم فلا يعتبر به"①

مقدمہ "المنہاج" میں کہا ہے کہ ان تمام یا اکثر روایات کا جواب علما نے دیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مقدمہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اعتراضات بالکلیہ قواعد ضعیفہ پر مشتمل نہیں بلکہ بعض ایسے اعتراضات بھی ہیں، جن کا تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکا۔②

کتاب الالزامات والتتبع اس وقت ہمارے سامنے ہے جسے سرسری نظر دیکھنے سے ہمیں صحیح مسلم کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جس کی ایک دو امثلہ ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

① صحیح مسلم "باب ما يفعل بالهدي إذا عطب في الطريق" میں حضرت

① مقدمة التعليق المغني (ص: ٤)

② هدي الساري (ص: ٤٠٠)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت اس سند سے مذکور ہے۔

"حدثنا سعيد عن قتادة عن سنان بن سلمة عن ابن عباس"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ اس روایت پر تعاقب کرتے ہوئے کتاب الالزامات میں لکھتے ہیں:

"اس روایت کو بخاری رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کیا، نیز سنان رحمہ اللہ سے روایت کرنے میں قتادہ منفرد ہیں۔ مزید یہ کہ قتادہ رحمہ اللہ کا سنان رحمہ اللہ سے سماع بھی ثابت نہیں۔"[2]

اسی طرح علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے "تخریج ہدایہ" میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔

"سمعت يحيٰى بن معين يقول: قتادة لم يدرك سنان بن سلمة ولم يسمع منه شيئًا"[3]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا یہ اعتراض جہاں "قواعد قویہ" کے مطابق ہے وہاں اس قدر وزنی ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا اور زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس حدیث کی اور اسناد بھی ذکر کی ہیں اور اسے متابعتاً لائے ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

۲) اسی طرح "باب ما كان من النهي من أكل لحوم الأضاحي" میں پہلی روایت کی سند یوں ہے۔

"حدثنا عبد الجبار بن العلاء قال نا سفيان قال نا الزهري

[1] صحيح مسلم (۴۲۷/۱)

[2] كتاب الالزامات (ص: ۴)

[3] نصب الرایہ (۱۶۲/۳) نیز دیکھیے: "تهذيب" (۲۴۱/۴)

...ن أبي عبيد قال شهدت العيد مع علي بن أبي طالب"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے یہ روایت گو متناً صحیح ہے، لیکن بواسطہ سفیان بن عیینہ اس کا مرفوع ہونا محلِ نظر ہے۔ کیوں کہ یہ عبدالجبار کا وہم ہے۔ اور اس کے دوسرے ساتھی حمیدی، علی بن مدینی، القعنبی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابن ابی شیبہ، ابن ابی عمرو، قتیبہ، ابو عبید رحمہم اللہ اور دیگر محدثین نے اسے ابن عیینہ رحمہ اللہ سے موقوف ذکر کیا ہے، نیز فرماتے ہیں:

"واحتمل أن يكون خفي على مسلم أن ابن عيينة يرويه موقوفا لأنه لعله لم يقع عنده إلا من رواية عبد الجبار"[2]

یعنی امام مسلم رحمہ اللہ کو شاید یہ روایت ابن عیینہ کے واسطہ سے عبدالجبار رحمہ اللہ سے ہی پہنچی ہے، جسے مرفوع ذکر کرنے میں ان سے غلطی ہو گئی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ نفس الامر میں صحیح مسلم کی اس سند پر یہ اعتراض صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے بھی اس اعتراض کو ذکر کر کے سکوت اختیار کیا ہے۔ گو متن کے اعتبار سے یہ صحیح ہے جیسا کہ خود امام دارقطنی رحمہ اللہ نے صراحت کر دی ہے۔

الغرض امام نووی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے تمام اعتراضات بعض محدثین کے قواعد ضعیفہ پر مشتمل ہیں درست معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ہی کی رائے ہمیں صائب نظر آتی ہے۔ واللہ أعلم

کتاب التتبع اور صحیح بخاری:

علمائے محققین کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح

---

[1] صحیح مسلم (۲/۱۵۷)

[2] کتاب التتبع (ورق: ۳۲)

بخاری ہی کا نام اولیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کلام اللہ کے بعد اس کتاب کے ساتھ علمائے امت نے جس قدر بحث و تمحیص اور اس کی تشریح و توضیح سے کام لیا۔ اس قدر کسی دوسری کتاب کی خدمت نہیں کی گئی۔ ہر صاحب نے اپنے ذوقِ سلیم کے مطابق اسے موضوعِ سخن بنایا۔ اگر کسی نے لغت پر بحث کی تو دوسرے نے الفاظ کے اعراب وغیرہ پر خامہ فرسائی کی۔ کسی نے تراجمِ ابواب اور استنباطِ مسائل کو عنوان بنایا۔ تو کسی نے رجال کو موضوعِ بحث بنایا۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں تقریباً ۸۲ شروح کا ذکر کیا ہے۔ الغرض صحیح بخاری کے ہر ہر لفظ و نقطہ پر بحث کی گئی اور اس کا کوئی گوشہ بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

ان ہی میں سے بعض علمائے ربانیین ایسے بھی ہو گزرے ہیں، جنھوں نے صحیح بخاری کے اوہام وعلل کے اظہار کو موضوعِ بحث بنایا، چنانچہ ابو مسعود الدمشقی (م ۴۰۱ھ) نے صحیحین پر استدراک لکھا، اسی طرح ابو علی الغسانی الجیانی نے اپنی تصنیف تقیید مہمل میں اس کے مہمل اور مشکل راویوں کو موضوعِ سخن بنایا۔ علامہ عبدالرحمان بن سراج الدین عمر علی بلقینی (م ۸۲۴ھ) نے "الإفهام بما وقع في البخاري من الإبهام" لکھی۔ ضبطِ اسماء پر علامہ عبدالغنی رحمہ اللہ بن احمد البحرانی الشافعی نے "قرة العين في ضبط أسماء رجال الصحيحين" لکھی، بلکہ بعض نے توصحیحین سے صحابہ اور تابعین تک کو مستقل تصانیف میں جمع کیا۔

لیکن ہم یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ابو مسعود الدمشقی رحمہ اللہ اور ابو علی جیانی رحمہ اللہ وغیرہ کے اعتراضات میں وہ جان نہیں، جو امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اعتراضات میں ہے، جیسا کہ ہدی الساری کے اس باب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان تمام کا جواب دیا ہے، جس کا مطالعہ صاحب ذوق

کے لیے بڑا مفید ہے۔ البتہ ان کے ان الزامات و استدراک کے متعلق علما کی جو آرا ہیں ان کا ذکر نہایت ضروری ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ثم إن الدارقطني تتبع على البخاري في أزيد من مائة مواضع ولم يستطع أن يتكلم إلا في الأسانيد بالوصل والإرسال غير موضوع واحد وهو: إذا جاء أحدكم والإمام يخطب فليصل ركعتين وليتجوز فيهما، فإنه تكلم فيه مما يتعلق بحال المتن و وجهه أن الدارقطني يمشي على القواعد الممهدة عندهم فينازعه من القواعد وشأن البخاري أرفع من ذلك فإنه يمشي على اجتهاده وينظر إلى خصوص المقام وشهادة الوجدان وإنما القواعد لغير الممارس على حد التحديد للعوام فيما لا يرد به التحديد من الشارع و رتبتها أعلى من الكل بعد اختلاف يسير بينهما" [1]

یعنی "امام دارقطنی رحمہ اللہ نے گو سو (۱۰۰) سے زائد احادیث پر تعاقب کیا ہے، مگر بجز ایک کے سب کا تعلق اسناد سے ہے وہ حدیث یہ ہے: "إذا جاء أحدكم والإمام يخطب" اس کی وجہ یہ ہے کہ دارقطنی رحمہ اللہ محدثین کے قواعد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کلام کرتے ہیں، مگر بخاری کی شان اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ اپنی بصیرت و اجتہاد کو دلیلِ راہ بناتے ہیں۔ قواعد تو عوام کی خاطر غیر محدود کو محدود کرنے کے لیے ہوتے ہیں

[1] مقدمه فيض الباري (ص: ٧٥)

اور بخاری و مسلم کا مرتبہ ان سے کہیں اونچا ہے، اگرچہ دونوں میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔''

بایں ہمہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس نقد کا اثر صحیح بخاری پر یہ ہوا کہ وہ روایت مقطوع بالصحۃ نہ رہیں اور نہ ہی ان روایات سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ جب تلقی بالقبول پر اجماع نہ رہا تو وہ مقطوع بالصحۃ بھی نہ رہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمہ فتح الباری اور امام نووی رحمہ اللہ نے ''تقریب'' میں صراحت کی ہے۔ حضرت نواب صدیق حسن خان قنوجی فرماتے ہیں:

''ابن الصلاح نے کہا ہے کہ بخاری و مسلم میں جس قدر مسند احادیث ہیں ان سے علم یقینی نظری حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ معصوم (اجماع) سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان سے پہلے محمد بن طاہر مقدسی رحمہ اللہ اور ابو نصر عبدالرحیم رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل تھے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اہلِ حدیث اور بہت سے شوافع و حنابلہ اور احناف کا یہی مسلک نقل کیا ہے، لیکن نووی نے کہا ہے کہ ابن الصلاح رحمہ اللہ کے اس اصول سے محققین اور اکثر علما نے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غیر متواتر احادیث سے ظن ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ قول زین الدین کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن الصلاح نے ان احادیث کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، جن پر بعض اہلِ نقد جیسے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کلام کیا ہے۔'' (1)

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

(1) مسك الختام شرح بلوغ المرام

"امت نے چونکہ بخاری و مسلم دونوں کتابوں کو قبول کیا ہے، اس لیے وہ روایات جو صرف بخاری یا صرف مسلم میں ہیں وہ بھی قطعی طور پر صحیح ہوں گی۔ سوائے ان چند روایات کے جن پر دارقطنی رحمہ اللہ نے اور ان جیسے دوسرے حفاظ نے کلام کیا ہے۔"[1]

رہے وہ اعتراضات تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "ہدی الساری" اور فتح الباری میں ان کا جواب دیا ہے، جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

کتاب الالزامات والتتبع کا ایک نسخہ صوبہ بہار میں مکتبہ علم و حکمت میں ہے اور اس کا ایک نسخہ محترم مولانا فیض الرحمان الثوری (مدرس چنی گوٹھ بہاولپور) کے پاس بھی ہے۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ مولانا موصوف کو جنھوں نے اپنا قیمتی نسخہ مجھے عنایت فرمایا اور میں نے بھی اسے نقل کر لیا۔ سندھ حیدر آباد میں حضرت مولانا وہب اللہ شاہ راشدی اور حضرت مولانا سید محب اللہ دامت برکاتہم کے مکتبہ میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے۔

کتاب الالزامات کے راوی ابو طالب رحمہ اللہ محمد بن علی بن الفتح الحربی الزاہد ہیں۔ علامہ ابن خیر رحمہ اللہ نے اپنی فہرست میں اس کا راوی ابو ذر رحمہ اللہ عبد بن احمد الہروی م ۴۳۴ھ ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی تخریج بھی کی ہے جو چار اجزا کو محیط ہے۔ کتاب التتبع کے راوی بھی ابو طالب رحمہ اللہ حربی ہیں۔ البتہ ابن خیر رحمہ اللہ نے اس کا راوی ابو بکر احمد بن محمد بن غالب الخوارزمی المعروف بالبرقانی ذکر کیا ہے۔ مولانا فیض الرحمان صاحب نے کتاب الالزامات والتتبع دونوں کی تخریج کر دی ہے۔ البتہ الالزامات کے بعض مقامات کی تخریج باقی ہے۔ یہ کتاب شیخ مقبل

[1] مقدمہ ابن الصلاح

بن ہادی الوادعی رحمہ اللہ کی تحقیق سے شائع ہوگئی ہے۔ والحمد للہ علی ذلك

تنبیہ:

علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے مذکورۃ الصدر عبارت میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح بخاری ”کتاب التہجد، باب ما جاء في التطوع“ (۱/۱۵۶) اور صحیح مسلم (۱/۲۸۷) میں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمہ فتح الباری میں بھی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے اس الزام کو متن کی مثال کے ضمن میں پیش کیا ہے، لیکن ہم اس بات سے اس حد تک تو متفق ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے جو کلام کیا ہے وہ فی الاصل متن سے متعلق ہے۔ رہا یہ پہلو کہ فی الواقع کیا انھوں نے اس پر کلام کیا ہے تو یہ پہلو محل نظر ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے جو اس روایت پر بحث کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

”أخرجا جميعا عنه (أي جابر) حديث شعبة عن عمرو عن جابر، إذا جاء أحدكم والإمام يخطب، قال: تابعه روح بن القاسم، ابن بزيع عنه، رواه ابن جريج وحماد بن زيد و ابن عيينة وأيوب وحبيب بن يحيىٰ و ورقاء عن عمرو أن رجلا دخل المسجد فقال له: أصليت“

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ”ہدی الساری“ (ص: ۳۵۵) میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ”امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ابن جریج وغیرہ نے اس روایت کو مرسل ذکر کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ حماد بن زید، سفیان بن عیینہ، ایوب اور ابن جریج رحمہم اللہ اسے موصول بھی ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شعبہ رحمہ اللہ نے ابن جریج رحمہ اللہ وغیرہ کی مخالفت کی ہے، کیونکہ اس کی روایت عموم کو متقاضی ہے کہ جو بھی مسجد میں آئے دو رکعت پڑھ کر

بیٹھے۔ اس کے برعکس اس کے دوسرے ساتھی اسے ایک قصہ کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا شعبہ رحمہ اللہ کی یہ روایت شاذ ہے، لیکن شعبہ رحمہ اللہ اس میں منفرد نہیں۔ روح بن قاسم رحمہ اللہ سے اس کی متابعت ثابت ہے، جسے دارقطنی رحمہ اللہ نے سنن میں ذکر کیا ہے۔"

لیکن امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کتاب الالزامات والتتبع کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس کی عبارت ہم ابھی نقل کر چکے ہیں کہ انھوں نے شعبہ رحمہ اللہ کی متابعت کا خود ذکر کیا ہے ممکن ہے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ ہو جس میں "تابعہ روح بن القاسم" کے الفاظ مذکور نہ ہوں یا کاتب سے سہو ہو گیا ہو۔ التتبع کے مطبوعہ نسخہ (ص: ۳۶۹) میں بھی اس متابعت کا ذکر ہے۔ واللہ أعلم

یہی نہیں بلکہ سنن دارقطنی (۱/۱۶۸) میں روح بن القاسم کے واسطہ سے جو روایت مذکور ہے اس میں روح نے نہ صرف متن میں شعبہ کی متابعت کی ہے، بلکہ اسے متصل بھی ذکر کیا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال ممکن ہے کہ اگر امام دارقطنی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ روایت معلول نہیں۔ شعبہ رحمہ اللہ کی متابعت کا ذکر انھوں نے خود کر دیا ہے تو اسے "کتاب التتبع" میں لائے کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ "کتاب التتبع" میں ان کا اسلوب یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس میں ایسی روایات بھی ذکر کی ہیں، جن میں فی الجملہ کوئی علت ہوتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ علت علتِ قادحہ بھی ہو۔ البتہ ایسی روایات کو ذکر کر کے کبھی خاموش گزر جاتے ہیں یا پھر کبھی اس کی صراحت بھی کر دیتے ہیں، جس کی چند امثلہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

⑤ كتاب الضعفاء والمتروكين من المحدثين:

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تذکرہ نویسوں نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ان کے شاگرد "حمزہ السہمی" نے ایک مرتبہ عرض کی کہ آپ ضعفا پر ایک کتاب لکھ دیں تو انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے پاس ابن عدی رحمہ اللہ کی کتاب "الکامل" نہیں؟ تو السہمی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ ہے، تو امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: "فيه كفاية لا يزيد ولا يزاد عليه"[1] جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاً وہ ضعفا پر مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو وہ مستقل کتابیں لکھ دیں، جن میں ایک "كتاب الضعفاء والمتروكين من المحدثين" کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا کامل نسخہ ابھی تک مخطوط ہے جو کہ استنبول کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔[2] یہ کتاب اب شیخ موفق بن عبداللہ کی تحقیق سے شائع ہوگئی ہے۔

⑥ الجرح والتعدیل:

اسماعیل پاشا نے ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تہذیب التہذیب" (۱۴/۲)، (۸۵/۴)، (۲۶۷، ۲۶۸/۵) میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

فن جرح وتعدیل اور امام دارقطنی رحمہ اللہ:

علم حدیث کے انواع واقسام میں علم الجرح والتعدیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ امام حاکم رحمہ اللہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

---

[1] كشف الظنون (۱۳۸۳/۲)

[2] دائرة المعارف الإسلاميه (۸۹/۹)

"هو ثمرة هذا العلم والمرقاة الكبيرة منه"[1]

بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو ابو شامہ رحمہ اللہ سے یہاں تک نقل کیا ہے کہ جو شخص جرح و تعدیل سے واقف نہیں وہ احادیث کا حافظ ہی کیوں نہ ہو اسے محدث نہیں کہا جائے گا۔[2]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کو اس فن سے گہرا لگاؤ تھا۔ میزان الاعتدال، لسان المیزان، تہذیب التہذیب اور رجال کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ راویوں کی قلیل جماعت ہی ایسی ہوگی، جن پر امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کلام نہ کیا ہو۔ ائمہ فن نے ان کے کلام کو بلا تامل حجت قرار دیا ہے اور ان کی تصحیح و تضعیف پر اعتماد کیا ہے۔ "الرد علی البکری" کے حوالے سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عبارت اس سے قبل گزر چکی ہے کہ جرح و تعدیل میں ان کے کلام کو وہی اہمیت حاصل ہے جو احکام و مسائل میں امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کی ہے۔

اسی طرح علامہ ابو الفضل زین الدین عراقی رحمہ اللہ شرح الفیۃ الحدیث میں صحیحین کی احادیث کے علاوہ دیگر احادیث کی صحت کا معیار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فمن أين يعرف الصحيح الزائد على ما فيها فقال (خذه إذا تنص صحته) أي حيث ينص على صحته إمام معتمد كأبي داود والترمذي والنسائي والدارقطني والخطابي والبيهقي في مصنفاتهم المعتبرة"[3]

---

[1] معرفة علوم الحديث (ص: ٥٢)

[2] النكت لابن حجر

[3] فتح المغيث (٩/١)

اسی طرح حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے بھی ''علوم الحدیث'' میں اسی ضمن میں لکھا ہے:

''صحیحین کے علاوہ زائد احادیث کی صحت کا معیار یہ ہے کہ ان روایات کی تصحیح ائمۂ حدیث مثلاً ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ، دارقطنی وغیرہ کے اقوال سے ہو جو کہ ان کی کتبِ معتمدہ سے منقول ہوں۔''

جس سے عیاں ہوتا ہے کہ محققین نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی تضعیف و توثیق پر اعتماد کیا۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ائمۂ جرح و تعدیل کی تین قسمیں متشدد، متساہل اور معتدل بیان کرتے ہوئے امام دارقطنی رحمہ اللہ کو معتدلین میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''وقسم معتدل كأحمد والدارقطني وابن عدي''[1]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ جرح میں تشدد یا تساہل کے الزام سے بری ہیں۔

ممکن ہے کہ کسی صاحبِ بصیرت کو اس بات کا احساس ہو کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے انھیں معتدلین میں شمار کیا ہے، لیکن بسا اوقات ان کے تشدد کی بنا پر امام ذہبی رحمہ اللہ نے تعجب کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً: ''بدل بن المحبر'' جو صحیح بخاری کا راوی ہے، کے ترجمہ میں فرماتے ہیں:

''روى الحاكم عن أبي الحسن الدارقطني: ضعيف.
قلت: هو عجب فقد قال أبو حاتم هو أرجح من بهز و حبان و عفان''[2]

[1] الإعلان بالتوبيخ (ص: ٣٥٥) والرفع والتكميل (ص: ١٢٥)

[2] ميزان الاعتدال (١/١٤٠)

لیکن حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ تعجب صحیح نہیں، کیوں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے علی الاطلاق ضعیف نہیں کہا، بلکہ ان کی یہ جرح ایک خاص روایت کی بنا پر ہے، جسے "بدل" نے "زائدہ" سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تہذیب التہذیب" اور "ہدی الساری" میں تصریح کی ہے، فرماتے ہیں:

"ضعفه الدارقطني في روايته عن زائدة قاله الحاكم وذلك بسبب حديث واحد خالف فيه حسين بن علي الجعفي صاحب زائدة"

یہ بات ظاہر ہے کہ "زائدہ" کے تلامذہ میں جو مقام "حسین بن علی الجعفی" کو حاصل ہے وہ "بدل" کو نہیں۔ جیسا کہ "تہذیب التہذیب" اور "تقریب التہذیب" وغیرہ میں ان کے تراجم سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا حسین کی مخالفت کی وجہ سے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے نہ کہ علی الاطلاق جس کا اعتراف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کیا ہے:

"ثقة ثبت إلا في حديثه عن زائدة، من التاسعة" [1]

لیکن اس اعتراف کے باوجود نامعلوم وہ "ہدی الساری" میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس جرح کو تعنت سے تعبیر کیوں کرتے ہیں؟

الغرض امام دارقطنی رحمہ اللہ متشدد نہیں اور نہ ہی متساہل ہیں، بلکہ وہ معتدلین میں سے ہیں۔ ائمہ فن نے بلا تامل ان کی توثیق وتضعیف پر اعتماد کیا ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ پر اعتراض اور اس کا جواب:

فنِ جرح وتعدیل میں جو مقام امام دارقطنی رحمہ اللہ کو حاصل ہے اس کا ذکر

[1] تقریب التہذیب (ص: ٥٨)

ابھی ہم کہہ آئے ہیں کہ محدثین نے ان کی تصحیح وتضعیف اور جرح وتوثیق پر اعتماد کیا ہے اور ان کا شمار ان ائمہ جارحین میں قطعاً نہیں ہوتا، جنھیں تشدد یا تساہل سے متصف کیا گیا ہے۔ تاہم علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ کی طرح وہ بھی مجہول العدالت کو ثقہ کہتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

"وعبارة الدارقطني من روى عنه ثقتان فقد ارتفعت جهالته وتثبت عدالته" (فتح المغيث)

اس کے بعد انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے اس مسلک کی وضاحت ان کی سنن سے بھی ہوتی ہے، جسے انھوں نے "کتاب الدیات" میں ذکر کیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے:

"وارتفاع اسم الجهالة له عنه أن يروي عنه رجلان فصاعدا فإذا كان هذه صفته ارتفع عنه اسم الجهالة وصار حينئذ معروفاً" [1]

علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے بعد امام موصوف کی طرف اس مسلک کی نسبت "الرفع والتکمیل"، "قواعد التحدیث" وغیرہ کتب میں بھی ملتی ہے، جو فتح المغیث ہی سے ماخوذ ہے۔

لیکن یہ بات محلِ نظر ہے، حقائق اس کا انکار کرتے ہیں، علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے معلوم نہیں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے اور پھر اس عبارت کی تائید میں "کتاب الدیات" کی جس عبارت کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے، اس کے الفاظ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔ اس کا مفہوم تو صرف یہ ہے کہ "جس سے دو

[1] سنن الدارقطني (ص: ٣٦٠)

راوی ایک مجہول (العین) سے روایت کریں تو اس سے ''اسم الجہالۃ'' یعنی جہالتِ عین مرتفع ہو جاتی ہے۔'' لیکن اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مجہول الحال ہونا بھی رفع ہو جائے گا۔

یہی نہیں، بلکہ ''سنن الدارقطنی'' اور فتح المغیث کی عبارت میں تفاوت ہے، سنن میں تو ''أن یروي عنه رجلان'' کے الفاظ ہیں، لیکن فتح المغیث میں ''من روی عنه ثقتان'' ہے۔ نیز سنن میں ''ارتفع عنه اسم الجهالة'' ہی کے الفاظ ہیں، حالانکہ فتح المغیث میں ''ارتفعت جهالته وتثبت عدالته'' کے الفاظ ہیں اور ظاہر ہے کہ ''عدالت کے ثبوت'' کا ذکر سنن کی عبارت میں کہیں نہیں، بلکہ اس میں صرف ''اسم جہالت'' کے اٹھ جانے ہی کا ذکر ہے اور یہی جمہور متاخرین کا مسلک ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر ائمۂ اصولِ حدیث نے ذکر کیا ہے، خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وأقل ما ترتفع به الجهالة أن یروي عن الرجل اثنان فصاعدا من المشهورین .... نا أبو زکریا یحیی بن محمد بن یحیی قال سمعت أبي یقول إذا روی عن المحدث رجلان ارتفع عنه اسم الجهالة قلت إلا أنه لا یثبت له حکم العدالة بروایتهما عنه''[1]

مزید یہ کہ سنن دارقطنی اور کتبِ جرح و تعدیل کے مطالعے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ متعدد رواۃ ایسے ہیں، جنھیں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے مجہول کہا ہے، حالانکہ ان سے روایت کرنے والے دو یا دو سے زائد راوی ہوتے ہیں، جس کی

[1] الکفایة (ص: ۸۸۔۸۹)

ہم چند امثلہ ہی ذکر کرنے پر کفایت کریں گے۔

① ابو غطفان المری۔ یہ صحیح مسلم کے راوی ہیں، اور صحیح مسلم میں ان سے تین راوی روایت کرتے ہیں جیسا کہ الجمع بین رجال الصحیحین (۲/ ۹، ۵) اور التهذيب للمزي میں ہے۔ مگر امام دارقطنی نے انھیں مجہول کہا ہے، جیسا کہ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ذکر کیا ہے، بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو یہاں انتہائی تعجب کا اظہار ان الفاظ سے کیا ہے:

"ويبعد هذا الظاهر أن مثل الدارقطني لا يخفى عليه حال المرّي وقد جزم بأن هذا مجهول"

یعنی کس قدر بعید بات ہے کہ امام دارقطنی جیسی شخصیت پر "ابو غطفان المری" (جیسے مشہور راوی) کا حال پوشیدہ نہ ہونے پر بھی وہ اسے بالجزم مجہول کہتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ تعجب بلاشبہ صحیح ہے، کیوں کہ ابو غطفان صحیح مسلم کے راوی ہیں اور اس پر انھوں نے استدراک بھی کیا ہے۔ پھر امام ابن معین رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ جیسے کبار محدثین نے اسے ثقہ بھی کہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے مجہول کہا ہے۔ تو اب ابو غطفان جیسے معروف راوی کو مجہول کہنے کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں:

۱۔ یا تو انھیں متقدمین میں سے ابو غطفان کی توثیق کا علم نہیں ہوا اور صرف صحیح مسلم کا راوی ہونے پر اس کی توثیق کو تسلیم بھی نہیں کیا۔

۲۔ یا پھر اس سے دو راوی روایت کرنے والے انھیں میسر نہیں آئے۔

لیکن ظاہر ہے کہ دوسرا احتمال صحیح نہیں، کیوں کہ ابو غطفان سے روایت کرنے والے متعدد ہیں۔ سنن دارقطنی (ص: ۱۵۹) اور ابو داود میں اس کا شاگرد عتبہ

بن الاخنس مذکور ہے۔ اور صحیح مسلم میں اس سے تین راوی روایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم پر استدراک بھی لکھا ہے تو لامحالہ صحیح مسلم میں اس کے یہ تلامذہ بھی ان کے زیرِ نظر تھے، یوں یہاں دو سے زائد راوی ابو غطفان سے روایت کرتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ اسے مجہول کہتے ہیں، آخر کیوں؟

② امام دارقطنی رحمہ اللہ ''سنن'' میں ایک روایت کی سند یوں بیان فرماتے ہیں:

''حدثنا عبد الله بن أحمد بن وهيب الدمشقي ثنا العباس بن الوليد بن مِزيَدُ نا محمد بن شعيب بن شابور أخبرني شيبان بن عبد الرحمٰن أخبرني يونس بن أبي إسحاق الهمداني عن أمه العالية بنت أنفع قالت حججت أنا وأم محبة'' (الحديث)

اس سند کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''أم محبة والعالية مجهولتان لا يحتج بهما''[1]

اس کے متصل بعد انھوں نے اس روایت کی ایک اور سند ذکر کی ہے، جس میں ''العالیہ'' سے روایت کرنے والا اس کا خاوند یعنی ابو اسحاق ذکر کیا ہے۔ اب اس روایت میں العالیہ سے روایت کرنے والے دو افراد ہوئے: یونس اور ابو اسحاق، یعنی باپ اور بیٹا، اور وہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن اس کے باوجود امام دارقطنی ''العالیہ'' کو مجہول کہہ رہے ہیں۔

ان کا یہ قول بعینہٖ ان کی دوسری کتاب ''المؤتلف والمختلف'' میں بھی

[1] سنن الدارقطني (۳/۵۲)

مذور ہے۔ چنانچہ محدث ڈیانوی ۔نور اللہ مرقدہ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قال الدارقطني إنها (أي العالية) امرأة تروي عن عائشة روىٰ حديثها أبو إسحاق عن امرأته العالية ورواه أيضا يونس بن أبي إسحاق عن أمه العالية بنت ايفع عن أم محبة عن عائشة، وقال: أم محبة والعالية مجهولتان لا يحتج بهما" ①

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی ان دونوں عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ "العالیہ" کو مجہول قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس سے روایت کرنے والے دو افراد ہیں۔ علامہ سخاوی وغیرہ کے قول کے مطابق انھیں ثقہ کہنا چاہیے تھا، ولیس کذلك۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام موصوف کا وہی مسلک ہے جو جمہور محدثین کا ہے۔

③ موسیٰ بن ہلال کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"وفي أسئلة البرقاني أنه سأل الدارقطني عن موسىٰ بن هلال فقال هو مجهول" ②

یعنی "برقانی" کے اسئلہ میں ہے کہ انھوں نے جب امام دارقطنی سے موسیٰ بن ہلال کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: "وہ مجہول ہے۔"

قابلِ غور بات یہ ہے کہ موسیٰ بن ہلال وہ راوی ہے، جس سے روایت کرنے والے امام احمد، الفضل بن سہل، عبید بن الوراق، محمد بن جابر المحاربی، محمد بن اسماعیل الاحمسی وغیرہ ہیں، لیکن اس کے باوجود امام دارقطنی اسے مجہول کہہ رہے ہیں۔

اس قسم کے متعدد راوی ہمارے زیرِ نظر ہیں، جنھیں امام دارقطنی نے مجہول کہا

① التعليق المغني (ص: ۳۱۱)

② لسان الميزان (۱۳٦/٦)

ہے، حالانکہ اس سے روایت کرنے والے دو یا دو سے زائد راوی ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر طوالت کا موجب ہوگا، اسی لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

الغرض علامہ سخاوی نے جو مسلک امام دارقطنی کی طرف منسوب کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ سنن دارقطنی کی عبارت جسے انھوں نے معرضِ استشہاد میں پیش کیا ہے، وہی فی الواقع اس کی تردید کے لیے کافی ہے، بلکہ ان کا مسلک اس سلسلے میں بالکل وہی ہے، جو جمہور محدثین کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لسان المیزان میں امام ابن حبان رحمہ اللہ کا مسلک ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هو مذهب شيخه ابن خزيمة ولكن جهالة حاله باقية عند غيره"[1]

یعنی ابن حبان رحمہ اللہ کی طرح ان کے شیخ ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ جب جہالتِ عین ختم ہو جائے تو وہ راوی ثقہ ہوتا ہے، لیکن دیگر محدثین اس کے خلاف ہیں اور ظاہر ہے کہ "عند غیرہ" میں امام دارقطنی شامل ہیں، تبھی تو متقدمین نے ان کی تصحیح و تضعیف پر اعتماد کیا ہے، بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو بسا اوقات ایک مجہول الحال راوی کی روایت کو صحیح کہتے ہوئے امام دارقطنی کی توثیق کا سہارا لیا ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جو روایت سنن میں بواسطہ زید بن عیاش ان الفاظ میں مروی ہے:

"سمعت رسول الله ﷺ يسأل عن اشتراء الرطب بالتمر ...." (الحديث)

اس پر بحث کرتے ہوئے شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ روایت ضعیف

---

[1] لسان المیزان (۱/۱۴)

ہے، کیوں کہ اس میں زید بن عیاش مجہول ہے اور اس کے قائل امام ابوحنیفہ، طحاوی، ابن حزم، طبری اور عبدالحق رحمہم اللہ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس قول کی تردید کرتے ہوئے "التلخیص" میں رقمطراز ہیں:

"والجواب أن الدارقطني قال إنه ثقة ثبت"[1]

جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ محدثین نے ان کی توثیق کا ایسی صورتوں میں بھی اعتماد کیا ہے۔ بنابریں ان کی طرف اس قسم کے مسلک کی نسبت کسی صورت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی اور بسیار تلاش کے باوجود ہمیں کوئی مقام بھی ایسا نہیں ملا، جہاں ائمہ فن نے ان کی توثیق کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہو کہ وہ جہالتِ عین اٹھ جانے سے راوی کو ثقہ کہتے تھے۔ بنابریں ان کی توثیق معتبر نہیں اور نہ ہی متقدمین مثلاً خطیب بغدادی، علامہ نووی، حافظ ابن الصلاح، حافظ زین الدین العراقی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ کی متداول کتب میں امام دارقطنی کی وہ عبارت کہیں نظر آئی ہے، جسے حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے "وعبارة الدارقطني" کے الفاظ سے نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ حافظ سخاوی سے نقلِ عبارت میں تساہل ہو گیا ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم وعلمه أتم وأحكم.

ایک دوسرا اعتراض اور اس کا جواب:

جرح و تعدیل کے سلسلے میں امام دارقطنی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے رواۃ پر بحث کرتے ہوئے نہایت بے احتیاطی سے کلام کیا ہے، مثلاً محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ" ہیں کہ سنن (ص: ۴۶) پر تو اسے "ثقة، في حفظه شيء" کہتے ہیں اور آگے چل کر اسے (ص: ۸۹) پر "ضعيف سيئ الحفظ"

[1] التلخيص الحبير، نيل الأوطار (۱۹۹/۵)

قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن ابراہیم القاص کو پہلے (ص: ۲۴۳) پر ثقہ اور اسی صفحہ پر اسے ضعیف بھی کہا ہے اور (ص: ۱۳۴) پر ابن لہیعہ کو ضعیف کہنے کے باوجود اس کی حدیث کو حسن کہا ہے۔'' [1]

لیکن اس قسم کا اعتراض دراصل اصولِ حدیث اور محدثین کی اصطلاحات سے اغماض کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ہم یہاں پہلے چند اصولی امور ذکر کر کے پھر ان مقامات کی وضاحت کریں گے:

① ایک راوی میں اس قسم کے مختلف اقوال مختلف حالات کے مطابق ہوتے ہیں، کبھی محدث مطلقاً کسی راوی کے متعلق حکم لگاتا ہے اور کبھی کسی سبب سے، مثلاً دوسرے راوی کے مقابلے میں دوسرا حکم لگاتا ہے۔ مولانا امیر علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إذا اختلف الأقوال عن إمام بعينه في رجل بعينه فربما يكون على وفق السؤال وبالنسبة إلى رجل آخر كما في شرح السخاوي" (التذنيب)

اسی طرح علامہ لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وعلى هذا يحمل أكثر ما ورد من الاختلاف في كلام أئمة الجرح والتعديل ممن وثق رجلا في وقت وجرحه في وقت" [2]

② اور کبھی ایک راوی کے متعلق ایک جگہ مطلقاً حکم لگاتے ہیں، دریں صورت وہ ثقہ ہوتا ہے، لیکن کسی دوسرے خاص راوی سے روایت کرنے میں وہ ضعیف ہوتا

---

[1] أحسن الكلام (۹۳/۲)

[2] ظفر الأماني (ص: ۳٦) الرفع والتكميل (ص: ۱۸)

ہے، جیسا کہ اسماعیل بن عیاش ہیں کہ ان کی احادیث کو جمہور نے جب کہ وہ اہلِ حجاز سے روایت کریں، ضعیف کہا ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إسماعيل بن عياش أبو عتبة الحمصي شيخ الشاميين ليس بالقوي وحديثه عن الحجازيين منكر"[1]

یا جیسے ابن جریج جب اہلِ بصرہ سے روایت کرتے ہیں تو وہ روایت معلل ہوتی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔[2]

ج) کبھی اختلافِ جرح کا سبب اجتہاد کے بدل جانے کی بنا پر ہوتا ہے، علامہ لکھنوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

"وقد يكون الاختلاف لتغير اجتهاده كما هو أحد الاحتمالين في قول الدارقطني في الحسن بن عفير أنه منكر وفي موضع آخر أنه متروك"[3]

د) کبھی اختلاف کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ محدثین کسی ایک راوی پر ایک حکم لگاتے ہیں، لیکن حدیث میں اس کے ساتھ دوسرے راویوں کی موافقت و مخالفت کے اعتبار سے اس پر دوسرا حکم لگاتے ہیں۔

محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ سے متعلق الفاظِ جرح میں جو اختلاف "سنن دارقطنی" میں مذکور ہے، اسی نوعیت کا ہے۔ چنانچہ امام دارقطنی کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ وہ صدوق سیئ الحفظ ہے۔ چنانچہ سنن (ص: ۴۶) میں "طہارتِ منی" پر بحث کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت فرماتے ہیں

[1] من تكلم فيه وهو موثق اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

[2] النكت (ص: ٤١٣، ٦٧٧)

[3] ظفر الأماني (ص: ٣٦)

"لم يرفعه غير إسحاق الأزرق من شريك عن محمد بن عبد الرحمٰن هو ابن أبي ليلىٰ ثقة في حفظ شيء"

پھر اس کے بعد بواسطہ وکیع عن ابن ابی لیلیٰ اسی روایت کو موقوف ذکر کر ــــ اس ت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے مرفوع ذکر کرنے میں اسحاق یا شریک ــــ غلطی کی ہے اور ابن ابی لیلیٰ نے جو اسے موقوف ذکر کیا ہے، وہ صحیح ہے اور وہ ثقہ ہیں لبتہ حافظہ میں خرابی تھی۔ ان کے اس طریق کی شہادت اس سے بھی ملتی ہے کہ اسی ۔ایت کو امام شافعی نے ابن عیینہ سے بواسطہ عمرو بن دینار اور ابن جریج عن عطـ عن ن عباس موقوف ذکر کیا ہے۔

لہٰذا ابن ابی لیلیٰ ہی اس روایت کو موقوف ذکر نہیں کرتے، بلکہ ان کی متابعت دیگر سحاب نے بھی کی ہے اور اسے مرفوع ذکر کرنے میں اسحاق یا شریک ہی ــ ـ غلطی کی ہے، لیکن (ص: ۸۹) پر چونکہ ابن ابی لیلیٰ نے امام سفیان اور شعبہ کی مخالفت کی ہے، کیوں کہ یہ دونوں عبدالرحمان سے "أذن رسول الله ﷺ شفعاً شفعـ" کے لفاظ مرسلا ذکر کرتے ہیں، لیکن ابن ابی لیلیٰ ہی اسے متصل ذکر کرتے ہیں، ا.ا جب . اس نے سفیان اور شعبہ (جو "جبل من جبال الحفظ" کے ساتھ ملقب ہیں) کی مخالفت کی تو ان کے مقابلے میں قاعدہ نمبر ① کی بنا پر ضعیف ٹھہر ــــ ۔ ابعد (ص: ۲۷۳) پر جو اسے "ردئ الحفظ كثير الوهم" کہا ہے تو اس کی ۔ بھی ثقات کی مخالفت ہے، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "طواف واحد" ہی کا ذکر یا ـ . لیکن ابن ابی لیلیٰ نے "فطاف طوافا واحداً وسعى لها سعيين" کا اضـ فہ بھی کیا ہے۔

بنابریں ثقات کے مقابلے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ردئ الحفظ قرار . یا

ہے، لہٰذا ان وجوہ کی بنا پر امام صاحب کے ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں۔

رہا معاملہ عبدالرحمان بن ابراہیم کا تو اس کا جواب قاعدۂ ثانیہ میں موجود ہے، کیوں کہ عبدالرحمان اگرچہ ثقہ ہے، جیسا کہ امام دارقطنی نے کہا ہے، لیکن علاء بن عبدالرحمان کے واسطے سے جو روایت اس نے بیان کی ہے، وہ منکر ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ومن مناكيره عن العلاء عن أبيه عن أبي هريرة مرفوعاً من كان عليه صوم رمضان فليسرده ولا يقطعه أخرجه الدارقطني"[1]

اسی طرح امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"روى حديثاً منكرا عن العلاء"[2]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے ثقہ کہنے کے بعد اسے ضعیف کہا ہے تو اس کی وجہ العلاء سے یہ روایت بیان کرنا ہے، نہ یہ کہ وہ مطلقاً ضعیف ہے، ہماری اس توجیہ پر امام دارقطنی کا انداز بھی شاہد ہے۔ چنانچہ اس مرفوع روایت کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل فرماتے ہیں:

"نزلت فعدة من أيام أخر متتابعات فسقطت"

اس کے بعد فرماتے ہیں: "هذا إسناد صحيح" جو اس بات پر صاف دال ہے کہ وہ عبدالرحمان کی مندرجہ بالا روایت کو صحیح نہیں مانتے اور اگرچہ انھوں نے صراحتاً اسے ضعیف نہیں کہا، لیکن عبدالرحمان کی یہ روایت جو العلاء سے روایت کرنے کی وجہ سے منکر تھی، جیسا کہ امام احمد اور ابو حاتم نے کہا ہے تو انھوں نے یہاں

[1] میزان الاعتدال (۲/۵۴۵)

[2] لسان المیزان (۳/۴۰۲)

عبدالرحمان کو ضعیف کہہ کر اس روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

تیسرا اعتراض جو اس سلسلے میں کیا گیا ہے وہ یہ کہ سنن دارقطنی (ص: ۱۳۴) پر ابن لہیعہ کو ضعیف کہنے کے باوجود اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ تو یہ اعتراض بھی درست نہیں، کیوں کہ ابن لہیعہ پر جرح اس کی ذات کے اعتبار سے ہے اور جو انھوں نے اس کی سند کو حسن کہا ہے تو وہ باعتبار صحتِ متن کے ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کی احادیث کو متعدد مقامات پر حسن کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "النکت علی ابن الصلاح" میں اس کی متعدد امثلہ ذکر کی ہیں۔

البتہ یہاں ہم ایک اصولی مسئلے کی طرف ناظرین کی توجہ دلاتے ہیں اور وہ یہ کہ ائمہ جرح و تعدیل کسی راوی پر جرح کرتے ہیں تو کبھی "لیس بالقوي" اور کبھی "لیس بقوي" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کتبِ رجال کی ورق گردانی اور تراجم رجال پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق ہے۔ "لیس بقوي" میں تو راوی کے قوی ہونے کی نفی ہے اور "لیس بالقوي" میں اس درجۂ کاملہ کی نفی مقصود ہوتی ہے اور اس کی روایت درجہ حسن سے ساقط نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولانا امیر علی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے:

"یطلق "لیس بالقوي" علی الصدوق"[1]

اسی طرح شیخ عبدالرحمان بن یحییٰ المعلمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کلمة لیس بقوي تنفي القوة مطلقاً وإن لم تثبت الضعف مطلقاً وکلمة لیس بالقوي إنما تنفي الدرجة الکاملة من القوة"[2]

---

[1] التعقیب (ص: ۲٤)

[2] التنکیل (۲۳۲/۱)

یہی وجہ ہے کہ الفاظِ جرح میں ان کو ''درجہ خامسہ'' میں جگہ ملی ہے، جن کی روایت درجۂ استشہاد سے قطعاً کم نہیں ہوتی، بلکہ شیخ محمد قائم سندھی نے ''الفوز الکرام'' میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی ''التعقبات'' اور ''النکت البدیعات'' سے نقل کیا ہے کہ جس راوی کے متعلق ''لیس بالقوي'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کی روایت درجۂ حسن سے کم نہیں ہوتی۔[1]

بایں صورت امام دارقطنی نے ابن لہیعہ کو ''لیس بالقوي'' کہا ہے اور ان کی روایت مندرجہ بالا اصول کے پیشِ نظر حسن ہے، لہٰذا ان پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

الغرض الفاظِ جرح وتعدیل میں اس قسم کا اختلاف متعدد وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے اور اس نوعیت کے اختلاف کو لے کر محدثین پر طعن وتشنیع وہی شخص کر سکتا ہے جو ان کی اصطلاحات سے ناواقف ہو۔

تعجب ہے کہ ''فقہاء'' کے اقوال میں جب اس قسم کا تعارض وتخالف واقع ہوتا ہے تو یہ ''حضرات'' ان کی بے سروپا توجیہات وتاویلات کے درپے ہوتے ہیں، لیکن اگر محدثین کے اقوال میں کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ان پر اعتراض کرتے ہوئے پھولے نہیں سماتے اور پھر اس کے ثبوت میں سرتاپا زورصرف کرتے ہیں۔

ہم نے اپنے مقالہ ''جرح وتعدیل اور اس کی اصطلاحات'' میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے، جسے ہم عنقریب ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ إن شاء اللّٰہ

امام دارقطنی رحمہ اللہ پر اعتراضات کے حوالے سے یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ امام دارقطنی نے ایک روایت کے بارے میں فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے، جس پر تعاقب

[1] الفوز الکرام کا قلمی نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔

کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے کہا:

"هذه عصبية الدارقطني كان يحيٰ بن سعيد لا يرضى معاوية بن صالح وقال أبو حاتم لا يحتج به"

کہ یہ دارقطنی کا تعصب ہے، یحییٰ بن سعید، معاویہ بن صالح پر راضی نہ تھے اور ابو حاتم نے کہا ہے: "لا يحتج به" لیکن علامہ ابن عبدالہادی نے ان کی غلط فہمی دور کر دی ہے:

"ليست العصبية من الدارقطني وإنما عصبية منه"

یہ دارقطنی کا نہیں، بلکہ ابن جوزی کا تعصب ہے، معاویہ بن صالح ثقہ وصدوق ہے امام یحییٰ کا کسی راوی پر راضی نہ ہونا غیر قادح ہے۔ اسی طرح ابو حاتم کا "لا يحتج به" کہنا بھی غیر قادح ہے۔[1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی پر اس قسم کے اعتراضات کا اہل علم نے دفاع کیا ہے اور جرح وتعدیل میں ان پر اعتماد کیا ہے۔

امام دارقطنی مدلس ہیں؟

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے ہم "عبداللہ بن محمد ابو القاسم البغوی" کے تحت یہ ذکر کر چکے ہیں کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے "ابن طاہر" سے نقل کیا ہے:

"امام دارقطنی نے جو روایتیں امام ابو القاسم بغوی سے نہ سنی ہوتیں وہ انھیں "قرئ على أبي القاسم البغوي حدثكم فلان" کے الفاظ سے بیان کرتے، اس طرح وہ تدلیس سے کام لیتے اور یہ نہ کہتے کہ اسے میں نے سنا ہے۔"[2]

1. نصب الراية (٢/٤٣٩) ملخصاً
2. تذكرة الحفاظ (٣/١٨٩) طبقات المدلسين لابن حجر

لیکن ان کی سنن کا مطالعہ کرنے والا طالب علم خوب جانتا ہے کہ امام دارقطنی نے امام بغوی سے حدثنا اور سمعت کے الفاظ کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں "قرئ علی أبي القاسم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ساتھ ہی "وأنا أسمع" کی صراحت بھی کی ہے، مثلاً "باب في نضح الماء علی الفرج بعد الوضوء" کے تحت پہلی روایت ان الفاظ سے نقل فرماتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد العزیز البغوي قراءة علیه وأنا أسمع"

اسی طرح کتاب الصلاۃ کی پہلی روایت کے الفاظ یوں ہیں:

"قرئ علی أبي القاسم عبد الله بن محمد بن عبد العزیز وأنا أسمع"

اور باب ذکر بیان المواقیت کی دسویں حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد العزیز قراءة علیه"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنن میں "امام ابو القاسم البغوی" سے روایت کے وقت "قرئ" کے لفظ کے ساتھ "أنا أسمع" کی صراحت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

دراصل معلوم یوں ہوتا ہے کہ امام ابو القاسم بغوی سے جس قدر انھوں نے روایات روایت کی ہیں، وہ یا تو املا کی صورت میں ہیں، جیسا کہ سنن میں "باب صفة ما یقول المصلي عند رکوعه وسجوده" میں فرماتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد العزیز إملاء"

اور یا القراءۃ کی صورت میں جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں تو وہ ان کی روایات کو کبھی "حدثنا إملاء" سے بیان کرتے ہیں اور کبھی "قرئ وأنا أسمع"

سے اور کبھی "قراءة عليه وأنا أسمع" اور کبھی "حدثنا البغوي قراءة عليه" کے الفاظ سے اور کبھی صرف "حدثنا" کے لفظ ہی پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ یہ روایات انھوں نے امام بغوی رحمہ اللہ سے یا تو بطور املا اخذ کی ہوتی ہے اور یا "قراءة علیہ وأنا أسمع" کے طریق سے۔ اسی طرح جہاں کہیں "قرئ على أبي القاسم البغوي حدثكم فلان" کے الفاظ پر اکتفا کی ہے جو "موهم إلى التدليس" ہیں تو ان الفاظ سے یہ کسی صورت لازم نہیں آتا کہ انھوں نے یہ روایت امام بغوی رحمہ اللہ سے سنی ہی نہیں، بلکہ وہ دراصل اپنی مسموعات کے دو طریق میں سے ایک طریق کی وضاحت "قرئ" کے الفاظ سے کرتے ہیں کہ یہ روایت بطورِ قراءت میں نے ان سے لی ہے نہ کہ بطریقِ املا۔ جو ان کی دقتِ نظر پر ایک بڑی دلیل ہے، لیکن ابن طاہر نے اسے تدلیس پر محمول کیا ہے جو درست نہیں۔

میں یہ حروف لکھ چکا تھا کہ علامہ الحلبی رحمہ اللہ کی "التبيين لأسماء المدلسين" دیکھنے کا موقع ملا، جس کے آخر میں علامہ موصوف نے حافظ صلاح الدین العلائی سے نقل کیا ہے کہ جس راوی نے اپنے شیخ سے روایات اجازتاً، مناولتاً یا وجادتاً کے طریق سے لی ہوں اور وہ انھیں اخبرنا سے بیان کرے تو اسے تدلیس کے باب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ پھر اس کی چند مثالیں ذکر کرتے ہوئے ابن طاہر مقدسی کا مندرجہ بالا قول جو انھوں نے امام دارقطنی کے متعلق کہا ہے، نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس قسم کی روایات انھوں نے امام بغوی رحمہ اللہ سے یا تو اجازہ کی صورت میں لی ہیں تو یہ روایات متصل ہوئیں یا پھر وجادہ کے طور پر حاصل کی ہیں تو اس سے ان کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ تیسری صدی کے بعد تدلیس کا وجود انتہائی قلیل پایا جاتا ہے، جیسا کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

”فأما أن يكون له من البغوي إجازة شاملة بمروياته كلها فيكون متصلًا أو لا يكون كذلك فيكون وجادة وهو قد تحقق صحة ذلك عنه على أنّ التدليس بعد ثلاثمائة يقل جدا قال الحاكم لا أعرف في المتأخرين من يذكر به إلا أبا بكر محمد بن محمد بن سليمان الباغندي. والله أعلم انتهى“

الغرض امام دارقطنی نے امام بغوی رحمہ اللہ سے روایات بصورتِ اجازہ یا وجادہ لی ہوں یا پھر اپنی مرویات کے درمیان طریقِ اخذ کی وضاحت ہو کسی صورت میں بھی اسے تدلیس نہیں کہہ سکتے۔ واللہ تعالیٰ أعلم

اس فن پر لکھنے کا آغاز:

فنِ جرح و تعدیل کی ابتدا اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آخری دور سے ہو چکی تھی، لیکن اس کی تدوین کا آغاز دوسری صدی سے شروع ہوا اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے دور تک باقی رہا۔ اس دور میں اہلِ علم و فضل نے اس پر متعدد کتابیں لکھیں، فنی اعتبار سے سب سے پہلے اس فن پر کلام کرنے والے امام شعبہ بن الحجاج ہیں اور سب سے پہلے اس فن پر امام یحییٰ بن سعید القطان کی کتاب کا نام لیا گیا ہے۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے ان ہی کی راہ اختیار کی۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”أول من جمع في ذلك الإمام يحيىٰ بن سعيد القطان وتكلم فيه بعده تلامذته يحيىٰ بن معين وعلي بن المديني وأحمد بن حنبل وعمرو بن علي الفلاس وأبو خيثمة وتلامذتهم كأبي زرعة وأبي حاتم والبخاري ومسلم وأبي إسحاق الجوزجاني والنسائي وابن خزيمة والترمذي

والدولابي والعقيلي وابن عدي وأبي الفتح الأزدي والدارقطني والحاكم إلى غير ذلك"[1]

اس مختصر مقالے میں ان جملہ محدثین کا ذکر تو بے شک طوالت کا موجب ہو گا، تاہم بعض مشہور مؤلفین اور ان کی کتابوں کا تعارف ضروری ہے۔

① امام محمد رحمہ اللہ بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ):

انھوں نے اس فن پر تین کتابیں لکھی ہیں: ایک "کتاب الضعفاء الصغیر" اور دوسری کتاب "الضعفاء الکبیر"۔ اول الذکر ہندوستان سے دو مرتبہ طبع ہو چکی ہے اور دوسری غیر مطبوع ہے۔ تیسری کا نام "التاریخ الکبیر" ہے جو امام صاحب کا شاہکار ہے، یہ ہندوستان میں آٹھ مبسوط جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ التاریخ الاوسط، التاریخ الصغیر، الکنیٰ وغیرہ بھی ان کی تصانیف ہیں۔

② امام احمد رحمہ اللہ بن شعیب النسائی (م ۳۰۳ھ):

ان کی اس فن پر دو کتابیں ہیں: ایک کتاب "الضعفاء والمتروکین" اور دوسری "کتاب الجرح والتعدیل" ہے۔ اول الذکر ہندوستان سے کتاب الضعفاء الصغیر للامام البخاری، کتاب المراسیل لابن ابی حاتم کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

③ ابو الفتح الازدی محمد رحمہ اللہ بن حسین (م ۳۷۴ھ):

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

"له مصنف كبير في الضعفاء وهو قوي النفس"[2]

لیکن اس میں بعض مقامات ایسے ہیں، جن پر علما نے مواخذہ کیا ہے،[3] جس

---

[1] میزان الاعتدال (۲/۱)

[2] تذکرۃ الحفاظ (۱٦٦/۳) کشف الظنون (۵۸۲/۱)

[3] میزان الاعتدال ترجمہ ابو الفتح الازدی۔

کی وجہ غالباً ان کا متشدد ہونا ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال میں ابان بن اسحاق اور ابراہیم بن محمد کے ترجمہ میں صراحت کی ہے۔

④ عبدالرحمان رحمہ اللہ بن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ):

ان کی کتاب الجرح والتعدیل کے نام سے نو مبسوط جلدوں میں حیدر آباد سے طبع ہو چکی ہے۔ نہایت مفید کتاب ہے جو زیادہ تر ان کے والدِ محترم امام ابو حاتم رحمہ اللہ اور امام ابو زرعہ رحمہ اللہ سے اسئلہ کے جوابات پر مشتمل ہے۔

⑤ ابو نعیم رحمہ اللہ الجرجانی (م ۳۲۳ھ):

ان کا نام عبدالملک بن محمد ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الحفاظ (۳/ ۳۵) میں ان کا ترجمہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”هو في عشرة أجزاء“

⑥ ابو جعفر رحمہ اللہ العقیلي (م ۳۲۲ھ):

ان کی اس فن پر کتاب الضعفاء الکبیر اور کتاب الجرح والتعدیل کے نام سے دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب الضعفاء کا قلمی نسخہ حضرت سید بدیع الدین مدظلہ العالی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ حافظ عقیلی رحمہ اللہ جرح میں متشدد ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے امام علی بن المدیني کو بھی الضعفاء میں داخل کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے ان کے اس رویے سے برہم ہو کر یہاں تک فرما دیا:

”فما لك عقل يا عقيلي أتدري فيمن يتكلم“ ①

اب یہ کتاب طبع ہو گئی ہے۔

① میزان الاعتدال ترجمہ علي بن المدیني.

⑦ ابو اسحاق رحمہ اللہ ابراہیم بن یعقوب الجوزجانی (م ۲۵۹ھ):

ان کی کتاب احوال الرجال کے نام سے مشہور ہے۔ وہ چونکہ اہلِ دمشق کے مسلک (یعنی ناصبیت) کی طرف مائل تھے، جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔ اسی وجہ سے اہلِ کوفہ کے متعلق ان کی جرح معتبر قرار نہیں دی گئی، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابان بن تغلب کے ترجمہ میں تصریح کی ہے۔[1] یہ کتاب بھی اب شائع ہوگئی ہے۔

⑧ امام ابو حاتم رحمہ اللہ ابن حبان البُستی:

ان کی اس فن پر دو کتابیں ہیں: کتاب المجروحین اور کتاب الثقات۔ کتاب الثقات میں انھوں نے بعض ایسے راویوں کو بھی ذکر کیا ہے جن کو انھوں نے کتاب المجروحین میں داخل کیا ہے۔ علمائے فن نے ان کے اس انداز کو تساہل یا تغیرِ اجتہاد پر محمول کیا ہے۔ ان کے تشدد و تساہل کی طرف اشارہ ہم اس سے قبل کر آئے ہیں۔ وللتفصیل موضع آخر۔ امام ابن حبان کی یہ دونوں کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔

⑨ امام ابو الحسن احمد بن عبداللہ العجلی (م ۲۶۱ھ):

علامہ ذہبی رحمہ اللہ سے علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

"ھو کتاب مفید یدل علی سعة حفظه"

یہ ثقہ راویوں پر مشتمل ہے اور شائع شدہ ہے۔

⑩ امام ابو احمد عبداللہ بن محمد المعروف بابن عدی رحمہ اللہ (م ۳۶۵ھ):

ان کی کتاب کا نام "الکامل" ہے۔ یہ کتاب ساٹھ اجزا میں ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے، جیسا کہ علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون میں فرماتے ہیں:

---

[1] تھذیب التھذیب ولسان المیزان

”هو أكمل كتب الجرح والتعديل وعليه اعتماد الأئمة“

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا قول اس کتاب کے متعلق گزر چکا ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اس میں ہر اس راوی کو ذکر کیا ہے، جس پر محدثین نے ادنیٰ سا بھی کلام کیا ہے۔ یہ کتاب بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔

⑪ علامہ عبدالرحمان رحمہ اللہ ابو الفرج ابن جوزی (م ۵۹۱ھ):

ان کی کتاب اس فن پر خلاصہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں آبان العطار کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ صرف الفاظِ جرح ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ ان کی کتاب کے عیوب میں شمار ہوتا ہے، لیکن اس قول کو قواعد کلیہ منطقیہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ ہمیں کتاب الضعفاء کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، جس میں بسا اوقات الفاظِ تعدیل و توثیق بھی منقول تھے۔ یہ کتاب بھی شائع ہوگئی ہے۔

⑫ حافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ (م ۶۰۰ھ):

فنِ رجال پر گو متقدمین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، لیکن متاخرین میں حافظ المقدسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حافظ ابو الفضل کی طرح انھوں نے بھی سنن ابن ماجہ کو چھٹی کتاب شمار کیا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ”الكمال في أسماء الرجال“ ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ بعد میں آنے والے بھی حضرات اسی کے خوشہ چین ہیں، مگر اس میں رواۃ کی تاریخِ ولادت اور وفیات کے بیان کرنے میں قدرے طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر ”تذکرہ“ میں تفصیلاً کیا ہے۔

(13) حافظ ابوالحجاج یوسف بن عبدالرحمان المزی رحمہ اللہ (م ۷۴۲ھ):

یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہم سبق اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے مشائخ سے ہیں۔ انھوں نے اپنے ''تذکرہ'' کی انتہا انہی کے ترجمہ پر کی ہے۔ علامہ المزی کی کتاب کا نام ''تہذیب الکمال'' ہے جو حافظ المقدسی کی ''الکمال'' کا ملخص اور زیادات پر مشتمل ہے۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''أجمع على أنه لم يصنف مثله ولا يستطاع''

علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ کتاب ایک سو اجزا پر مشتمل ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے تہذیب پر کافی کوشش کی ہے، لیکن صحاح ستہ کے بعض راویوں کے متعلق انھیں بھی علم نہیں ہو سکا، جس کی بنا پر ان کے تراجم اس میں مذکور نہیں، بلکہ بسا اوقات ''روى عن فلان'' اور ''روى عنه فلان''، ''أخرج له فلان'' ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح اصحابِ ستہ کی بعض دوسری تصانیف پر تو بالکل ہی کام نہیں کیا، جیسا کہ بر الوالدين للبخاري، كتاب الانتفاع بإهاب السباع لمسلم، كتاب الزهد، دلائل النبوة، الدعاء، ابتداء الوحي، أخبار الخوارج لأبي داود ہیں، غالباً وہ ان پر مطلع نہیں ہو پائے۔[1]

اسی بنا پر بعض حضرات کا کہنا ہے کہ المزی اسے مکمل نہیں کر سکے، بلکہ بعد میں حافظ علاء الدین مغلطائی (م ۷۶۲ھ) نے اس کی تکمیل تیرہ جلدوں میں کی، جس کا نام اکمال تہذیب الکمال ہے۔

بہر حال یہ اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے۔ متاخرین نے اسے اس قدر اہمیت دی ہے کہ متعدد اہلِ علم نے اس کا اختصار کیا، جیسا کہ حاجی خلیفہ نے ذکر کیا

(1) تہذیب (۱/۶، ۷)

ہے، لیکن ان میں زیادہ مشہور اختصار علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا ہے۔

(14) حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸ھ):

ان کی اس فن میں گراں قدر اور متعدد تصانیف ہیں۔ علمائے متقدمین کی کتابوں کو مختصر کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ حافظ المزی کی کتاب کا اختصار انھوں نے ''تذہیب تہذیب الکمال'' کے نام سے کیا، لیکن یہ محض اختصار نہیں، بلکہ مزید فنی معلومات کو بھی انھوں نے جمع کر دیا ہے، البتہ اس میں بعض مقامات پر ان سے سہو ہو گیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب التہذیب کے مقدمے میں لکھا ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس فن پر ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں، جن سے اس فن کے متعلق ان کے تبحر کا پتا چلتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے شرح نخبۃ الفکر میں سچ کہا ہے:

''له استقراء تام في نقد الرجال''

ہم ان کا ذکر یہاں انتہائی اختصار سے کرتے ہیں:

(۱) تاریخ الاسلام الکبیر:

علامہ ذہبی کی یہ کتاب اہم اور بڑی ضخیم ہے جو اکیس جلدوں میں ہے، اس میں انھوں نے علامہ ابن ماکولا کے اشارے کے مطابق ابتدائے اسلام سے لے کر اپنے دور تک تمام واقعات سنین وار تحریر کیے ہیں اور ہر دس سال کے حوادثات کو ایک طبقے میں شمار کیا ہے اور ہر صدی کے علما و فضلا کے تراجم بھی بیان کیے ہیں، لہٰذا یہ کتاب محض حوادثات پر مشتمل نہیں، بلکہ حوادث و رجال دونوں کی تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ اس کا مکمل نسخہ ابھی تک پردۂ خفا میں ہے، البتہ متفرق اجزا حسبِ ذیل مقامات سے ملتے ہیں:

ابتدا سے ۴۰ھ تک کے حالات پر جو جلد مشتمل ہے وہ کتب خانہ پیرس اور ۴۰ھ سے ۱۳۲ھ تک کا حصہ کتب خانہ جامع تونس میں اور ۱۸۱ھ سے ۲۰۰ھ کا حصہ مصر کے کتب خانہ خدیو میں ہے اور یہ مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ۳۰۱ھ سے ۴۰۰ھ تک کا حصہ کتب خانہ پیرس میں۔ ۵۵۱ھ سے ۷۰۰ھ تک کا حصہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ ۵۰۱ھ سے ۵۳۰ھ کا دوسرا ناقص حصہ کتب خانہ مصر میں اور ۵۰۱ھ سے ۶۲۰ھ تک کتب خانہ پیرس میں۔ ۶۰۱ھ سے ۶۶۰ھ تک کا حصہ برٹش میوزیم لندن میں ہے اور اس کا ابتدائی حصہ جو عہدِ عباسیہ کے اوائل کا ہے وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ ① اب یہ عظیم الشان کتاب ۵۲ جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔

② تذکرۃ الحفاظ:

یہ علم دین کے باکمال ماہرین کا تذکرہ ہے، جنھیں حسبِ مراتب ۲۱ طبقوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر طبقہ کے اہلِ علم کا مختصر تذکرہ حروفِ تہجی کی ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر کیا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ المزی رحمہ اللہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۰۹ھ میں حیدر آباد سے یہ عظیم المرتبت کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اب اس کا دوسرا اڈیشن مع ذیل زیور طبع سے آراستہ ہو کر بازار میں آ چکا ہے۔

③ میزان الاعتدال:

اس میں مؤلف نے حروفِ معجم کی ترتیب پر دس ہزار سے زائد مختلف فیہ راویوں کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے مختصر کیا اور اس پر اضافے بھی کیے، جس کا نام لسان المیزان رکھا۔

① ''معارف'' جلد ۳۶، شمارہ ۵ (ص: ۳۶۶)

یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ میں دو جلدوں میں مولانا عبدالحی لکھنوی کی کوششوں سے طبع ہوئی، پھر ۱۳۲۵ھ میں مصر سے تین جلدوں میں شائع ہوئی اور اب مصر ہی سے اس کا تیسرا اڈیشن چار جلدوں میں چھپ کر آ چکا ہے، جسے بعض دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اور تصحیح کے بعد بڑے اہتمام سے طبع کروایا گیا ہے۔

④ الكاشف في أسماء الرجال:

یہ کتاب تذہیب التہذیب کا اختصار ہے، اس کے قلمی نسخے بانکی پور، رام پور اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ اس کا ایک عمدہ نسخہ شیخ عبدالحق دہلوی کے والدِ محترم کا ہے جو حکیم حبیب الرحمان کے پاس ڈھاکہ میں تھا، معلوم نہیں حکیم صاحب ان دنوں بقیدِ حیات ہیں یا اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اب شائع ہو گئی ہے۔

⑤ المغني في الضعفاء:

حاجی خلیفہ کے قول کے مطابق مؤلف نے ابن معین، امام بخاری، ابو زرعہ، ابو حاتم، دارقطنی، الدولابی، حاکم، خطیب بغدادی اور ابن جوزی رحمہ اللہ کی کتابوں سے ضعیف راویوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہو گئی ہے۔

⑥ من تكلم فيه وهو موثق:

اس میں ان رواۃ کا ذکر ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، لیکن ان کی روایت درجۂ حسن سے کم نہیں ہوتی۔ حضرت مولانا سید بدیع الدین صاحب پیر آف جھنڈا کے مکتبہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، الحمد للہ۔ اس کا قلمی نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے، اس میں ۳۹۹ راویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک مجموعہ میں مطبوع بھی ہے۔

⑦ المنظومة في المدلسين:

اس میں مدلس راویوں کو نظم میں جمع کیا گیا ہے، اس کا بھی قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ والحمد لله على ذلك.

اس کے علاوہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی اسی فن سے متعلق درج ذیل کتابیں ہیں:

① المقتنىٰ في سرد الكنىٰ
② المنظومة في أسماء الحفاظ
③ سير أعلام النبلاء
④ العبر في خبر من غبر
⑤ طبقات الحفاظ
⑥ دول الإسلام
⑦ تجريد أسماء الصحابة
⑧ شيوخ الأئمة الستة
⑨ ديوان الضعفاء
⑩ المجرد لأسماء رجال ابن ماجه
⑪ قرة العين في ضبط رجال الصحيحين

(15) حافظ الدنیا احمد بن علی العسقلانی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ (م ۸۵۲ھ):

انھوں نے بھی اس فن پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے درج ذیل زیادہ مشہور ہیں:

① تهذيب التهذيب:

یہ علامہ المزی رحمہ اللہ کی تہذیب کا اختصار ہے اور یہی وہ کتاب ہے کہ متاخرین

نے صحاح ستہ کے راویوں کے لیے اس پر اعتماد کیا ہے، بلکہ خود مؤلف نے اس پر رضا مندی کا اظہار فرمایا ہے، چنانچہ علامہ الشوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"قال: لست راضياً عن شيء من تصانيفي لأني عملتها في ابتداء الأمر ثم لم يتهيأ لي من يحررها معي سوى شرح البخاري ومقدمته والمشتبه والتهذيب ولسان الميزان"[1]

تہذیب التہذیب میں انھوں نے بعض تفصیلات کا اختصار کیا ہے اور ان روایات کو بھی حذف کر دیا ہے، جنھیں علامہ المزی رحمہ اللہ نے مترجمین کے تراجم میں ذکر کیا ہے، البتہ کہیں کہیں ان کے متن کی طرف اختصاراً اشارہ فرما جاتے ہیں اور راوی کے شیوخ اور مروی عنہ کے ذکر کرنے میں اختصار کے ساتھ ساتھ ان کے ذکر کرنے میں حروف معجم کا خیال بھی نہیں رکھا، البتہ راوی کا بیٹا یا رشتہ دار اس کا شیخ یا تلمیذ ہو تو اسے مقدم کیا ہے۔ اور انھوں نے ان رجال کو بھی ذکر کیا ہے، جنھیں حافظ المزی نے ذکر نہیں کیا۔ علامہ مغلطائی رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی کتابوں سے بھی انھوں نے جابجا استفادہ کیا ہے۔ بایں وجہ یہ اب صرف تہذیب الکمال کا اختصار نہ رہا، بلکہ اسے مستقل حیثیت حاصل ہو گئی، مؤلف اس علمی شاہکار سے ۹ جمادی الاخریٰ ۸۰۸ھ میں اس کی تسوید سے فارغ ہوئے تھے۔

یہ کتاب سب سے پہلے حیدر آباد سے ۱۳۲۶ھ میں دائرۃ المعارف النظامیہ نے شائع کی اور اب کویت سے اس کا دوسرا اڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔

② تقریب التہذیب:

یہ تہذیب التہذیب کا اختصار ہے، جس میں انھوں نے صحاح ستہ کے رجال

[1] البدر الطالع (۸۹/۱) التاج المکلل (ص: ۲۷۰)

کے علاوہ اصحابِ صحاح کی دوسری کتابوں کے رجال کا بھی ذکر کیا ہے۔ تقریب کی ابتدا میں انھوں نے ایک مفید مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں راویوں کے طبقات اور الفاظِ جرح وتعدیل کے مراتب و مدارج کو بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے، لیکن یہ طبقات اور جرح وتعدیل کے مراتب اسی کتاب سے مختص ہیں، اسے عام قرار دینا درست نہیں۔ مقدمۂ تقریب میں انھوں نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جرح وتعدیل میں جو قول ان کے نزدیک راجح ہوگا، اسے ہی نقل کرنے پر اکتفا کریں گے، لیکن ہم ان کے اس قول سے علی الاطلاق متفق نہیں۔ وللتفصیل موضع آخر

تقریب التہذیب ہندوستان اور مصر سے بارہا طبع ہو چکی ہے، ہندوستان کے بعض نسخوں کے ساتھ مولانا امیر علی کی تعقیب اور التذنیب بھی ملحق ہے جو اپنی جگہ پر دو اہم رسالے ہیں اور بعض نسخوں کے ساتھ "المغنی" مطبوع ہے، جس سے ضبطِ اسماء کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔

③ لسان المیزان:

یہ میزان الاعتدال کا اختصار مع زیادات ہے، حیدر آباد سے ۶ مبسوط جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

④ تعجيل المنفعة بزوائد رجال الأئمة الأربعة:

اس میں انھوں نے موطأ مالک، مسند شافعی، مسند احمد اور مسند ابو حنیفہ کے ان زائد راویوں کا ذکر کیا ہے جو تہذیب التہذیب کے علاوہ ہیں، حیدر آباد سے یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

⑤، ⑥ میزان الاعتدال اور لسان المیزان:

ضعیف اور متکلم فیہ راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے یوں تو بیسیوں

کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ان تمام میں یہ دونوں کتابیں سب سے معتبر اور جامع قرار دی گئی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نے درجہ رابعہ و خامسہ کی کتابوں کے راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان ہی کی طرف خاص توجہ دلائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اگر کسے را رغبتِ تحقیق ایں کتب باشد میزان، الضعفاء ذہبی و لسان ابن حجر برائے احوال رجال ایں کتب بکارش مے آید۔"[1]

(16) علامہ صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی الساعدی:

ان کی کتاب کا نام "خلاصۃ تذہیب الکمال" ہے جو مصر سے طبع ہو چکی ہے۔ یہ بھی علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی تذہیب کا خلاصہ ہے۔[2]

یہ ہیں وہ مشہور کتابیں اور ان کے مؤلفین جو فنِ جرح و تعدیل میں زیادہ تر مشہور و معروف ہیں۔ ہم نے اپنے مقالہ "جرح و تعدیل" میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس فن میں متعدد کتابوں کی نشان دہی کی ہے۔

(7) المؤتلف والمختلف:

حدیث کے جملہ علوم میں ایک علم "المؤتلف والمختلف" بھی ہے، جس میں ان اسما کی وضاحت ہوتی ہے جو ہم شکل و ہم صورت ہوتے ہیں، لیکن بلحاظِ تلفظ ان میں تغایر ہوتا ہے، جیسے سَلَامَ اور سلّام ہے یا سَلْمُ اور سَلَمُ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں قیاس و ضابطہ کو کوئی دخل نہیں اور نہ ہی قرائن اس میں معاون ہو سکتے ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ اس فن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هو فن جليل يقبح جهله بأهل العلم لا سيما أهل الحديث

---

[1] عجالہ نافعہ

[2] تقریب مع التدریب (ص:۴۶۴)

ومن لم يعرفه يكثر خطؤه"[1]

امام ابن المديني رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فن علومِ حدیث میں سے اشد ترین ہے، کیوں کہ اس میں قیاس وغیرہ کو بالکل دخل نہیں۔[2]

دیگر فنونِ حدیث کی طرح اس فن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ بالکل واضح ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے ابو جعفر محمد بن حبیب البغدادی (المتوفی ۲۴۵ھ) نے "السؤتلف والمختلف في أسماء القبائل" کے نام سے کتاب لکھی، ان کے بعد حافظ عبدالغنی بن سعید نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں: ایک اسماء کے بارے میں اور دوسری انساب کے بارے میں ہے۔ ان کے بعد امام دارقطنی نے کتاب لکھی۔ امام دارقطنی کے بعد بہت سے اہلِ علم نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔

علامہ الکتانی امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کتاب کے متعلق فرماتے ہیں:

"كتاب المختلف والمؤتلف للدارقطني وهو كتاب حافل"[3]

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"له فيه تصنيف مفيد"[4]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کو اس فن پر کافی ملکہ حاصل تھا۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ رجاء بن محمد الانصاری سے نقل کرتے ہیں کہ ہم امام دارقطنی رحمہ اللہ کے پاس تھے کہ ایک طالبِ علمِ حدیث کی قراءت کر رہا تھا اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نماز پڑھ رہے تھے۔ قاری اچانک ایک ایسی حدیث سے گزرا، جس میں ایک راوی نسیر بن ذعلون تھا، لیکن قاری

---

1. تقريب مع التدريب (ص: ٤٦٤)
2. شرح نخبة الفكر
3. الرسالة (ص: ٩٦)
4. مقدمة ابن الصلاح

نے اسے بُشیر بن ذعلون پڑھا۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے جب یہ سنا تو نماز کی حالت میں سبحان اللہ کہا۔ قاری نے دوسری مرتبہ یُشیر بن ذعلون پڑھا۔ امام صاحب نے یہ سن کر ﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴾ کہا تو قاری سمجھ گیا اور اس نے اپنی غلطی کو درست کرلیا۔

اسی طرح ایک واقعہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے حمزہ بن محمد سے یوں نقل کیا ہے کہ امام صاحب نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو عبداللہ بن الکاتب نے ایک روایت پڑھی جو عمرو بن شعیب کے طریق سے مروی تھی، لیکن انھوں نے اسے عمرو بن سعید پڑھا۔ یہ سن کر امام صاحب نے نماز کی حالت میں سبحان اللہ کہا، ابو عبداللہ نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو عمرو پڑھ کر رک گئے۔ امام صاحب نے یہ سن کر یہ آیت تلاوت کی:

﴿ يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ﴾ [هود: ٨٧]

یہ سن کر ابو عبداللہ بن کاتب نے اپنی غلطی کی تصحیح کر لی۔[1] اس قسم کے واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کو اس فن میں کس قدر بصیرت حاصل تھی۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام دارقطنی کی یہ کتاب کتب خانہ محمودیہ اسکندریہ میں موجود ہے۔[2] اب یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہو گئی ہے اور ایک پانچویں جلد فہرست پر مشتمل ہے

اس فن پر لکھنے والے:

اس فن پر لکھنے والوں میں امام دارقطنی کے شاگرد حافظ عبدالغنی بن سعید المصری (م ۴۰۹ھ) سرفہرست ہیں۔ ان کی کتاب دراصل امام موصوف ہی کے

---

(1) تاریخ بغداد (۳۹/۳)

(2) مقالات سید سلیمان ندوی (۳۷۱/۲)

فرمودات کا مجموعہ ہے۔ ①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق انھوں نے اس فن پر دو کتابیں لکھیں ہیں: "مشتبه النسبه" اور دوسری "مشتبه الأسماء" جس کا نام "المؤتلف والمختلف في أسماء نقل الحديث" ہے۔ حافظ عبدالغنی اول الذکر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"أما بعد فإني لما صنفت كتابي في مؤتلف أسماء المحدثين ومختلفها فنظرت فإذا من ينسب منهم إلى قبيلة أو بلدة أو صنيعة قد يقع فيه من التصحيف والتحريف فيه مثل ما يقع في التحريف في الأسماء والكنىٰ التي حواها كتاب المؤتلف والمختلف الذي تقدم تصنيفي إياه قبل هذا الكتاب وغيره، فاستخرت الله تعالىٰ وألفت كتاباً في المنسوب منهم إلى قبيلة أو بلدة أو صنيعة يشتبه انتسابه في الخظ ويفترق في اللفظ والمعنىٰ على من ليس له بذلك وعلم ولا له به دراية إلخ" ②

امام عبدالغنی کی یہ دونوں کتابیں سب سے پہلے مولانا محمد محی الدین الزینی کے اہتمام سے ۱۳۲۷ھ میں مطبع انوار احمدی الٰہ آباد الہند سے شائع ہوئی ہیں۔

امام دارقطنی کی کتاب کا اختصار اور اس پر نقد و تبصرہ حافظ عبداللہ بن علی الرشاطی (م۵۴۲ھ) نے کیا، جس کا نام "الإعلام بما في المؤتلف والمختلف للدارقطني من الأوهام" رکھا۔

① مفتاح السنة (ص: ١٥٦)

② مقدمه مشتبه النسبة (ص: ٢) ظفر الأماني (ص: ٤٠) ومقدمه تحفة الأحوذي

ان کے علاوہ بھی بہت سے محدثین نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) نے امام دارقطنی اور حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ کی کتابوں کو یکجا جمع کیا اور اس میں بعض مقامات پر اضافہ بھی کیا اور اس کا نام "المؤتلف في تکملة المختلف" رکھا۔[1] اس کے علاوہ خطیب نے "تلخیص المتشابه" اور "تالي التلخیص" کے نام سے بھی کتابیں لکھی ہیں جو طبع ہوگئی ہیں۔ اس کے بعد امیر ابن ماکولا نے اس پر اضافہ کر کے ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام "الاکمال في رفع الارتیاب عن المؤتلف والمختلف من الأسماء والکنیٰ والأنساب" رکھا جو اپنے موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے۔ امیر ابن ماکولا اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"جب میں نے خطیب کی کتاب جو دارقطنی اور عبدالغنی کی "المؤتلف والمختلف" اور عبدالغنی کی "مشتبه النسبة" کا تکملہ ہے، دیکھی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے بہت سی ایسی باتوں سے بھی تعرض کیا ہے جنھیں ان دونوں نے ذکر نہیں کیا اور کبھی ان دونوں یا ایک کے کسی بیان کی تکرار کر جاتے ہیں اور کبھی ان دونوں کی تغلیط میں خود غلطی کر جاتے ہیں یا پھر ان دونوں کی واقعی غلطیوں پر متنبہ نہیں کرتے ہیں اور کبھی خود انھیں وہم ہو جاتا ہے تو میں نے مناسب جانا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کروں جو تمام کی جامع اور ان اسماء پر مشتمل ہو جو ان کتابوں میں مذکور نہیں اور جن اسما کے بارے میں کوئی اشکال نہیں، انھیں چھوڑ دوں اور جن میں وہم یا اختلاف ہو اسے صحیح طور پر بیان کر دوں۔"[2]

---

[1] الرسالة (ص: ۹۷)

[2] مقدمہ کتاب الاکمال لابن ماکولا۔

امام حمیدی رحمہ اللہ کا قول اس کتاب کی اہمیت سے متعلق پہلے گزر چکا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

ثم جمع الجميع أبو نصر ابن ماكولا في كتاب الإكمال استدرك عليهم في كتاب آخر فجمع فيه أوهامهم وبينها كتابه من أجمع من جمع في ذلك وهو عمدة كل حدث بعده"[1]

علامہ الکتانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"هو في مجلدين في غاية الإفادة وعليه اعتماد المحدثين وما يحتاج الأمير أبو نصر معه إلى فضيلة أخرى"[2]

اسی طرح مؤرخ ابن خلکان رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب الفاظ کے ضبط اور تقیید کرنے میں انتہائی سود مند ہے۔ محدثین نے اس پر اعتماد کیا ہے اور اس جیسی اور کوئی کتاب نہیں۔ نیز امیر کے فضل و مرتبت کے لیے یہی کتاب کافی ہے، جس سے ان کے وسعتِ علم، کثرتِ اطلاع اور ضبط و اتقان کا پتا چلتا ہے۔

امیر ابن ماکولا کی کتاب شیخ عبدالرحمان المعلمی کی تحقیق سے سات جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ شیخ المعلمی نے اس پر مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور اس فن کا خوب تعارف کروایا ہے۔ امیر ابن ماکولا نے امام دارقطنی، امام عبدالغنی اور خطیب کی کتابوں میں جو اغلاط و اوہام تھے، انھیں "تهذيب مستمر الأوهام" کے نام سے جمع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔ امیر ابن ماکولا کی الاکمال پر حافظ معین الدین رحمہ اللہ ابوبکر محمد بن عبدالغنی المعروف بابن نقطہ (م ۶۲۹ھ) نے ذیل لکھا

---

[1] شرح نخبة الفكر

[2] الرسالة (ص: ٩٧)

ہے۔علامہ الکتانی فرماتے ہیں:

”فذيله بما فاته أو تجدد بعده وهو ذيل مفيد في قدر ثلثي الأصل قال الذهبي وهو منبيء بإمامته وحفظه“[1]

یہ ذیل مع فہرست سات ضخیم جلدوں میں جامعہ ام القریٰ سے شائع ہو ہے۔

اس کے بعد حافظ جمال الدین ابن الصابونی (۶۸۰ھ) اور حافظ منصور بن سلیم (۶۷۳ھ) نے اس پر ایک ذیل لکھا، اسی طرح حافظ مغلطائی (۷۶۲ھ) نے بھی ایک ذیل لکھا، جس میں شعرا کے اسماء وانساب کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس میں اکثر اوہام ہیں، جیسا کہ علامہ الکتانی نے تصریح کی ہے۔

اسی موضوع پر حافظ ذہبی نے ایک کتاب ”المشتبه في أسماء الرجال“ لکھی جو ۱۸۶۳ء میں لندن سے شائع ہو چکی ہے، لیکن مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ الفاظ کا ضبط چونکہ قلم ہی سے کیا گیا ہے بنا بریں اس میں اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بعد میں اس پر استدراک لکھا، جس کا نام ” تبصير المنتبه في تحرير المشتبه“ رکھا، علامہ سیوطی تدریب الراوی میں فرماتے ہیں:

”فجاء شيخ الإسلام أبو الفضل ابن حجر فألف تبصير المنتبه بتحرير المشتبه فضمه وحرره وضبطه بالحروف واستدرك ما فاته في مجلد ضخم وهو أجل كتب هذا النوع“

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس کتاب کا قلمی نسخہ علامہ سورتی رحمہ اللہ کے کتب خانہ اور بانکی پور اور رام پور کی لائبریری میں موجود ہے، لیکن اب وہ چار جلدوں میں مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

[1] الرسالة (ص: ٩٧)

اس فن پر مشہور کتابیں ہیں، ان کے علاوہ اس موضوع پر یحییٰ بن علی المصری بن احمد (م ۷۰۵ھ)، عبدالرزاق المعروف بابن الفوطی (م ۷۲۳ھ) اور علامہ الماردینی (م ۷۵۰ھ) وغیرہ کی تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے۔

⑧ کتاب المدلسین:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''طبقات المدلسین'' کے مقدمہ میں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ تألیف کے اعتبار سے یہ کتاب تیسرے نمبر پر ہے۔ سب سے پہلے اس فن پر حسین بن علی الکرابیسی صاحب الشافعی ۲۴۸ھ کی تصنیف ہے۔ پھر اس کے بعد امام نسائی رحمہ اللہ نے کتاب لکھی۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ''حجاج بن ارطاۃ'' کے ترجمہ میں امام نسائی رحمہ اللہ کے ایک مجموعہ مدلسین کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کتاب المدلسین کے نام پر ایک رسالہ لکھا۔

ان کے بعد خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے ''التبیین لأسماء المدلسین'' میں مدلسین کو یک جگہ جمع کیا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بعد میں ان اسماء کو نظم کیا۔ ان کے بعد ان کے تلمیذ حافظ ابومحمود احمد بن المقدسی نے مدلسین کو ایک ارجوزہ میں جمع کیا۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابومحمود کے ارجوزہ کا خطی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی اس موضوع پر رسائل لکھے گئے ہیں، لیکن ان سب میں حافظ ابراہیم بن محمد حلبی (م ۸۴۱ھ) کا رسالہ ''التبیین لأسماء المدلسین'' اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''طبقات المدلسین'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق ''التبیین'' میں ۱۱۲ مدلس راویوں کا ذکر ہے۔ کافی دیر ہوئی کہ ہم نے اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھا تھا۔ حال ہی میں حضرت مولانا فیض الرحمان الثوری کی وساطت سے حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی رحمہ اللہ کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ ملا، جس میں تقریباً کل ۹۶ مدلسین کا ذکر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ حافظ ابن حجر کے رسالہ میں ۱۵۲ مدلسین کا ذکر ہے، لیکن اس کے باوجود بعض ایسے مدلس راوی بھی ملتے ہیں جن کا ذکر دونوں کتابوں میں نہیں ملتا۔ طبقات المدلسین میں بعض مقامات پر فحش خطی غلطیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں تو ''طبقات المدلسین'' کو دوبارہ منقح کر کے مع الزوائد شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ وما توفيقي إلا بالله

⑨ کتاب التصحیف:

معرفۃ علوم الحدیث کا ایک شعبہ تصحیف بھی ہے۔ محدثین کرام رحمہم اللہ اس سے واقفیت کے لیے خاص اہتمام کیا کرتے تھے، پھر بھی بقول امام احمد رحمہ اللہ کون ہے جو تصحیف و خطا سے بچ سکا ہو۔[1]

اس قسم کے مشکل اور ادق موضوع پر امام دارقطنی کی کتاب ان کی قدر و منزلت کو مزید اجاگر کرتی ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''له فيه تصنيف مفيد''[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ کو اس فن پر جس قدر عبور حاصل تھا، اس کا ذکر ہم امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اساتذہ کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ ان کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''انھوں نے اس کتاب میں ہر قسم کی تصحیف کا ذکر کیا ہے۔''

---

① تدريب الراوي

② تقريب

علامہ موصوف نے اس کی چند مثالیں بھی دی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ان کا ذکر ''تہذیب التہذیب'' میں عثمان بن محمد کے ترجمہ میں کیا ہے۔[1]

⑩ کتاب الأربعین:

حاجی خلیفہ، اسماعیل پاشا اور علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے امام عبداللہ بن المبارک الحنظلی کی کتاب کا ذکر ملتا ہے، ان کے علاوہ دیگر اہلِ علم نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

⑪ کتاب الأفراد:

محدثین کی اصطلاح میں افراد وغرائب ان حدیثوں کو کہتے ہیں جو اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ ہوں۔[2] اس کے علاوہ افراد کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے کہ ایک راوی ہی اسے روایت کرے یا ایک شہر ہی کے راوی ایک روایت کو بیان کرنے میں منفرد ہوں یا ایک راوی دوسرے راوی سے بیان کرنے میں منفرد ہو۔ اگرچہ کسی اور واسطے سے بھی وہ روایت مروی ہو۔[3]

حافظ دارقطنی رحمہ اللہ نے اسی موضوع پر ایک سو اجزا پر مشتمل ایک کتاب لکھی جو ''کتاب الافراد'' کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ الکتانی اور حاجی خلیفہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كتاب الأفراد لا يفهمه فضلا عن أن ينظمه إلا من هو من الحفاظ الأفراد وأئمة النقاد والجهابذة الجياد"[4]

---

① تہذیب التهذيب (١٥١/٧)

② بستان المحدثين (ص: ٥٧)

③ الرسالة (ص: ٩٥)

④ البداية

علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کتاب الافراد کو حروفِ معجم پر مرتب کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا ذکر حافظ مقدسی رحمہ اللہ کے ترجمہ میں یوں کیا ہے:

"له أطراف أفراد الدارقطني"[1]

حافظ الہیثمی نے غیلانیات، خلعیات، فوائد رازی اور افراد دارقطنی کو دو جلدوں میں فقہی ابواب پر جمع کیا ہے۔ علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حافظ سخاوی کے خط سے لکھا ہوا وہی مخطوطہ میں نے ایک جلد میں دیکھا ہے[2] اور کتاب الافراد کا قلمی نسخہ مکتبہ ظاہریہ مصر میں موجود ہے۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر نے اس کے اطراف کو جمع کیا جو "اطراف الغرائب والافراد" کے نام سے مطبوع ہے۔

(۱۲) کتاب غرائب مالک:

اس کتاب میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کی ان مرویات کو جمع کیا ہے جو موطا میں مذکور نہیں۔ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ضخیم کتاب ہے[3]

(۱۳) کتاب من حدث ونسي:

محدثین کی اس اصطلاح کی تفصیل یوں ہے کہ جب کوئی شیخ ایک روایت اپنے شاگردوں کو بیان کرے اور بعد میں خود اسے بھول جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ علمائے فن نے لکھا ہے کہ شاگردوں کے یاد دلانے سے اگر وہ انکار کر دے تو روایت بالاتفاق مردود ہوگی، ورنہ مقبول۔

---

[1] لسان المیزان (۲۱۰/۵)

[2] الرسالہ (ص: ۱٤٤)

[3] الرسالہ (ص: ۸٤)

امام دار قطنی رحمہ اللہ نے اس رسالہ میں اسی قسم کی روایات کو جمع کیا ہے، جس کا ذکر حافظ ابن حجر اور علامہ الکتانی رحمہما اللہ نے کیا ہے۔[1]

⑭ کتاب المستجاد:

حاجی خلیفہ نے اس کا ذکر کشف الظنون (۱۴۵۸/۲) میں کیا ہے۔

⑮ کتاب الامالی:

اس کا ذکر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔[2]

⑯ کتاب الرؤیة:

حاجی خلیفہ نے ''کشف'' اور اسماعیل پاشا نے ''هدية العارفين'' میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کتاب پانچ اجزا پر مشتمل ہے۔[3]

شیخ محمد یوسف نے ''الخطيب البغدادي و مؤرخ بغداد و محدثها'' میں اس کا نام ''كتاب رؤية الله تعالىٰ'' نقل کیا ہے، ممکن ہے کہ یہ کتاب علاحدہ ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم

⑰ کتاب المدبج:

اصطلاحِ محدثین میں روایت ''المدبج'' اور روایت ''الاقران'' میں ایک باریک فرق ہے، جس کی وضاحت یہاں ضروری ہے، تاکہ دونوں میں فرق اور اس کی اہمیت کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکے۔

چنانچہ دو ہم عصر محدث جب سن اور اسناد میں قریب قریب ہوں تو ان کی

---

[1] شرح نخبة الفكر (ص: ۹۳) الرسالہ (ص: ۷۶)

[2] دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۸۹/۹)

[3] كشف الظنون (۱۴۲۱/۲)

روایات دو حالتوں سے خالی نہیں ہوں گی۔

① ''المُدَبَّج'' (یہ میم کے ضمہ دال کے فتح اور با کی تشدید اور آخر میں جیم کے ساتھ پڑھا گیا ہے) یہ وہ روایت ہوتی ہے، جس میں دو ہم عصر ایک دوسرے سے روایت کریں اور یہ سلسلہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور اسی طرح تبع تابعین اور آخر سند میں بھی ہوتا ہو۔ جس کی چند امثلہ امام حاکم رحمہ اللہ نے ''معرفۃ علوم الحدیث'' (ص: ۲۱۵) میں دی ہیں۔ مثلاً عہدِ صحابہ کی مثال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب قال حدثنا الحسن بن علي بن عفان العامري قال ثنا أبو أسامة قال ثنا عبيد الله بن عمر عن محمد بن يحيىٰ بن حبان عن عبد الرحمٰن الأعرج عن أبي هريرة عن عائشة رضي الله عنهما قال: فقدت النبي ﷺ ذات ليلة من الفراش''

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لی ہے۔ اسی طرح امام زہری کا سیدنا عمر بن عبدالعزیز سے اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا امام زہری سے روایت کرنا ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کتاب المدبج میں اسی قسم کی روایات جمع کی ہیں۔ اس کا ذکر حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''تذکرۃ الحفاظ'' (۲۱۲/۳) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''لسان المیزان'' (۶۷/۴) اور شرح نخبۃ الفکر میں، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تدریب الراوی (ص: ۴۲۷) خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے تاریخ (۲۳۴/۷) میں اور علامہ القرطبی رحمہ اللہ نے ''احکام القرآن'' (۶۲۵/۶) میں کیا ہے۔

حافظ عراقی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اصولِ حدیث میں فن مدبج کا اضافہ سب سے پہلے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔[1] اور ان کی یہ کتاب ایک مبسوط جلد پر مشتمل ہے۔

[1] تدريب الراوي (ص: ٤٢٦)

④ الاقران: ایسی روایت کو کہتے ہیں جس میں دو ہم عصر محدث ایک حدیث کو ایک دوسرے سے روایت کریں، لیکن اس میں یہ تصریح نہ ہو کہ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اس سے روایت لی ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی بھی چند مثالیں ذکر کی ہیں۔[1] علامہ عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھار ایک روایت میں متعدد ہم عصر بھی ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں، مثلاً: ''امام احمد بواسطہ ابوخیثمہ زهير بن حرب عن يحيي بن معين عن علي بن المديني عن عبيد الله بن معاذ عن أبيه عن سعيد عن أبي بكر بن حفص عن أبي سلمة'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کرتے ہیں:

''كن أزواج رسول الله ﷺ يأخذن من شعورهن حتى تكون كالوفرة''[2]

اس روایت میں پہلے چار معاصر حضرات ایک ہی زمانے کے ہیں، جو ایک دوسرے سے روایت کر رہے ہیں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، جس کا ذکر عنقریب آ رہا ہے۔

⑱ كتاب القراءة:

امام دارقطنی رحمہ اللہ صرف حدیث ہی کے امام نہ تھے، بلکہ قرآن کے ساتھ بھی انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ ابن خلکان رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''وكان إماماً في علوم القرآن''[3]

---

① المعرفة (ص: ٢١٩)

② والحديث أخرجه مسلم (١/١٤٨)

③ وفيات الأعيان (٢/٢٦٠)

چنانچہ فنِ قراءت پر انھوں نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کی ابتدا میں چند ابواب ایسے ذکر کیے ہیں، جن میں اصول وقواعد کو بیان کیا ہے اور بعد کے مصنفین نے اس طریقے میں ان ہی کی پیروی کی ہے۔

علامہ ابن جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وألف في القراءة كتاباً جليلًا لم يؤلف مثله وهو أول من وضع أبواب الأصول قبل الفرش ولم يعرف مقدار هذا الكتاب إلا من وقف عليه“ [1]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”منها القراءة فإن له فيها كتاباً مختصراً موجزاً جمع الأصول في أبواب عقدها أول الكتاب وسمعت بعض من يعتني بعلوم القرآن يقول لم يسبق أبو الحسن إلى طريقته التي سلكها في عقد الأبواب المقدمة في أول القراءة وصار القراء بعده يسلكون طريقتهم في تصانيفهم“ [2]

زرکلی نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ اپنی آخر عمر میں بغداد میں لکھی تھی۔ [3]

(۱۹) كتاب القضاء باليمين مع الشاهد:

علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر ”الرسالۃ“ (ص: ۴۲) میں کیا ہے۔

(۲۰) كتاب الأخوة:

یہ بھی فنِ حدیث کا ایک اہم شعبہ ہے، چونکہ دو شخصیتوں کی ولدیت ا...

(1) غاية النهاية في طبقات القراء (١/٥٥٩)

(2) تاريخ بغداد (٣٤/١٢)

(3) أعلام (١٣/٥)

اشتراک کی بنا پر انھیں حقیقی بھائی سمجھنے یا نہ سمجھنے میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی بنا پر محدثین نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں امام علی بن مدینی، ابو داود، النسائی، ابوالعباس السراج رحمہم اللہ کی کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ ابن فطیس رحمہ اللہ نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کی اس کتاب کا ذکر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الاصابہ'' (۸/ ۵۹) اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تدریب الراوی'' (ص: ۵۱۲) میں مختصرین کی بحث کے تحت کیا ہے۔

(۱) كتاب الفوائد المنتخبة العوالي من الشيوخ الثقات:

اس کا نسخہ دارالکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے۔

(۲) كتاب الرمي و النضال:

شیخ محمد یوسف نے اس کا ذکر ''الخطيب البغدادي ومؤرخ بغداد و محدثها'' (ص: ۹۶) میں کیا ہے۔

(۳) مسند أبو حنيفة:

ایضاً (ص: ۹۷)۔

(۴) تسمية من روى عن أولاد العشرة:

ایضاً (ص: ۱۰۸)۔

(۵) كتاب الأسخياء:

رسالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اس میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ان روایات کو جمع کیا ہے جو سخیوں کی نسبت مروی ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال پارٹ

ا ...ریث کلکتہ کے اہتمام سے اپریل ۱۹۳۶ء میں طبع ہو چکی ہے۔[1] شیخ محمد یوسف
...نذوری نے اس کا نام کتاب الاجواد ذکر کیا ہے۔ ایضاً (ص: ۱۰۴)

(۲۶) سؤالات البرقاني:

ایضاً (ص: ۹۶) یہ کتاب طبع ہو گئی ہے۔

(۲۷) سؤالات حمزہ عن الدارقطني:

الاعلان بالتوبیخ (ص: ۲۳۱) مطبوع۔

(۲۸) سؤالات الحاکم عن الدارقطني:

"لسان المیزان" (۱/ ۱۹۸) التنکیل (۱/ ۱۹۹) مطبوع۔

(۲۹) سؤالات السلمی:

"لسان" (۲/ ۲۴۸) مطبوع۔

سؤالات السلمی کا قلمی نسخہ استنبول کے مکتبہ میں موجود ہے۔ جس کے ۱۶ و...ق ...ہیں اور بخط ابوبکر بن علی بن اسماعیل الانصاری الشافعی ہے اور سنِ نسخ ۷۲۸ھ ہے۔[2]

(۳۰) کتاب الرواۃ عن مالک:

"لسان المیزان" (۴/ ۱۳۰۔۲۵۴)۔ عمدۃ القاری (۲/ ۱۸) الاعلان بالتوبیخ (ص: ۲۳۶)۔

(۳۱) کتاب المجتبیٰ:

امام ولی الدین ابوعبداللہ محمد رحمہ اللہ بن عبداللہ الخطیب نے مشکاۃ المصابیح ... کے "...ب المشي بالجنازة والصلاة عليها" کی آخری حدیث کو ذکر کرنے ... کے

[1] ...مجلہ (معارف: ٤) (ج: ۳۷)

[2] ...مقدمہ طبقات الصوفیہ للسلمي (ص: ۳۹)

بعد لکھا ہے: رواه الدارقطني في المجتبیٰ.

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے شرح مشکاۃ میں اسے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مستقل تصنیف قرار دیا ہے۔ لیکن مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ نے مرعاۃ المفاتیح میں (۲/۴۹۶) میں سے کتاب السنن ہی کا دوسرا نام بتلایا ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی درست ہے۔ ملاحظہ ہو: مشکاۃ البانی (۱/۵۳۳)

۳۲ معرفة مذاهب الفقهاء:

حاجی خلیفہ نے کشف (۲/۱۷۳۹) اور اسماعیل پاشا نے ہدیۃ العارفین (۱/ ۶۸) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۳ رجال بخاري:

ظفر الامانی (ص: ۳۸)۔

۳۴ المعرفة بالأدب والشعر:

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے تاریخ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز امام دارقطنی رحمہ اللہ کے قصائد کا ذکر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے النہایہ (۲/۱۴) میں کیا ہے۔

۳۵ کتاب الموطآت:

النکت لابن حجر قلمی (ص: ۲۰۹) فتح الباری (۱/۲۲۰)۔

۳۶ الجهر ببسم الله:

نصب الرایہ (۱/۳۳۵)۔

۳۷ کتاب فضائل الصحابة:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری (۲/۱۱۶) مطبع دہلی میں اس کا ذکر

یا ہے۔ بحوالہ ''بینات'' (اگست ۱۹۶۳ء)

(۳۸) الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر:

علامہ ابوعبداللہ المقدسی نے الآداب الشرعیہ (۱/ ۱۷۷) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۳۹) کتاب السنة:

تہذیب التہذیب (۶/ ۱۱۶) عمدۃ القاری (۷/ ۱۹۸)۔

(۴۰) مسند مالک:

کشف الظنون۔

(۴۱) غریب اللغة:

ہدیۃ العارفین (۱/ ۶۸۴) حضرت نواب صدیق حسن رحمہ اللہ نے ''البلغہ فی اصول اللغۃ'' (ص: ۱۰۸) اور حاجی خلیفہ نے کشف (۱/ ۱۴۵۸) میں لکھا ہے کہ محمد بن طاہر المقدسی نے اس کے اطراف بھی لکھے ہیں۔ لیکن حافظ مقدسی رحمہ اللہ کے اطراف ''الافراد'' پر ہیں، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ شاید حاجی خلیفہ سے وہم ہو گیا ہو۔ واللہ أعلم

(۴۲) الرباعیات:

اس میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کی رباعیات کو جمع کیا ہے۔

الرسالة (ص: ۸۲) کشف الظنون۔

(۴۳) کتاب الأقران:

لسان المیزان (۵/ ۴۳۶)۔

(۴۴) ذيل علی تاریخ البخاري:

ایضاً (۵/ ۴۳۷) الاعلان بالتوبیخ (ص: ۲۲۰) یہ ذیل صرف محمدون سے خاص ہے۔

۴۵ ذیل علی ثقات ابن حبان:

اس کا ذکر علامہ الکتانی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔

۴۶ نتخاب أحادیث البربهاری:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لسان المیزان میں البربہاری کے ترجمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴۷ کتاب المساجد:

ہدیۃ العارفین (۱/۶۸۴)۔

۴۸ ذکر التابعین ومن بعدهم ممن صحت روایته عند البخاري ومسلم

مجلّہ بینات جمادی الاخریٰ ۱۳۸۸ھ۔

۴۹ الأحادیث التي خولف فیها إمام دار الهجرة مالک بن أنس:

اس میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کی ان روایات کو جمع کیا ہے، جن میں امام مالک رحمہ اللہ کی مخالفت کی گئی ہے۔ علامہ ابن خیر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب اب چھپ گئی ہے۔

۵۰ أحادیث أبي إسحاق إبراهیم بن محمد بن یحییٰ المزکی النیسابوري:

فهرست ما رواه عن شیوخه لابن خیر (ص: ۱۸۰).

۵۱ مقدمه کتاب الضعفاء والمتروکین من المحدثین:

ایضاً (ص: ۲۰۹) نیز کہا ہے کہ یہ ایک جز میں ہے۔

۵۰ کتاب الذبح:

فتح الباری (۴/۱۵۶، کتاب الصیام) ممکن ہے کہ صحیح کتاب المدبج ہو، جس کا

ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کیوں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جس روایت کونقل کیا ہے وہ بطریق "عبد الله بن المبارك عن سعيد بن عامر الضبعي عن أشعث عن الحسن" ہے۔ عبداللہ بن مبارک اور سعید الضبعی معاصر ہیں، البتہ سعید الضبعی کا ابن المبارک سے روایت کرنا محلِ نظر ہے۔ واللہ أعلم

۵۳ المستخرج على الصحيح:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الحفاظ (۲/۷۵ ۲) میں اس کا ذکر یوں کیا ہے۔

"وقد احتج به عامة من خرج الصحيح كالإسماعيلي والدارقطني"

ممکن ہے کہ یہ الالزامات ہی کا دوسرا نام ہو، کیوں کہ ان دونوں کا مضمون بظاہر ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم

۵۴ الغيلانيات:

لسان المیزان (۲/۳۶۸) الرسالة المستطرفہ (ص: ۸۷) زرکلی (۷/ ۲۰) تاج العروس (۸/۵۴)۔

۵۵ شيوخ البخاري:

تہذیب التہذیب (۱/۸۵) و (۴/۳۳۵)۔

۵۶ الرواة عن الشافعي:

ایضاً (۱/۹۰)

۵۷ شيوخ الشافعي:

اس کا ذکر امام بیہقی رحمہ اللہ نے "كتاب بيان الخطأ من أخطأ على الشافعي" میں کیا ہے۔

۵۸ أحادیث النزول:

جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہر رات آسمانِ دنیا پر آنے کی روایات کو جمع کیا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ﴾ [آل عمران: ١٧] الآیۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"وقد أفرد الحافظ أبو الحسن الدارقطني في ذلك جزأ على حدة فرواه من طرق متعددة"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

"قاله في كتاب السنة له في أحاديث النزول"[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے شرح حدیث النزول (ص: ۵۱) میں بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب اب شائع ہوگئی ہے۔

۵۹ أحادیث الموطأ واتفاق الرواۃ عن مالک واختلافهم فيها زيادۃ ونقصاً:

الموطأ جو امام مالک رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ہے، اس کے متعدد نسخوں کی بنا پر ان میں جو اختلاف تھا امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے متفق علیہ اور مختلف فیہ روایات کی اس میں نشاندہی کی ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ذكر ما أسند مالك مما روى عنه في الموطأ على اختلاف الرواة عنه فيه بذكر اختلافهم واتفاقهم وانفراد بعضهم

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/۳۵۳)

[2] تہذیب (۶/۱۱۶)

عن بعض بالرواية عنه دون غير الموطأ من حديثه"[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے امام مالک رحمہ اللہ کے شیوخ کے اعتبار سے ان روایات کو ذکر کیا ہے اور اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس سے امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں کتنی اور کہاں کہاں روایات لی ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی یہ کتاب شیخ محمد زاہد کوثری کی کوشش سے مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

⑥⓪ حاشية سنن الدارقطني للدارقطني:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حاشیہ کا ذکر لسان المیزان (٤/١٢٣-٥٢) اور تہذیب التهذیب میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ التلخیص الحبیر (ص ٥٦) وغیرہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

⑥① شیوخ مسلم:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب التہذیب (٩/١٠٠) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

⑥② تعليقات الدارقطني على المجروحين لابن حبان:

یہ کتاب پہلے المجروحین جلد اول مطبوعہ ہند کے حاشیہ میں شائع ہونی شروع ہوئی تھی، مگر یہ طبع مکمل نہ ہو پائی۔ اب یہ علیحدہ شیخ خلیل بن محمد العربی کی تحقیق سے شائع ہو گئی ہے۔

یہ ہیں امام دارقطنی رحمہ اللہ کی وہ گراں قدر تصانیف جن کا علم سردست ہمیں تتبع و تلاش سے ہوا۔ نامعلوم ان کے علاوہ کس کس موضوع پر کتنی اور کس قدر تالیفات کی ہوں گی۔ علامہ عراقی رحمہ اللہ ان کی تصنیفات کے متعلق لکھتے ہیں: "وله مصنفات يطول ذكرها" اور اسی پر ہم اس داستان کو ختم کرتے ہیں۔

---

[1] أحاديث الموطأ واتفاق الرواة عن مالك الخ (ص: ٨)

دکتور موفق بن عبداللہ نے المؤتلف کے مقدمہ میں امام دارقطنی کی ۸۲ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر یہ فہرست بھی مکمل نہیں، اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً:

① ثناء الصحابة على القرابة وثناء القرابة على الصحابة:

حافظ ابن تیمیہ نے اس کا ذکر منہاج السنۃ (۴/۱۰۵) میں کیا ہے۔

② الأجواد:

شیخ ابن دحیہ نے اس کا ذکر "الآيات البينات في ذكر ما في أعضاء رسول الله ﷺ من المعجزات" (ص: ٤٢٢) میں کیا ہے۔

③ بعض أحاديث المقلين من أبناء المكثرين وبعض أحاديث المكثرين عن آبائهم المقلين وعن إخوانهن المقلين:

اس کا ذکر علامہ ابن دقیق العید نے "الإمام" (٥٤/٢) میں کیا ہے۔

④ أحاديث أبي بردة بريد بن عبد الله بن أبي بردة:

بحوث تاريخ السنة المشرفة (ص: ٢٢٦)

وفات:

مشہور روایت کے مطابق آپ ذیقعدہ ۳۸۵ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔[1] إنا لله وإنا إليه راجعون

نمازِ جنازہ شیخ ابو حامد الاسفرائنی نے پڑھائی اور باب الدیر میں معروف

[1] حضرت النواب رحمہ اللہ نے إتحاف النبلاء میں ان کی وفات ۳۳۵ھ ذکر کی ہے، جس پر صاحب ابراز الغی نے تعاقب کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ حضرت النواب رحمہ اللہ نے یہ سن صاحبِ کشف سے نقل کیا ہے، لہٰذا ان پر اس قسم کے تعاقب بے جا ہیں۔ مزید برآں یہ کہ صاحب ابراز نے اقرار بھی کیا ہے: "إن الناقل من حيث أنه ناقل لا يرد عليه شيء" إبراز الغي (ص: ٤١) تفصیل کے لیے دیکھیے: "تبصرة الناقد" (ص: ۸۳)

کرخی رحمہ اللہ کی قبر کے نزدیک سپردِ خاک کر دیے گئے۔ اللّٰھم نور ضریحه

امیر ابن ماکولا رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں نے رمضان المبارک میں ایک خواب دیکھا کہ میں کسی سے امام دارقطنی رحمہ اللہ کے متعلق سوال کر رہا ہوں کہ آخرت میں ان کے ساتھ کیا گزری۔ تو اس نے جواب دیا کہ انھیں جنت میں امام کے لقب سے بلایا جاتا ہے۔ هذا آخر ما أردت تسويده في هذه المقالة الوجيزة.

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَ الْأَرْضِ اَنْتَ وَلِيِّ فِيْ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ.

آمين يارب العالمين

۱۸ر جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ

ارشاد الحق

عفا الله عنه وعن والديه وأساتذته وإخوانه أجمعين.

مصادر و مآخذ

① راز الغي ② إتحاف النبلاء

③ احاديث الموطأ و اتفاق
ا رواة عن مالك ④ أحسن الكلام

⑤ لإصابة في معرفة الصحابة ⑥ الأعلام

⑦ لإعلان بالتوبيخ ⑧ الآداب الشرعية

⑨ لإكمال في أسماء الرجال ⑩ إيضاح المكنون

⑪ لأنساب للسمعاني ⑫ البدر الطالع

⑬ بداية ⑭ الباعث الحثيث

⑮ بلغة في أصول اللغة ⑯ بستان المحدثين

⑰ تذكرة الحفاظ ⑱ تدريب الراوي

⑲ اريخ بغداد ⑳ تهذيب التهذيب

㉑ تقريب التهذيب ㉒ التقريب للنووي

㉓ تعليق المغني ㉔ التلخيص الحبير

㉕ التذنيب ㉖ التنكيل بما في تأنيب الكوثري
من الأباطيل

㉗ لتبيين لأسماء المدلسين ㉘ تاج المكلل

٢٩ تفسير أحكام القرآن (القرطبي)
٣٠ تصحيح النظر شرح شرح نخبة الفكر
٣١ تفسير ابن كثير
٣٢ تبصرة الناقد
٣٣ تفسير مظهري
٣٤ تلخيص المستدرك
٣٥ تاريخ أدب العرب
٣٦ تقويم تاريخى
٣٧ توجيه النظر
٣٨ التاريخ الكبير
٣٩ الجامع الصحيح للبخاري
٤٠ الجامع الصحيح لمسلم
٤١ الجامع الصغير
٤٢ خلاصة تذهيب الكمال
٤٣ الرسالة المستطرفة
٤٤ رجال كشي
٤٥ الرفع والتكميل
٤٦ الرد على البكرى
٤٧ دائرة المعارف الإسلامية
٤٨ ذيل لحظ الألحاظ
٤٩ سنن الدارقطني
٥٠ سنن أبي داود
٥١ شرح مشكاة للألباني
٥٢ شرح حديث نزول
٥٣ شرح نخبة الفكر
٥٤ شذرات الذهب
٥٥ الصارم المنكي
٥٦ طبقات الشافعية
٥٧ طبقات المدلسين
٥٨ ظفر الأمانى
٥٩ عمدة القاري
٦٠ العبر في خبر من غبر
٦١ عجاله نافعه
٦٢ علوم الحديث
٦٣ غاية النهاية في طبقات القراء
٦٤ فيض القدير للمناوي
٦٥ فتح الباري
٦٦ فهرسة الخزانة التيمورية

- ٦٧ فتح المغيث للسخاوي
- ٦٨ فتح المغيث للعراقي
- ٦٩ الفهرسة لابن خير
- ٧٠ فهرسة دار الكتب المصرية
- ٧١ الفوز الكرام (قلمي)
- ٧٢ فيض الباري
- ٧٣ الفوائد البهية
- ٧٤ فتوىٰ شيخ الإسلام ابن تيمية
- ٧٥ قواعد التحديث
- ٧٦ كشف الظنون
- ٧٧ كتاب الإلزامات (قلمي)
- ٧٨ كتاب التتبع (قلمي)
- ٧٩ الكفاية
- ٨٠ كتاب العلل للدارقطنى (قلمي)
- ٨١ كتاب الكنى للدولابي
- ٨٢ كتاب بيان الخطأ من أخطأ على الشافعي
- ٨٣ كتاب الموضوعات
- ٨٤ كتاب الضعفاء والمتروكين للنسائي
- ٨٥ لسان الميزان
- ٨٦ اللآلئ المصنوعة
- ٨٧ لحظ الألحاظ
- ٨٨ مقدمه تحفة الأحوذي
- ٨٩ المستدرك
- ٩٠ مجلّہ برہان
- ٩١ مقدمة فتح الباري
- ٩٢ مقدمة التعليق الممجد
- ٩٣ مقدمه التعليق المغني
- ٩٤ مقدمه فيض الباري
- ٩٥ مقدمه ابن الصلاح
- ٩٦ مسك الختام
- ٩٧ معرفة علوم الحديث
- ٩٨ ميزان الاعتدال
- ٩٩ من تكلم فيه وهو موثق (قلمي)
- ١٠٠ مجلّہ معارف (ج ٣٦)
- ١٠١ مقالات سيد سليمان ندوی
- ١٠٢ مفتاح السنة

(١٠٣) مقدمه مشتبه النسبة

(١٠٤) مقدمة الإكمال لابن ماكولا

(١٠٥) مقدمه طبقات الصوفيه (للسلمى)

(١٠٦) مرقاة شرح مشكاة

(١٠٧) مرعاة المفاتيح

(١٠٨) مشكاة المصابيح

(١٠٩) مجله بينات ١٣٨٨ھ

(١١٠) موطأ إمام مالك

(١١١) معجم البلدان

(١١٢) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم

(١١٣) مفتاح السعادة

(١١٤) منهاج السنة النبوية

(١١٥) مشتبه النسبة

(١١٦) موارد الظمآن

(١١٧) مقدمه كتاب العلل لابن أبي حاتم

(١١٨) نصب الراية

(١١٩) نيل الأوطار

(١٢٠) النكت لابن حجر (قلمي)

(١٢١) النهاية لابن كثير

(١٢٢) وفيات الأعيان

(١٢٣) هدية العارفين

(١٢٤) سنن الترمذي

(١٢٥) صحيح ابن حبان (قلمي)

(١٢٦) تنزيه الشريعة

علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ

سرزمینِ سندھ کو برصغیر پاک و ہند کا باب الاسلام ہونے کا فخر حاصل ہے۔ محمد بن قاسم رحمہ اللہ کے فیصلہ کن حملے سے لے کر آج تک ہر دور میں یہ خطہ علما و فضلا کی آماجگاہ بنا رہا اور ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنھیں آفاقی شہرت نصیب ہوئی۔ انھی میں سے ایک حضرت شیخ محمد حیات سندھی ثم المدنی رحمہ اللہ ہیں، جنھیں کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ''سندھ میں علمِ حدیث'' کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

نام و نسب:

اسم گرامی محمد حیات ہے، والدِ مکرم کے نام میں تذکرہ نویسوں نے اختلاف کیا ہے۔ مولانا سید عبدالحی رحمہ اللہ اور علامہ المرادی رحمہ اللہ نے ''ابراہیم'' لکھا ہے،[1] مگر مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رحمہ اللہ کے استفسار پر آپ نے اپنے والد کا نام ''فلاریہ'' بتلایا۔[2] حضرت النواب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[3] ممکن ہے کہ اصل نام یہی ہو اور ابراہیم بعد میں رکھ لیا گیا ہو۔ آپ سندھ کے ''چاچڑ'' نامی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

---

[1] نزهة الخواطر (٦/٣٠١) سلك الدرر (٤/٣٤)

[2] مآثر الكرام (ص: ١٤٤)

[3] أبجد العلوم (٨٩٤) اتحاف النبلاء (ص: ٤٠٣) تقصار جيود الأحرار (ص: ٢٢٤)

مولد و مسکن اور ابتدائی حالات:

تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ سندھ کے علاقہ بکر[1] کے اطراف میں عادل پور نامی ایک گاؤں میں آپ پیدا ہوئے۔ بعض نے بکر کو بھکر بھی لکھا ہے۔ معروف سیاح محمد ابن بطوطہ جب ۷۳۴ھ میں سندھ کی سیاحت کے لیے آئے تو وہ یہاں بکر بھی پہنچے جسے انھوں نے ''بکار'' لکھا ہے، جیسے ''اوچ'' کو ''اوجہ'' لکھا ہے اور قاضی ابو حنیفہ، شیخ شمس الدین محمد شیرازی اور شیخ صدر الدین حنفی رحمہم اللہ سے ملاقات کی۔[2] ان دنوں سندھ میں ضلع سکھر تعلقہ گھوٹکی سے تقریباً سات آٹھ میل دور جنوب کی طرف عادل پور نام کا ایک چھوٹا سا قدیمی قصبہ ہے اور غالباً اسی ''عادل پور'' کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس میں آج بھی درس گاہ کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس کے گرد و نواح میں علامہ سندھی رحمہ اللہ کی قوم چاچڑ کی بستیاں آج بھی موجود ہیں۔ واللہ أعلم

سنِ پیدائش میں تذکرہ نگار خاموش ہیں، بلکہ آپ کے ابتدائی حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ سندھ کے دیہات کا یہ نوجوان کسی دن علم کا درخشاں ستارہ ہوگا۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ سنِ شعور کو پہنچتے ہی علم کے حصول کے لیے سندھ کے مردم خیز اور تاریخی شہر ٹھٹھہ میں چلے گئے اور علامہ محمد معین (م ۱۱۶۱ھ۔ تلمیذ شاہ ولی اللہ و مصنف ''دراسات اللبیب'') سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔[3] ... ے

---

[1] ''بکر'' کو موجودہ علاقہ تھل میں ''بھکر'' سمجھنا قطعاً غلط اور تاریخی شواہد کے منافی ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

[2] رحلة ابن بطوطه (۸/۲) مولانا سید عبدالحی نے ان اکابر کا ذکر نزهة الخواطر میں ابن بطوطہ کے حوالے ہی سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں علی الترتیب (۲/ ۷۷، ۱۴۹، ۶۳)

[3] نزهة الخواطر (۳۰۱/۶) وغیرہ۔

تعجب کی بات ہے کہ تذکرہ نویسوں نے یہاں صرف علامہ محمد معین کا نام ہی لیا ہے، حالانکہ ٹھٹھہ اس دور میں علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ لہٰذا یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ علم کا شیدائی وہاں پہنچے اور صرف ایک استاد سے ملاقات پر اکتفا کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حجازِ مقدس کا رخ کیا۔ سب سے پہلے حج کیا، پھر مدینہ طیبہ پہنچ کر شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی (م ۱۱۳۴ھ) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم (م ۱۱۴۵ھ) شیخ حسن بن علی العجیمی وغیرہ سے استفادہ کیا، مگر حدیث پاک کا زیادہ تر درس اپنے ہی ہم وطن اور وقت کے معروف شیخ علامہ ابو الحسن محمد بن عبدالہادی سندھی ثم المدنی (م ۱۱۳۹ھ) سے لیا۔[1] اور انہی کے فیضِ صحبت سے علمِ حدیث میں تبحر حاصل کیا۔

مدینہ طیبہ کا توطن اور استاد کی جانشینی:

تحصیلِ علم کے بعد مدینہ طیبہ ہی کو اپنا مسکن بنایا اور اپنے شیخ ابو الحسن سندھی رحمہ اللہ کے بعد مسندِ تدریس کو رونق بخشی اور پورے ۲۴ سال توکلاً علی اللہ حدیث پاک کا درس دیتے رہے اور بقیہ زندگی اسی مبارک علم کی خدمت میں صرف کر دی اور یوں شیخ کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

سید عبدالحی لکھتے ہیں:

"ولازم الشيخ الكبير أبا الحسن محمد بن عبد الهادي السندي المدني وأخذ عنه وجلس مجلسه بعد وفاته أربعاً وعشرين سنة"[2]

گویا مدینۃ الرسول میں عمرِ عزیز کا باقی حصہ حدیثِ رسول پڑھانے میں صرف

---

[1] نزهة الخواطر، اتحاف وغیرہ.

[2] نزهة الخواطر (۳۰۱/٦)

کیا۔ ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب نے انگریزی میں ایک مقالہ لکھا ہے جس کا ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور نے اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور مترجم جناب شاہد حسین صاحب رزاقی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف علامہ سندھی کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

''محمد حیات اپنے والد ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد دارالشفا کے صدر معلم ہوئے۔''

اصل مقالے تک تو ہماری رسائی نہیں ہو سکی، نامعلوم علامہ ابوالحسن سندھی رحمہ اللہ کو علامہ حیات سندھی رحمہ اللہ کا والد قرار دینا ڈاکٹر صاحب موصوف کی غلطی ہے یا مترجم کی، اس کے علاوہ بھی ترجمہ شدہ کتاب میں کافی اغلاط ہیں جو ادارہ ثقافت کی ثقاہت کے منافی ہیں۔

جلالتِ شان:

اہلِ علم نے بالاتفاق علامہ سندھی رحمہ اللہ کے علم و فضل، ورع و تقویٰ کا اعتراف کیا ہے اور ان کی تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاگرد سے بڑھ کر استاد کی خوبیوں یا کمزوریوں سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ ان کے تلامذہ نے اپنے لائق استاد کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا، وہ آج بھی ان کی تصانیف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علامہ محمد فاخر زائر اِلٰہ آبادی (م۱۱۶۴ھ) کی عقیدت کیشی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

باد بر روئے صفحۂ دوراں — محفل آرائے حلقۂ انسار
شیخ الاسلام عصرِ علامہ — در فنون حدیث فہامہ
نو شگاف دقائق ایماں — راز دان حقائق ایماں
رستہ از حبسِ ربقہ تقلید — بستہ براجتہاد رائے مزید

در رِ فرمائے مسجدِ نبوی بطریقِ رشیق مصطفوی!!
آں محمد حیات بخت بلند بحدیث نبی قوی پیوند!
متّع اللہ زمرۃ الاعیان بافاداتہ علی الازمان
سرِ من خاکپائی اوبادا جان من در رضائی اَو بادا [1]

ان کے ایک دوسرے مشہور شاگرد اور معروف مورخ مولانا آزاد رحمہ اللہ بلگرامی فرماتے ہیں:

از علما ربانین و عظماء محدثین است [2]

مولانا آزاد بلگرمی مزید فرماتے ہیں:

''(شیخ محمد حیات) درسِ حدیث کے لیے کمربستہ ہوئے اور ارشاداتِ نبوی کی خدمت میں عمر صرف کر دی۔ نمازِ فجر کے بعد مسجدِ نبوی میں وعظ فرماتے اور اس بہترین وقت میں سعادت مندوں کا ہجوم ہوتا جو ان کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ عرب و عجم کے لوگ وسیع تعداد میں ان سے مستفید ہوتے۔ ان کے چشمۂ صافی سے تشنگانِ فیض کی ایک بڑی جماعت سیراب ہوئی اور بلند ہمت حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ مکہ، مدینہ، مصر، شام، روم اور ہندوستان کے اطراف سے لوگ انتہائی عقیدت اور نیاز مندی کے جذبات سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان کی علمی برکات سے متمتع ہوتے اور گوناگوں فیوض و برکات سے اپنا دامنِ طلب بھرتے۔'' [3]

---

[1] نحاف (ص:۴۰۴)

[2] ثر الکرام (ص:۱۴۴) سبحۃ المرجان (ص:۹۶)

[3] سبحۃ المرجان (ص:۹۶) و ماثر الکرام

حضرت نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شیخ محمد حیات سندھی محدث مجتہد مدنی رحمہ اللہ از علما ربانیین و عظماء محدثین است۔'' (1)

مولانا سید عبدالحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''الشيخ الإمام العالم الكبير المحدث محمد حيات بن إبراهيم السندي المدني أحد العلماء المشهورين'' (2)

علامہ محمد عابد سندھی لکھتے ہیں:

''كان عالماً عاملاً زاهداً ورعاً صوفياً عاملاً بالسنة متبرياً عما عليه المذاهب من الجمود على المذهب''

ان کے تلامذہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''أما الآخذون عنه فعدد لا يحصى من أهل الحرمين واليمن والمشرق والشام والمغرب والسند والهند'' (3)

جناب شیخ محمد اکرام صاحب اپنے ''سلسلۂ کوثر'' میں لکھتے ہیں:

''آپ کا شمار اپنے زمانے کے نامور محدثوں میں ہوتا ہے آپ مسجدِ نبوی میں صبح کی نماز کے بعد درسِ قرآن و حدیث دیتے اور ایک جمِ غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔'' (4)

علامہ محمد بن جعفر الکتانی نے انھیں حامل لواء السنۃ بالمدینۃ المنورۃ کے لقب

---

(1) ۔قصار (ص: ٢٢٤)

(2) ۔ہۃ (٢/٣٠١)

(3) ۔راجم الشیوخ

(4) ۔۔۔کوثر (ص: ٥٩٦)

ت ٠ کیا ہے۔[1]

ن کے زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ ان تلمیذ رشید شیخ عبدالقادر الکوکبانی فرماتے ہیں

"صحبته زمناً طويلاً لم أسمعه يتكلم بمباح"

"میں نے ان کی طویل صحبت پائی میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے مباح کلام کیا ہو۔"[2]

مسلک:

بعض حضرات نے علامہ سندھی کو حنفی مسلک کے اعیان و اکابر میں شمار ہے[3] مگر یہ صحیح نہیں۔ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف رحمہ اللہ کا یہ فرمان طور ر صحیح معلوم ہوتا ہے:

"اس دور کے عام حالات کے مطابق ابتداءً گو حنفی طریقے پر گامزن ہوں گے، لیکن محقق علمائے حدیث و فقہ کے فیضِ تربیت اور علومِ حدیث میں براہِ راست ممارست کی وجہ سے بالآخر تحقیق کی راہ پسند کر لی اور تقلید سے دست بردار ہو گئے۔ جیسا کہ آپ کی تالیفات سے اندازہ ہوتا ہے۔"[4]

علامہ سندھی کے دور کا جائزہ لیں اور ان کے افکار کو ملاحظہ فرمائیں تو آ ـ ار لی تائید کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ معروف معنوں میں قطعاً "حنفی" نہیں تھے۔ چنا نچہ موصوف نے اپنے ایک رسالے میں مقلدین کے اندازِ فکر کو بیان کرتے ہو ئے لکھا ہے:

---

[1] رسالة المستطرفة (ص: ١٤٨)

[2] فهرس الفهارس (١/ ٣٥٦)

[3] مقدمه نصب الرايه (ص: ٤٩) فهرس الفهارس لكتاني (ص: ٣٥٦)

[4] مقدمة الايقاف

''انتہائی تعجب کی بات ہے کہ جب حضرات مقلدین کو کسی صحابی کا قوا
صحیح حدیث کے معارض نظر آتا ہے اور اگر اس کا کوئی محمل نہیں پاتے
کہتے ہیں کہ یہ حدیث انھیں نہیں پہنچی اور جب کوئی حدیث ان کے اما
کے قول کے مخالف نظر آتی ہے تو اس کی تاویل کرتے ہیں اور محامل بعی
پر محمول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات تو تاویل کے بجا
تحریف سے کام لیتے ہیں، لیکن اگر انھیں کہا جائے کہ شاید تمھارے امام
یہ حدیث نہیں پہنچی تو کہنے والے پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور اس
انتہائی طعن و تشنیع کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور بدکردار لوگوں میں اس کا شہ
ہونے لگتا ہے۔''

نیز فرماتے ہیں:

''عقل مند کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی
اور ان کے رفقائے کرام کے متعلق تو جائز سمجھتے ہیں کہ ''انھیں حدی
نہیں پہنچی'' مگر ''ائمہ مذاہب'' کے متعلق یہ قول سننا اور کہنا پسند نہی
کرتے۔ حالانکہ دونوں کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ حضرا
کتبِ حدیث کا مطالعہ اور اس کی تدریس اس لیے نہیں کرتے کہ اس
عمل کریں، بلکہ ان کا مقصدِ وحید یہ ہوتا ہے کہ اپنے امام کے دلائل کا
لگائیں۔ جو حدیث ان کے قول کے مخالف ہو اس کی تاویل کریں ا
جہاں تاویل نہیں ہوسکتی وہاں کہہ دیتے ہیں ہمارے امام ہم سے زیا
عالم تھے۔ کیا وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہوئے ا
کی حجت اپنے پر قائم کرتے ہیں۔ عالم اور جاہل کا معاملہ برابر نہیں

جب حدیث ان کے امام کے موافق ہو تو خوش ہوتے ہیں اور جب مخالف ہو یا غیر کے مذہب کے موافق ہو تو ان کے دل سکڑ جاتے ہیں کیا انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ﴾ [النساء: ٦٥][1]

اندازہ فرمائیے کہ علامہ سندھی نے کس دل سوزی سے اپنے زمانے کے مقلدین کے خیالات و حالات بیان کرتے ہوئے ان کے کردار پر ماتم کیا ہے۔ پورا رسالہ اسی قسم کے جذبات کا ترجمان ہے اس وضاحت کے بعد بھی انھیں معروف معنی میں ''حنفی'' باور کرانا ان کے افکار سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کہنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں سنتِ صحیحہ کے متبع تھے اور اس کے مقابلے میں کسی کا اختلاف یا خلاف خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جن دنوں آپ مدینۃ الرسول ﷺ میں قال اللہ وقال الرسول کا درس دیتے تھے، ان دنوں مدینے کے دیگر شیوخ کسی نہ کسی امام کی طرف منسوب تھے، مگر آپ واحد شخص تھے، جنھوں نے اپنے تلامذہ میں اتباعِ رسول ﷺ کا جذبہ پیدا کیا اور براہِ راست ان کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے جوڑا اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس دور میں یا اسی کے بعد قریب زمانے میں مختلف ممالک میں ترکِ تقلید اور عمل بالسنۃ کی جس قدر اصلاحی تحریکیں چلیں ان میں علامہ سندھی رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کا کافی حصہ ہے۔

امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد اپنی شہرائے آفاق کتاب ''تذکرہ'' میں بلادِ عربیہ کے شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

---

[1] ''تحفة الأنام'' (ص: ٢٥، ٢٦) علامہ صالح فلانی نے بھی یہ عبارت ''إيقاظ همم أولي الأبصار'' (ص: ٧١) میں ذکر کی ہے۔

”اکثر مشاہیر علم و ارشاد جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، سید عبدالخالق زبیدی، علامہ فلانی صاحبِ ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم شاہ راہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا وحق آگاہ تھے۔“[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کو حجازِ مقدس تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ دو سال قیام فرمایا اس وقت علامہ سندھی مسندِ تدریس پر رونق افروز تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ علامہ سندھی رحمہ اللہ کے درس سے ناواقف رہے ہوں۔ علامہ سندھی کے علاوہ وہاں دیگر شیوخ عموماً شافعی المسلک تھے۔ غالب گمان یہی ہے کہ ان کے عقیدے میں بھی جو تبدیلی آئی وہ علامہ سندھی ہی کے اثر کا نتیجہ ہے گو انھوں نے یہ بات کہیں ظاہر نہیں کی۔ مگر علامہ سندھی کی تصانیف کا عکس شاہ صاحب کی بعض تصانیف میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے تلمیذِ رشید علامہ اِلٰہ آبادی کا یہ قول تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ ”رستہ از حبسِ ربقہ تقلید“ حضرت نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی آرا بھی ملاحظہ فرما لیجیے، لکھتے ہیں:

”تمام عمر در خدمت علم حدیث شریف صرف ساخت و تبحری عظیم دریں فن اشرف اندوخت و بمرتبہ اجتہاد برآمدہ وقلادہ تقلید از گلو فرو افگند۔“[2]

یعنی تمام عمر حدیث شریف کے علم کی خدمت میں صرف کر دی، اس پاکیزہ فن میں عظیم تبحر حاصل کیا اور قلادۂ تقلید پھینک کر درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔

---

[1] تذکرہ (ص: ۳۹۷)

[2] تقصار (ص: ۲۲۴)

نیز لکھتے ہیں:

''شیخ محمد حیات رتبہ اجتہاد یاد داشت تقلید ہیچ کسے نمے کرد۔'' [1]

اس کے علاوہ شیخ عقیدتاً خالص سلفی اور شرک و بدعت سے متنفر تھے۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب جن دنوں آپ کے یہاں تعلیم کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے، انہی دنوں کی بات ہے کہ وہ حجرۂ نبوی ﷺ کے پاس کھڑے تھے اور سامنے ایک جماعت حجرۂ مبارک پر دعا و استغاثہ اور دیگر بدعات کا ارتکاب کر رہی تھی اتنے میں حضرت علامہ سندھی تشریف لے آئے۔ شیخ الاسلام نے ان کا استقبال کیا اور جھٹ سے پوچھا: ''ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔'' تو انھوں نے برجستہ یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ ﴾

[الأعراف: ١٣٩]

''ان کا یہ عمل اکارت جائے گا جو بالآخر ان کی تباہی کا باعث بنے گا۔'' [2]

عقیدے میں شدت ہی کا نتیجہ تھا کہ اپنے شاگردِ رشید مولانا آزاد بلگرامی کے نام پر بھی معترض ہوئے۔ مولانا آزاد نے استادِ محترم کے خط اور اس کے جواب کو ''مآثر الکرام'' اور ''سبحۃ المرجان'' میں نقل کیا ہے۔ استاد و شاگرد کی یہ قلمی گفتگو مولانا بلگرامی کے الفاظ ہی میں پڑھنے کے قابل ہے، لکھتے ہیں:

''شیخ قدس مکتوبی نامزد فقیر نمود و اسم فقیر غلام علی بے اضافت غلام تحریر فرمود از جہت آنکہ در حدیث شریف آمدہ کہ ہمہ کس عباد اللہ اند، اطلاق عبودیت نسبت بہ مخلوق نباید کرد۔ فقیر در جواب نامہ نوشت بایں مضمون کہ

---

[1] تحاف (ص: ۴۰۴)

[2] عنوان المجد (ص: ۷)

مسلم در روایت میکند۔ "عن أبي هريرة ﷺ ان رسول الله ﷺ قال: لا يقولن أحدكم عبدي وأمتي كلكم عباد الله وكل نساء كم أماء الله ولكن ليقل غلامي وجاريتي وفتاي وفتاتي" وبخاری در روایت میکند۔ "لا يقل أحدكم عبدي وأمتي وليقل فتاي فتاتي وغلامي" نیز قلمی ساختم که اگر واضع اسم غلام را بہ معنی عبد ارادہ کردہ شد و دیگرے معنیٰ فرزند ارادہ کردہ تلفظ نماید او را می رسد کہ "لكل امرئ مانوى" شیخ قدس سرہ بعد وصول خط انصاف داد وبعد ازیں اسم فقیر غلام علی تحریر فرمود" [1]

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ محترم نے ایک خط میں میرا نام غلام علی کے بجائے صرف غلام تحریر فرمایا اور لکھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ تم تمام اللہ کے بندے ہو، لہٰذا عبدیت کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں ہونی چاہیے۔ جس کے جواب میں فقیر نے لکھا کہ مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو "عبدی" اور امتی نہ کہو بلکہ "غلامی و جاریتی" کہو۔ نیز میں نے لکھا کہ اگر نام رکھنے والے نے "غلام" کے معنی "عبد" لیے تو یہ ممنوع ہے اور اگر کسی نے اس کے معنی "فرزند" لیے تو یہ حکم اس پر عائد نہیں ہوتا۔ شیخ محترم نے خط ملنے پر میری تحسین فرمائی اور اس کے بعد ہمیشہ میرا نام غلام علی لکھتے رہے۔

اندازہ فرمایئے کہ شرک کے شبہات سے علامہ سندھی رحمہ اللہ کس قدر متنفر تھے جس سے ایک طرف ان کے عقیدے میں شدت کا پتا چلتا ہے تو دوسری طرف ان

[1] "مآثر الکرام" (ص: ۱۴۵، ۱۴۶) سبحۃ المرجان میں قدرے تفصیل ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شیخ سے واپسی پر جب مکہ مکرمہ پہنچا تو وہاں یہ خط موصول ہوا۔

کے اخلاص اور سنت سے محبت کا بھی علم ہوتا ہے۔

تلامذہ:

آپ کے علم وفضل کا غلغلہ ہر سو تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ سرزمینِ حجاز کے علاوہ مصر، شام اور ہند وغیرہ ممالک سے تشنگانِ علم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حسبِ استطاعت کسبِ فیض کر کے اپنے مراکز میں بیٹھ کر انہی کے مشن کو پھیلانے کی کوشش کرتے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ سے جن حضرات نے فیض حاصل کیا ان کے طبائع میں خوب تنوع پایا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ۱۱۲۰ھ جیسے عظیم مورخ، محقق، ادیب اور شاعر ہیں تو دوسری طرف شیخ محمد صادق سندھی (م ۱۱۸۰ھ) صاحبِ "بہجۃ النظر شرح شرح نخبۃ الفکر" شیخ امام محمد بن احمد السفارینی صاحب "لوائح الانوار السنیۃ" شیخ محمد فاخر الہ آبادی (م ۱۱۶۴ھ) صاحبِ "درۃ التحقیق فی نصرۃ الصدیق، قرۃ العینین در اثبات سنتِ رفع الیدین، الرسالۃ النجاتیۃ" وغیرہ، مولانا شیخ فقیر اللہ شکار پوری صاحب [1] وثیقۃ الاکابر جیسے نامور محدث مصنف اور عارف باللہ اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ جیسے عظیم مجاہد مبلغ ومصلح ہیں۔ مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم نے علامہ امیر یمانی کو بھی علامہ سندھی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے، جس کی تائید ان کی تصانیف سے ہوتی ہے، اسی طرح انھوں نے علامہ صالح فلانی کو بھی شاگرد کہا ہے علامہ عبدالحی الکتانی نے بھی "فہرس الفہارس" [2] میں ذکر کیا ہے کہ انھیں علامہ سندھی سے اجازہ حاصل تھا، لیکن علامہ

[1] حال ہی میں مولانا سید سعید اللہ صاحب استاد شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کے قلم سے شیخ موصوف اور ان کی کتاب "وثیقۃ الاکابر" کا تعارف ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

[2] فہرس الفہارس (۹۰۳/۲)

موصوف علامہ سندھی کا کلام نقل کرتے ہوئے "قال شیخ مشایخنا" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ واللہ أعلم[1]

ان کے علاوہ حسبِ ذیل شیوخ کا شمار بھی آپ کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔

شیخ احمد بن عبدالرحمان سندھی، شیخ محمد سعید صفر، شیخ عبدالقادر بن خلیل خطیب مسجدِ نبوی، شیخ عبدالقادر بن احمد، شیخ عبدالکریم بن عبدالرحیم الداغستانی، شیخ علی بن صادق الداغستانی، سید علی بن ابراہیم، شیخ عبدالکریم بن احمد الشراباتی، شیخ علی بن عبدالرحمان الاسلامبولی، شیخ علی بن محمد الزہری، مفتی محمد بن عبداللہ المدنی، شیخ علیم اللہ بن عبدالرشید لاہوری المدفون بدمشق، شیخ خیر الدین بن محمد زاہد سورتی وغیرہ۔[2]

سید عبدالحی رحمہ اللہ یہ نام لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: "وخلق کثیر من العلماء والمشایخ" کہ ان کے علاوہ علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا یہ فرمان بلاشبہ مبنی بر حقیقت ہے۔ ۲۴ سال مسلسل مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر درسِ حدیث دینے والے بزرگ کے تلامذہ کا شمار کیونکر ہو سکتا ہے؟

تصانیف:

① الإیقاف علی سبب الاختلاف:

جس میں علامہ سندھی رحمہ اللہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، ائمۂ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے مابین فقہی اختلافات کے اسباب پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقِ استنباط اور تخریجِ مسائل کی وضاحت کی ہے کہ وہ ہمیشہ قرآن و سنت پر عمل کرتے تھے اور جب انھیں اپنے قول و فعل کے مخالف کوئی حدیث

[1] ایقاظ (ص: ۵۲)

[2] نزهة الخواطر (۳۰۲/٦)

پہنچتی تو اس سے فوراً رجوع کر لیتے تھے۔ پورا رسالہ نہایت علمی مباحث پر مشتمل ہے اور قابل دید ہے۔

سب سے پہلے یہ رسالہ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ نے اپنے اردو ترجمہ وحواشی کے ساتھ اپنے ہی ماہنامہ ''اشاعۃ السنۃ'' جلد اول (بابت ماہ رجب ۱۲۹۸ھ جنوری ۱۸۸۱ء کے ضمیمہ: ۴ (ص: ۲۴۔۴۳) میں شائع کیا۔ اس کے بعد یہی ترجمہ جزوی اصلاح کے ساتھ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف رحمہ اللہ کی مساعی سے ۱۳۷۹ھ بمطابق ۱۹۵۹ء میں مکتبہ سلفیہ لاہور سے طبع ہوا اور کچھ سال پیشتر تیسری بار مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی مرحوم کی مساعی سے دہلی میں طبع ہو چکا ہے۔ جس پر سن طباعت نہیں لکھا گیا۔ ''رفع الملام عن الأئمة الأعلام'' مؤلفہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسی موضوع پر مفصل اور بڑا جامع رسالہ ہے۔[1] امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''اعلام الموقعین'' میں بھی اس موضوع پر بہترین بحث کی ہے اور علامہ سندھی رحمہ اللہ نے اپنے رسالے میں شیخین سے استفادہ کیا ہے۔ اسی موضوع پر علامہ سندھی کے معاصر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ ''الإنصاف في بيان سبب الاختلاف'' بھی قابلِ دید ہے اس کے علاوہ ''حجة الله البالغه'' کی المجث السابع میں بھی شاہ صاحب نے بڑی مدلل اور دلچسپ بحث کی ہے۔

② تحفة الأنام في العمل بحديث النبي ﷺ:

عمل بالحدیث کے موضوع پر یہ مختصر مگر بہترین رسالہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ صالح فلانی رحمہ اللہ نے ''إيقاظ همم أولي الأبصار'' میں علامہ سندھی کے حوالے سے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ اسی رسالے

[1] اس رسالہ کا جناب پروفیسر غلام احمد حریری صاحب رحمہ اللہ نے ''ائمہ سلف اور اتباع سنت'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا جو طارق اکیڈمی فیصل آباد کے زیرِ اہتمام کئی دفعہ طبع ہو چکا ہے۔

سے ماخوذ ہیں۔ بلکہ دونوں کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ بجز دو تین صفحات کے پورا رسالہ ''ایقاظ'' میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت نواب صدیق حسن خان مرحوم نے ''الجنة في الأسوة الحسنة بالسنة'' اور علامہ امیر یمانی رحمہ اللہ نے ''إرشاد النقاد إلیٰ تیسیر الاجتهاد'' (مطبوعه فی الرسائل المنیرة) میں بھی جا بجا اس رسالے سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان کے تلمیذ رشید حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے ایک فارسی مکتوب میں اس رسالے کی تلخیص کی ہے۔ ملاحظہ ہو ''کلمات طیبات'' (ص: ۲۸-۳۰) پورا رسالہ تقلیدِ شخصی کی تردید اور اتباع سنت کی تائید وحمایت میں نقلی وعقلی دلائل سے بھرپور ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''فمن يتعصب لواحد معين غير رسول الله ﷺ ويرى أن قوله هو الصواب الذي يجب اتباعه دون الأئمة المتأخرين فهو ضالٌ جاهلٌ بل قد يكون كافراً يستتاب فإن تاب وإلّا قتل فإنه اعتقد أنه يجب على الناس اتباع واحد بعينه من هذه الأئمة دون الآخرين فقد جعله بمنزلة النبي ﷺ وذلك كفرٌ''

''جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی ایک کی اتباع کرتا ہے اور اس کے قول کو ہی صحیح اور واجب الاتباع سمجھتا ہے تو ایسا شخص گمراہ اور جاہل بلکہ کافر ہے اس کی توبہ کرائی جائے۔ اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے، کیوں کہ جب اس کا یہ اعتقاد ہے کہ امت میں صرف ایک کی اتباع ضروری ہے تو اس نے گویا اسے نبی کریم ﷺ کے درجے تک پہنچا دیا

ہے اور یہ کفر ہے۔''

اس کے چند سطور بعد لکھتے ہیں:

''ومن تعصب لواحد بعينه من الأئمة دون الباقين فهو بمنزلة من يتعصب لواحد من الصحابة دون الباقين كالرافضي والناصبي والخارجي فهذه طرق أهل البدع''[1]

''اور جو ائمہ کرام میں سے کسی ایک کی اتباع کرتا ہے تو اس کی مثال رافضیوں، ناصبیوں اور خارجیوں کی ہے جو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع تو کرتے ہیں، مگر دیگر کی پروا نہیں کرتے اور یہ طریقہ اہلِ بدعت اور خواہش پرستوں کا ہے۔''

ان دو عبارتوں سے اندازہ ہوسکتا ہے، تقلیدِ شخصی کے متعلق علامہ سندھی رحمہ اللہ کے جذبات کا کیا عالم تھا۔ یہ رسالہ مع ''الإيقاف على سبب الاختلاف'' حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی رحمہ اللہ کی مساعی سے مکتبہ سلفیہ دہلی سے چند سال ہوئے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد شیخ صلاح الدین مقبول نے اسے کویت سے اور طہ بوسریح نے بیروت سے شائع کیا ہے۔

③ فتح الغفور في وضع الأيدي على الصدور:

نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں۔ فقہائے کرام کا اس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ثوری رحمہ اللہ ناف کے نیچے باندھنا پسند کرتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر امام شافعی رحمہ اللہ (علی قول المشہور) اور امام مالک رحمہ اللہ سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر باندھنا پسند فرماتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ

[1] ''تحفة الأنام'' (ص: ١٤)

سے بھی یہ قول منقول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک تیسرا قول بھی مروی ہے کہ ناف کے نیچے یا اوپر سینے کے نیچے جہاں چاہے ہاتھ باندھ سکتا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک قول سینے پر ہاتھ باندھنے کا بھی منقول ہے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ بھی سینے پر ہاتھ باندھنا پسند کرتے ہیں اور اس کی تائید میں ان کا یہ رسالہ ہے جس میں انھوں نے اپنے دعوے کو احادیث و آثار سے مدلل کرتے ہوئے حدیث "تحت السرۃ" کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ بحث کے اختتام پر بڑے وثوق سے فرمایا ہے:

"وبما تقدم أن لوضع الأيدي على الصدور في الصلاة أصلًا أصيلًا و دليلًا جليلًا فلا ينبغي لأهل الإيمان الاستنكاف عنه" [1]

نہایت نامناسب ہوگا اگر ہم یہ ذکر نہ کریں کہ علامہ سندھی رحمہ اللہ کے جواب میں ان ہی کے شاگرد محمد قائم سندھی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "فوز الكرام بما ثبت في وضع اليدين تحت السرة وفوقها تحت الصدر من الشفيع المظلل بالغمام" رسالے کے مندرجات سے مؤلف موصوف رحمہ اللہ کی جلالتِ شان کا اندازہ ہوتا ہے۔ پورا رسالہ نہایت قیمتی اور اصولی معلومات پر مشتمل ہے اس کا قلمی نسخہ حضرت مولانا سید محب اللہ شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ کے پاس موجود ہے اور بندہ کے پاس بھی اسی نسخے سے منقولہ نسخہ کی نقل ہے (والحمد لله على ذلك) مگر افسوس کہ دو اہم جگہ پر بیاض ہے جو اصولِ نقد و جرح سے متعلق ہیں۔ علامہ قائم سندھی رحمہ اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ناف کے نیچے اور ناف کے اوپر مگر سینے سے نیچے جہاں چاہے ہاتھ باندھنے چاہئیں سینے پر ہاتھ باندھنا کہ وہ صرف سینے پر ہو اور

[1] فتح الغفور (ص: ۸)

صحیح نہیں اور ائمۂ مذاہب کے علاوہ دیگر ائمۂ کرام میں سے بھی یہ کسی کا مذہب نہیں۔

چنانچہ رسالے کے آخر میں فرماتے ہیں:

"فَمَا لم يثبت عن أحد الوضع على الصدر للكل لم تمذهب به أحد لا من أصحاب المذاهب المعروفة المتبوعة ولا من غيرهم وقد ثبت الوضع في الصدر الأول تحت السرة وفوقها تحت الصدر فاختار بعضهم الأول وبعضهم الثاني فعلى المؤمن أن يتبع سبيل المؤمنين"

مگر علامہ موصوف رحمہ اللہ کا یہ خیال صحیح نہیں، جب کہ امام اسحاق رحمہ اللہ بن راہویہ کا ایک قول یہی ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے چاہئیں۔ چنانچہ امام المروزی نے "المسائل" (ص: ۲۲۲) میں ذکر کیا ہے:

"وكان إسحاق يوتر بنا ويرفع يديه في القنوت ويقنت قبل الركوع ويضع يديه على ثدييه أو تحت الثديين"[1]

"مسائل الإمام أحمد وإسحاق بن راهويه برواية إسحاق الكوسج"[2] میں بھی اسی طرح ہے۔

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت علی الصدر کی منقول ہے، جیسا کہ "حاوی" میں ہے اور صاحبِ ہدایہ نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔[3]

نیز قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب علامہ قائم مرحوم اس بات کے قائل ہیں کہ ہاتھ اس طرح بھی باندھنا جائز ہے کہ کچھ حصہ سینے پر اور کچھ سینے کے نیچے ہوں تو اگر کوئی

---

[1] بحواله "صفة صلاة النبي ﷺ" (ص: ٦٩)

[2] (٥٩٠/٢)

[3] هداية مع فتح القدير (٢٠١/١)

حدیث کے ظاہر الفاظ سے صرف سینے ہی پر ہاتھ باندھنے کو پسند کرتا ہے تو وہ آخر ؟ م کیوں ہے؟ بالخصوص جب کہ علامہ سندھی رحمہ اللہ کا نعرۂ مستانہ یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سینے پر ہاتھ باندھنا ثابت ہے تو پھر سینے پر ہاتھ ہونے چاہئیں۔

رسالہ ''فتح الغفور'' سب سے پہلے مولانا عبدالحمید اٹاوی کے اردو ترجمے کے ساتھ سعید المطابع بنارس سے ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء میں طبع ہوا تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا عبدالتواب رحمہ اللہ کی توجہ سے ۱۳۶۱ھ میں ملتان سے طبع ہوا، مگر اب نایاب ہے۔ حضرت الشیخ السید بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ نے ''التعلیق المنصور علی فتح الغفور'' کے نام پر اس کی بہترین شرح لکھی ہے، جو تاحال زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ دکتور محمد ضیاء الرحمان اعظمی حفظہ اللہ کی تحقیق و مراجعت سے یہ پہلے مصر سے اس کے بعد دوسری اشاعت کلیۃ دار القرآن والحدیث جناح کالونی فیصل آباد سے ۱۹۹۷ء میں ہوئی۔ مولانا فیض الرحمٰن الثوری کی تحقیق و تعلیق سے بھی یہ شائع ہوا ہے اور مولانا محمد صادق خلیل نے منح الشکور کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔

اس موضوع پر دیگر رسائل:

فتح الغفور کے علاوہ اس موضوع پر مزید دو رسالے بھی علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کے ہیں۔ ان رسائل کا پسِ نظر یہ ہے کہ ان کے شیخ علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالهادی السندھی الکبیر نماز میں رفع الیدین اور سینے پر ہاتھ باندھنے کے قائل تھے۔ انہی کے معاصر شیخ ابو الطیب السندھی تھے، دونوں کے مابین مناظرہ ہوا۔ علامہ محمد عابد سندھی نے لکھا ہے:

''عجز الشيخ أبو الطيب عن الأجوبة''

مگر شیخ ابو الطیب جواب نہ دے سکے۔ دونوں میں مناقشہ و مخاصمہ رہتا تھا

تا آنکہ ایک متعصب حنفی قاضی مدینہ طیبہ میں قاضی مقرر ہوا۔ شیخ ابو الطیب نے قاضی کو شکایت کی کہ شیخ ابو الحسن سندھی بعض مسائل میں امام صاحب کی مخالفت کرتے ہیں۔ قاضی صاحب نے تعجب کا اظہار کیا اور علامہ سندھی کو بلایا گیا اور کہا کہ نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھا کرو اور تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رفع الیدین نہ کیا کرو تو علامہ سندھی نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ قاضی نے انھیں جیل کے ایسے کمرے میں بند کر دیا جس میں اندھیرے کی وجہ سے قیدی اپنے اعضا کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی حالت میں وہ چھے دن جیل میں رہے۔ اہلِ مدینہ نے سلسلہ جنبانی کیا، بالآخر وہ جیل سے رہا ہوئے۔ مگر علامہ سندھی نے فرمایا کہ جو عمل میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اللہ کی قسم! میں اسے ترک نہیں کروں گا۔ ادھر قاضی نے حلفاً کہا کہ اگر میں نے انھیں سینے پر ہاتھ باندھے دیکھ لیا تو پھر قید میں ڈال دوں گا۔ اہلِ مدینہ نے شیخ سے کہا کہ آپ نماز پڑھتے ہوئے اوپر چادر لے لیا کریں اور چادر کے نیچے ہاتھ باندھا کریں، تاکہ قاضی اور آپ حانث نہ ہوں۔ تو شیخ نے یہ مشورہ تسلیم کر لیا چند روز گزرے کہ وہ اسی طرح نماز پڑھ رہے تھے کہ کسی نے کہا کہ قاضی صاحب وفات پا گئے ہیں تو انھوں نے اوپر کی چادر اتار دی۔ یہ ساری داستان شیخ محمد عابد سندھی نے تراجم شیوخ میں ذکر کی ہے۔

یہ کتاب ''تراجم مشائخ، العلامۃ محمد عابد سندھی'' کے نام سے مکتبہ حرم مکی میں ہے، لیکن یہ کتاب نہ خود شیخ محمد عابد کے شیوخ پر مشتمل ہے اور نہ یہ ان کی تصنیف میں ہے۔ یہ دراصل علامہ عبدالخالق بن علی المزجاجی کی کتاب ''نزهة رياض الإجازة'' کا اختصار ہے اور اس میں کچھ اضافہ جات شیخ محمد عابد کے ہیں، جس کی تفصیل شیخ سائد بلداش نے شیخ محمد عابد کے سوانح (ص: ۳۶۳، ۳۶۶) میں بیان کر دی ہے۔

علامہ محمد سندھی کا یہ واقعہ شیخ بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ نے "التعلیق المنصور علی فتح الغفور" میں بھی ذکر کیا ہے۔

علامہ ابو الحسن سندھی نے اپنا یہ موقف بعض کتبِ احادیث کے حواشی میں اور "فتح القدیر لابن الھمام" کے حاشیہ میں بھی بیان کیا۔ فتح القدیر کے حاشیہ کے تناظر میں اس کا جواب شیخ محمد ہاشم سندھی نے "درھم الصرۃ فی وضع الیدین تحت السرۃ" کے نام سے دیا جو ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اسی رسالے کا پہلے ایک مختصر جواب علامہ محمد حیات سندھی نے لکھا۔ جس پر اس کا کوئی نام لکھا ہوا نہیں۔ یہ رسالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے شیخ ابو الحسن سندھی کے مشورے سے اس کا مفصل جواب "درۃ في إظھار غش نقد الصرۃ" کے نام سے لکھا جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مخطوط سعیدیہ لائبریری ٹونک میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے علامہ محمد ہاشم رحمہ اللہ کے رسالے کا نام "نقد الصرۃ" ذکر کیا ہے۔ جب کہ خود انھوں نے اس کا نام "درھم الصرۃ" ذکر کیا ہے۔ واللہ أعلم

اس کے بعد علامہ محمد ہاشم رحمہ اللہ نے ان دنوں کا جواب دیا، پہلے رسالے کا جواب "ترجیح الدرۃ علی درھم الصرۃ" کے نام سے اور دوسرے کا "معیار النقاد فی تمییز المغشوش عن الجیاد" کے نام سے دیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے کے بارے میں "فتح الغفور" کے علاوہ دو اور رسالے بھی علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کے ہیں۔

(i) ایک "دُرّۃ في اظھار غش نقد الصرۃ"

(ii) اور دوسرا اسی موضوع پر "الرسالة في وضع الیدین علی الصدور"

یہ تمام رسائل اسلامیہ کالج لائبریری پشاور میں خطی صورت میں محفوظ ہیں۔ عرصہ ہوا ان کا عکس اس ناکارہ نے حاصل کیا تھا۔ ان رسائل کو مولانا شیر احمد منیب صاحب نے شائع کروایا ہے۔ مگر افسوس کہ نہ اس کا سنِ طباعت ہے نہ کسی مطبع کا ذکر ہے کہ یہ کہاں سے کس مطبع میں طبع ہوا ہے۔ ادارۃ علوم القرآن کراچی سے بھی ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۴ء میں یہ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

⑥ شرح الترغيب والترهيب للمنذري:

امام المنذری رحمہ اللہ کی ''الترغیب والترہیب'' کی یہ شرح ہے۔ اسماعیل پاشا اور عمر رضا کحالہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کتانی نے ''الرسالة المستطرفة'' (ص: ۱٤۸) میں ذکر کیا ہے کہ یہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

⑧ تحفة المحبين في شرح الأربعين:

اس کا ایک خطی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[1]

حضرت مولانا سید محب اللہ شاہ صاحب راشدی پیر آف جھنڈا کے مکتبہ عالیہ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے، جس کے کل (۳۵) ورق ہیں اور شعبان ۱۳۰۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ کو سنت اور صاحبِ سنت الف الف تحیۃ وسلام سے جو محبت تھی اس کا نمونہ اس رسالے میں بھی جابجا ملتا ہے، مثلاً حدیث: «لا يؤمن أحدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به» کے تحت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے تین درجے ہیں:

(۱) جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے حق سمجھے اس کے بغیر ایمان صحیح نہیں۔ ایسے لوگ

[1] ''بروکلن'' (ص: ۵۲۲) بحوالہ ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (ص: ۲۸۲) مکتبہ وطنیہ الجزائر میں بھی اس کا مخطوط پایا جاتا ہے۔

تو اکثر پائے جاتے ہیں۔

② دوسرا یہ کہ آپ ﷺ کے فرامین کو حق جانتے ہوئے مخالفت سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے۔ ایسے کم لوگ ہیں۔

③ تیسرا درجہ یہ ہے کہ حرج اور ثقل محسوس کیے بغیر اطاعت کرے۔ حتی کہ ان کی خواہشات نبی اکرم ﷺ کے فرامین کے مطابق ہوں۔ ایسے افراد بہت ہی کم ہیں اور یہی محمدی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ انہی کی نوکِ قلم سے پڑھنے کے قابل ہیں، لکھتے ہیں:

"هذا هو المحمدي الذي إذا ثبت عنده قول حبيبه وفعله المحكمات انشرح بهما صدره وأخذ بهما بأعظم الرضا والسرور واختلاط ذلك بقلبه وقالبه فلو اجتمع من بين أقطار الأرض علىٰ أن يصدوه عن قول محبوبه وفعله لما تركهما ولم يبال بخلاف كائناً من كان آه! أين هؤلاء المحمديون في زماننا هذا، اللهم اجعل سنة حبيبه محمد ﷺ أحب إلينا من أرواحنا وأنفسنا"

"یہی محمدی ہے کہ جب اس کے نزدیک اس کے محبوب کا قول وفعل صحیح ثابت ہو جاتا ہے تو اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور انتہائی رضا و رغبت اور خوشی سے اس پر عمل کرتا ہے اور دل و جان پر اسے نافذ کرتا ہے۔ اگر ساری خدائی اسے اس کے محبوب کے قول وعمل سے روکنے کے لیے جمع ہو جائے تو وہ اسے نہیں چھوڑتا اور خواہ کوئی بھی ہو کسی کی مخالفت کی پروانہیں کرتا۔ آہ ایسے محمدی آج ہمارے زمانے میں کہاں ہیں؟ الٰہی! اپنے حبیب حضرت

محمد ﷺ کی سنت ہمیں ہمارے ارواح وانفس سے عزیز تر کردے۔'' آمین

سارا رسالہ اسی طرح کے جذبات اور مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ یہ شرح دار رمادی (دمام) سے ۱۴۱۵ھ میں شیخ حکمت بن احمد الحریری کی تحقیق سے شائع ہو گئی ہے۔ دوبارہ دار المعانی اردن سے ۱۴۱۹ھ میں بھی یہ چھپی ہے۔

⑧ مختصر الزواجر عن اقتراف الكبائر:

''الزواجر'' علامہ ابن حجر المکی رحمہ اللہ کی ۹۷۴ھ کی معروف تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تذکیر و ترہیب کے لیے بڑی عمدہ کتاب ہے۔ اس موضوع پر علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب ''الکبائر'' بھی مطبوع ہے۔ متداول اور معروف ہے مگر علامہ ذہبی کی طرف اس کا انتساب محلِ نظر ہے۔ البتہ الاستاذ محی الدین مستو اور بعد میں شیخ ابو عبیدۃ مشہور حفظہ اللہ کی تحقیق سے جو نسخہ طبع ہوا ہے وہ صحیح ہے اور علامہ ذہبی کی تصنیف ہے۔

''الزواجر'' مصر سے دو جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، مگر کم یاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور لائبریری میں محفوظ ہے، جو (۹۸۴ھ) کا مکتوبہ ہے۔ گویا مصنف کے انتقال سے گیارہ سال بعد کا یہ نسخہ ہے جس پر نامور علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ اسی ''الزواجر'' کا اختصار علامہ سندھی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ اسماعیل پاشا نے ''ہدیۃ العارفین'' (۲/۳۲۷) میں اس کا ذکر کیا ہے اور ''إيضاح المكنون'' (۱/۴۱۷) میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے قلمی نسخے الجزائر اور مکتبہ الحرم المکی میں ہیں۔

الزواجر کا اردو ترجمہ ''قوارع الإيمان عن اتباع خطوات الشيطان'' کے نام سے حضرت مولانا سید جمیل احمد سہسوانی رحمہ اللہ نے کیا تھا۔ جو حضرت نواب صاحب رحمہ اللہ کے مصارف سے ۱۳۰۴ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہو چکا ہے۔

⑨ موقضة الهمم في شرح الحكم:

"الحکم" شیخ تاج الدین ابو الفضل احمد بن محمد المعروف بابن عطاء اللہ الاسکندرانی الشاذلی المالکی (م۷۰۹ھ) کی معروف تصنیف ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح احوال کے لیے یہ کتاب بہترین کتابوں میں شمار کی گئی ہے، جس کا اندازہ شیخ بنانی کے اس قول سے ہوتا ہے:

"كادت حكم ابن عطاء الله أن تكون وحياً ولو كانت الصلاة تجوز بغير القرآن لجازت بكلام الحكم"[1]

اس کتاب کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے اس کی سات شروح کا ذکر کیا ہے (کشف الظنون: ۶۷۵/۷) جن میں سے شیخ محمد بن ابراہیم بن عباد کی شرح "غيث المواهب العلية" اور "إيقاظ الهمم" مؤلفہ شیخ احمد بن محمد الحسنی مطبوع ہے۔ الحکم غیر مبوب کتاب تھی۔ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال نے اسے ابواب کی صورت میں مرتب کیا تو اس کا نام "تبويب الحكم" رکھا۔ اسی تبویب کا ترجمہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے "اتمام النعم" کے نام سے کیا اور مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے اس کی اردو شرح لکھی جس کا نام "إكمال الشيم شرح اتمام النعم" رکھا یہ اردو شرح پہلے ۱۳۵۴ھ میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۴۰۹ھ میں ہمارے مہربان دوست مولانا محمد رمضان صاحب شوق لائبریرین اشاعت العلوم فیصل آباد کی تصحیح و حواشی اور اس کی مفصل فہرست کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔

"الحکم" کی شرح علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے بھی لکھی ہے، جس کا ذکر "هدية العارفين" اور "إيضاح المكنون" وغیرہ میں ملتا ہے، اس کا مخطوطہ

[1] "إيقاظ الهمم في شرح الحكم" (ص: ٤)

مکتبہ وطنیہ الجزائر میں ہے۔ اور نزار حمادی کی تحقیق سے ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں مؤسسۃ المعارف بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ شرح ابن عباد کا ایک خطی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں محفوظ ہے، جو تقریباً تین سو سال کا پرانا نسخہ ہے۔

⑩ شرح علی مقدمه فی العقائد:

''مقدمہ'' مرزا خواجہ بن السید المرغینانی المدنی کی تصنیف ہے جس کی شرح علامہ حیات سندھی نے لکھی اس کا مخطوط مکتبہ وطنیہ الجزائر میں ہے۔ علامہ الزرکلی نے ''الاعلام'' (۲۱۰/٦) میں مقدمہ ہی کو شیخ سندھی کی کتاب قرار دے دیا ہے۔ اسے بھی شیخ نزار حمادی نے شائع کیا ہے۔

⑪ شرح الأربعین حدیثاً من جوامع الکلم:

یہ علامہ علی قاری کی ''الاربعین'' کی شرح ہے، جس کا مخطوط مکتبہ وطنیہ الجزائر میں ہے، جسے شیخ محمد غالب کی تحقیق سے دار ابن حزم بیروت نے شائع کیا ہے۔

⑫ رشاد النقاد إلی تیسیر الاجتهاد:

رضا کحالہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔[1] مگر یہ ان کا وہم معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ درحقیقت علامہ امیر یمانی رحمہ اللہ کا ہے جو ''الرسائل المنیریه'' میں مطبوع ہے۔

⑬ شرح الحکم الحدادیه:

اس کا ذکر اسماعیل پاشا نے کیا ہے۔[2] ''شرح قصیدۃ السید عبداللہ علوی الحداد'' کے نام سے ایک رسالہ شیخ نزار حمادی کی تحقیق سے شائع ہوا ہے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کوئی علیحدہ کتاب ہے یا وہی ہے جس کا ذکر اسماعیل پاشا نے کیا ہے۔ واللہ اعلم

---

[1] معجم المؤلفین (۲۷۵/۹)

[2] هدیة العارفین'' (۳۲۷/۲)

(۱۴) رساله في إبطال الضرائح:

مولانا سید عبدالحی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر "نزهة الخواطر" (۳۰۲/٦) میں کیا ہے۔ غالباً "الرد علی بدعة التعزية" یہی رسالہ ہے جس کا مخطوطہ چوتا ین (سندھ) میں ہے۔

(۱۵) رسالة في النهي عن عشق المردان والنسوان:

مولانا سید عبدالحی مرحوم اور حضرت النواب رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت نواب صاحب کے مکتبہ میں اس کا خطی نسخہ بھی موجود تھا، جسے وہ مدینہ طیبہ سے لائے تھے۔ "إتحاف النبلاء" میں انھوں نے اس کے کچھ اقتباس بھی نقل فرمائے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ سندھی ادبی بورڈ (کراچی) کی لائبریری میں بھی ہے۔

عشق کے متعلق اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں۔ محققین کے نزدیک تو اس لفظ کا استعمال ہی محلِ نظر ہے۔ قرآن اور سنتِ صحیحہ میں اس کا استعمال بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ شریعتِ مطہرہ نے امرد اور غیر محرم کو دیکھنے سے منع فرمایا ہے۔ چہ جائیکہ ان سے "عشق" رچایا جائے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں جذبات بڑے نازک اور قابلِ غور ہیں، فرماتے ہیں:

"إنما حكى الله العشق عن الكفرة قوم لوط وامرأة عزيز وكانت إذ ذاك مشركة والفتنة بعشق الصور تنافي أن يكون دين العبد كله لله، بل ينقص من دينه بحسب ما حصل له من فتنة العشق وربما أخرجت صاحبه من أن يبقىٰ معه شيء من الدين والمفتون بالصور مخالف لقوله تعالىٰ:

﴿قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ

أَ كَىٰ لَهُمْ﴾ [النور: ۳۰] والمبتلى بها ليس بغاض من بصره بل يتلذذ بالنظر الحرام وربما يقع به في الزنا ... فإن تعبد القلب المعشوق شرك وقد أثبت النبي ﷺ اسم التعبد على المحبة لغير الله في قوله الصحيح: تعس عبد الدينار وعبد الدرهم إلخ“ ①

گویا علامہ سندھی رحمہ اللہ جہاں خوبروؤں اور غیر محرموں سے عشق کو کافروں کا طریقہ بتلاتے ہیں تو دوسری طرف اسے شرک کی حدود میں بھی داخل کرتے ہیں۔ ان سے قبل علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے جو ”إغاثه اللهفان“ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

⑯ إعفاء اللحية:

اس کا خطی نسخہ حضرت مولانا پیر وہب اللہ صاحب راشدی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ حضرت مولانا سید محب اللہ شاہ صاحب راشدی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے حضرت موصوف سے رسالہ حاصل کر کے اس کی فوٹو کاپی راقم کو بھی ارسال کر دی۔ یہی نہیں بلکہ علامہ سندھی رحمہ اللہ کی شرح اربعین نووی کی فوٹو کاپی بھی ارسال فرمائی۔ جزاه الله أحسن الجزاء

یہ رسالہ چھوٹے سائز کے دس صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالے کا سببِ تالیف ذکر کرتے ہوئے علامہ سندھی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”میں نے ایک صاحب کے رسالے میں دیکھا ہے کہ ”إعفاء اللحية“ مستحب ہے اور یہ سنن تعبدی نہیں، بلکہ سنن عادی ہے اور جو

① الحاف (ص: ٤٠٤)

کوئی ایک قبضے سے کم ڈاڑھی رکھے گا وہ تارکِ مستحب ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق بعض دوستوں نے سوال کیا کہ اس مسئلے میں قولِ فیصل کیا ہے؟ تاکہ اس سلسلے میں اوہام کا ازالہ ہو جائے۔"

اس کے بعد علامہ موصوف نے احادیث و آثار سے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور رسالے کے آخر میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ حسبِ ذیل ہے:

"وبهذا كله تبين أن أصل الإعفاء واجب كما أوضحنا وتاركه تارك واجب يستحق ما يستحقه تارك الواجب، ولو تنزل عن الوجوب فلا أقل من أنه سنة مؤكدة يستحق تاركه ما يستحق تارك السنة المؤكدة وليس بمندوب عادي كما زعم صاحب الرسالة بل هو أمر تعبدي شرعه الله لأنبيائه وحثهم عليه إلخ"

"اس بحث سے ظاہر ہو گیا ہے، ڈاڑھی کا بڑھانا واجب ہے، جس طرح کہ ہم نے واضح کر دیا ہے اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو تارکِ واجب کے لیے مقرر ہے اور اگر وجوب سے کم کہا جائے تو پھر یہ سنتِ مؤکدہ سے کم نہیں اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو تارکِ سنتِ مؤکدہ کے لیے ہے اور نہ یہ مندوب ہے اور نہ ہی سننِ عادیہ سے ہے، جیسا کہ صاحبِ رسالہ کا خیال ہے۔ بلکہ یہ امر تعبدی ہے، جس کا اللہ پاک نے انبیائے کرام علیہم السلام کو حکم فرمایا۔"

محترم شیخ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ نے بتلایا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ سالارِ جنگ میوزیم حیدر آباد دکن میں ہے۔ شیخ بدیع الدین الراشدی کی تحقیق اور علمی مقدمے کے ساتھ

یہ رسالہ مجلّہ الجامعۃ السلفیۃ (بنارس) میں شائع ہوا، پھر شیخ عبدالمجید جمعہ جزائری کی تحقیق سے دار العواسم الجزائر سے ۱۴۲۵ھ میں چھپا۔ اس کا ترجمہ راقم نے بھی کیا جو مجلّہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) میں عرصہ ہوا، شائع ہوا تھا۔

⑰ الاشارة لأهل الإشارة:

اس کے تین قلمی نسخے مانچسٹر (برطانیہ) سالارِ جنگ میوزیم (حیدر آباد دکن) اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریریوں میں ہیں۔

⑱ الاقتداء بالمخالف:

اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔ جس کی نقل شیخ عزیر شمس حفظہ اللہ کے پاس بھی ہے۔

⑲ جابات على أحد عشر سؤالاً في "تفسير القرآن":

یہ علامہ العز بن عبدالسلام کی تفسیر کے بارے میں گیارہ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ جس کا قلمی نسخہ الجزائر کے مکتبہ وطنیہ میں ہے۔

⑳ جوبه وفتاوىٰ فقهية:

موضوع نام سے ظاہر ہے، اس کا قلمی نسخہ مکتبہ الاوقاف بغداد میں ہے۔

㉑ مسائل سأل عنها أبو سعيد الخادمي:

اس کا نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں ہے اور تین نسخے پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری (امریکہ) میں ہیں۔

㉒ فتح الودود في التكلم في مسألة العينية و وحدة الوجود:

اس کا قلمی نسخہ چسٹربٹی لائبریری (ڈبلن) میں اور دارالکتب الظاہریہ (دمشق) میں ہے۔

۲۳ "رسالة في حرمة التبغ"، یا "رساله في تحريم الدخان":

تمباکو کی حرمت کے بارے میں ہے، جس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں اور مکتبہ محمودیہ (مدینہ منورہ) اور قاسمیہ لائبریری کندیاری (سندھ) میں ہے۔

علامہ سندھی کی حسبِ ذیل کتابوں کا ذکر بھی فضیلۃ الشیخ المحقق الکبیر محمد عزیر شمس حفظہ اللہ نے اپنے ایک مکتوب میں کیا، انہی کے توسط سے ان کے شکریہ کے ساتھ ہم ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

۲۴ الجُنَّة في عقيدة أهل السنة:

یہ کتاب شیخ عبدالقیوم سندھی کی تحقیق سے مکتبۃ الاسدی مکہ مکرمہ سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

۲۵ ركضة في ظهر الرفضة:

یہ دراصل علامہ محمد برزنجی المتوفی ۱۲۰۳ھ کے رسالہ "النواقض للروافض" کی تلخیص ہے اور "الرسالة في الرد على الرافضة" کے نام سے شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہو کر چھپی ہے، لیکن یہ درحقیقت علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کی تالیف ہے، جیسا کہ اس کے چار قلمی نسخوں سے پتا چلتا ہے، جن میں سے ایک شیخ شمس نے مکتبۃ الملک عبدالعزیز (ریاض) میں دیکھا ہے۔

۲۶ زاد المتقي و المهتدي:

اس کے قلمی نسخے سالار جنگ میوزیم (حیدرآباد) مکتبہ معروفیہ ٹھری (سندھ) اور مکتبہ چوتارین (سندھ) میں موجود ہیں۔

۲۷ العون في حال فرعون:

اس کا مخطوط رضا لائبریری (رامپور) میں ہے۔

۲۸ ح اللطيف في أجوبة أسئلة الشريف:

یہ درگاہ شریف پیر جھنڈو کی لائبریری میں موجود ہے۔ سنہ تالیف ۱۱۵۰ھ تحریر ہے۔

۲۹ رسالہ في فضائل معاوية

اس کا مخطوطہ جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کی لائبریری میں ہے۔

۳۰ سالة إلى الشيخ محمد بن عبد الوهاب:

اس کے دو قلمی نسخے پائے جاتے ہیں: ایک مکتبۃ الملک عبدالعزیز (ریاض) میں اور دوسرا مکتبہ قادریہ (بغداد) میں۔

۳۱ "العطية العلية في مسئلة الأفضلية" یا "رد الحجة الجليلة في الجليلة في رد من قطع بالأفضلية"

اس کے دو قلمی نسخے پائے جاتے ہیں: ایک نیشنل میوزیم (کراچی) میں اور دوسرا قاسمیہ لائبریری کندیارو (سندھ) میں۔

۳۲ رسالة في كراهية الاختضاب بالسواد:

اس کے قلمی نسخے نیشنل میوزیم (کراچی) کے علاوہ سندھ کی تین اور مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔

۳۳ إظهار غين "قرة العين في البكاء على الحسين"

قرۃ العین محمد معین سندھی کی ہے، جس کی تردید علامہ محمد حیات سندھی نے کی۔ اس کے قلمی نسخے جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) مکتبۃ معروفیۃ ٹیاری (سندھ) اور دار العلوم مجددیہ ملیرجی (سندھ) میں ہیں۔

۳۴ رد رسالة الشيخ محمد معين في مسألة فدك وإرث الأنبياء:

اس کا مخطوطہ قاسمیہ لائبریری کندیارو (سندھ) میں ہے۔

(۳۵) إظهار الماتم من المأثم:

یہ بھی قاسمیہ لائبریری میں ہے۔

(۳۶) الأنوار المحمدية في أسرار النقشبندية.

(۳۷) "الإعانة الصمدية في طريقة النقشبندية.

(۳۸)، (۳۹) رسالتان في التصوف.

(۴۰) رسالة في الأسئلة والأجوبة:

یہ پانچوں رسالے ترکی کی بعض لائبریریوں میں قلمی صورت میں موجود ہیں۔

(۴۱) لذيذ السماع في حجة الوداع:

اس کا مخطوطہ جامعۃ الملک سعود (ریاض) کی لائبریری میں ہے۔

(۴۲) رسالة في أحاديث الجمع بين الصلاتين:

اس کا قلمی نسخہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی لائبریری میں ہے۔

(۴۳) تحريم أخذ الأجرة على تلاوة القرآن العظيم:

یہ خالد حمودہ کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے۔

(۴۴) ثبت محمد حياة السندي:

اس کے قلمی نسخے پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) اور مکتبہ وطنیہ (تیونس) میں ہیں۔

(۴۵) إجازة في الحديث:

اس کا مخطوطہ جامع مسجد (بمبئی) کی لائبریری میں ہے۔

(۴۶) إجازة لمحمد حياة السندي من عبد الله بن سالم البصري:

یہ مکتبۃ الملک عبدالعزیز (ریاض) میں موجود ہے۔

(۴۷) الوجازة في الإجازة للكتب الحديث مع ذكر بعض الأحاديث

ا مستازة:

اس کا ذکر "النفس اليماني" (ص: ۵۵) میں ہے۔ ممکن ہے یہ مذکورہ اثبات واجازات میں سے کوئی ہو۔

۴۸ رسالة في الأحاديث المسلسلة:

اس کا ذکر نواب صدیق حسن خان نے ابجد العلوم میں کیا ہے۔ اس کی ایک روایت "مسلسل بالسُّبحة" شیخ محمد عبدالباقی ایوبی نے "المناهل السلسلة" (ص ۳۳، ۳۴) میں علامہ السندھی کے واسطہ سے نقل کی ہے۔ شیخ ایوبی نے علامہ سخاوی رحمہ اللہ (الجواهر المكللة: ۲۸۵) کے حوالے سے وضاحت کر دی ہے کہ اس کا مدار ابوالحسن علی بن الحسن بن القاسم بن المترفق البغدادی الصوفی پر ہے اور وہ وضع حدیث کے عیب سے متہم ہے۔

۴۹ رد "مواهب سيد البشر في حديث الخلفاء الاثني عشر":

"مواہب سید البشر" علامہ محمد معین سندھی کی کتاب ہے، جس کا رد علامہ محمد حیات سندھی نے کیا ہے، اس کے قلمی نسخے کا علم نہیں ہو سکا۔

۵۰ رسالة قطع النزاع:

اس کا تذکرہ بعض حضرات نے کیا ہے مگر اس کے موضوع اور قلمی نسخے کا علم نہیں ہو سکا۔

محترم شیخ عزیر شمس حفظہ اللہ نے بطور تنبیہ یہ بھی لکھا ہے: "غاية التحقيق ونهاية التدقيق" کے نام سے ایک کتاب علامہ محمد حیات سندھی کی طرف منسوب، ادارہ وقف الاخلاص حقیقت کتابوی (ترکی) سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی ہے، یہ علامہ محمد حیات سندھی کے بجائے رحمت اللہ سندھی کی تالیف ہے۔" مزید یہ بھی انھوں نے خوش خبری

دی ہے کہ علامہ سندھی کے بیس متفرق رسائل مختلف مخطوطات کی بنیاد پر ایڈٹ کیے ہیں۔ ان کے علاوہ چند اور رسائل جو سندھ کی مختلف لائبریریوں میں ہیں، کے حصول کا انتظار ہے، تاکہ ان کی بھی تحقیق و تنقیح کے ساتھ اشاعت ہو سکے۔ انھوں نے اہلِ علم سے اپیل کی ہے کہ وہ ان کے حصول میں مدد کریں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جلد ان کے حصول کی بھی سبیل پیدا فرما دے، تاکہ علامہ سندھی کے یہ نوادرات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آجائیں۔ ان کتابوں کی اطلاع دینے پر ہم مکرر شیخ عزیر شمس ﷾ کے شکر گزار ہیں۔ جزاه الله أحسن الجزاء عنا وعن المسلمين.

وفات:

علامہ سندھی رحمہ اللہ نے (۲۶/صفر ۱۱۶۳ھ بمطابق جنوری ۱۷۵۰ء) کو مدینہ منورہ ہی میں رحلت فرمائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے اور ان کے شاگردِ رشید علامہ بلگرامی نے ان کی تاریخِ وفات "رحلة شيخي" لکھی۔

اللّٰهم اغفرله وارحمه ونور ضريحه!

بشکریہ

"ترجمان الحدیث" (لاہور) ۱۹۷۹ء

مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی عظیم آبادی

برصغیر پاک و ہند میں دہلی گو علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ تاہم صوبہ بہار کو بھی بڑے بڑے افاضل و اعیان کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی اثرات کا آغاز باضابطہ طور پر سلطان قطب الدین ایبک کے سپہ سالار محمد بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا۔ مگر بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بختیار خلجی سے پہلے بھی مسلمانوں نے یہاں اپنے قدم جمانا شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے بھانجے سالار مسعود غازی کے لشکر کا اطراف بنارس تک آنا ثابت ہے۔ غازی مسعود کے رفقا دورانِ جنگ جہاں جہاں شہید ہوئے وہ مقامات گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہیں اور وہاں میلہ لگتا ہے۔ سیوان، سارن بہار ورمنیر، ضلع پٹنہ میں بھی ایسی جگہیں ہیں، جہاں یہ میلے لگتے ہیں۔[1]

غزنویوں کی لشکر کشی کے علاوہ ایک قافلہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو ”رھبان باللیل وفرسان بالنھار“ کا مصداق ہے یہ بلند مقام درویش و مجاہد سلطانی فوجوں سے مستغنی ہو کر محبت و دردمندی کے جذبات سے سرشار ہندوستانی دلوں کو آباد کرنے آئے۔ میری مراد حضرت مولانا محمد موسوم بہ تاج فقیہ ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد سے ہیں۔ جو (۵۷۶ھ۔ ۱۱۸۰ء) میں

---

(1) بہار میں اردو (ص:۱۷۹، ۱۸۰)

الخلیل① (فلسطین) سے نقل سکونت کر کے بہار کے قصبہ منیر میں تشریف لائے جو عظیم آباد (پٹنہ) سے تقریباً ۱۲ میل مغرب میں ایک قصبے کا نام ہے۔ آپ بہار میں سلسلہ سہروردیہ وفردوسیہ کے جدِ امجد سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ ''وسیلہ شریف'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت تاج فقیہ نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ منیر پر حملہ کیا وہاں کا راجہ مارا گیا اور منیر پر آپ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر منیر کی حکومت اپنے فرزندوں کے سپرد کر کے خود وطن واپس تشریف لے گئے۔ اسی سے ملتی جلتی روایت تذکرۃ الکرام کے مؤلف نے نقل کی ہے۔ جس کا ذکر مولانا عبدالرحیم زبیری رحمہ اللہ نے ''الدر المنثور في تراجم أهل صاد قفور، معروف به تذكره صادقه'' کے صفحہ: ۱۲ پر کیا ہے۔ اور مزید ایک قلمی کتاب سے اس کی تصدیق رقم فرمائی ہے مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ نے بھی ''سیرۃ الشرف'' کے حوالے سے یہی نقل کیا ہے کہ ۵۷۶ء میں یہ قصبہ فتح ہو گیا تھا۔ مگر فرماتے ہیں: یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ کیا مسلمان غزنویوں کے عہد ہی میں بہار و بنگال کی حدود میں پہنچ گئے تھے اور انھوں نے جابجا ''اسلامی عمل داری اور قبضے کی بنیاد ڈال دی تھی؟'' اسی طرح ''بہار میں صوفیائے کرام'' کے عنوان سے جناب سید شمیم احمد صاحب ڈھاکہ کا ایک مضمون معارف (ج:۹) ۱۹۶۳ء ماہ نومبر، دسمبر میں شائع ہوا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: تاریخی اعتبار سے یہ حملہ صحیح نہیں، کیوں کہ پھر ۵۹۷ء میں بختیار خلجی نے کس راجہ کے خلاف منیر پر حملہ کیا تھا؟ یہ تحقیق طلب مسئلہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ مگر اس میں شک کی کوئی گنجایش نہیں کہ

① اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے تقریباً ۱۵/۱۶ میل پر واقع ہے، اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۷۸/۳)

حضرت محمد تاج فقیہ رحمہ اللہ کی وساطت سے بہار میں اسلام پھولا پھلا۔ حضرت موصوف رحمہ اللہ اپنی اولاد کو یہاں چھوڑ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ مخدوم الملک، حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری رحمہ اللہ آپ ہی کے فرزند جناب اسرائیل کے پوتے ہیں۔

اس کے بعد محمد بختیار خلجی نے بہار کا بڑا علاقہ فتح کیا اور شاہ آباد پٹنہ، بہار شریف، مونگیر اور بھاگپور کے اضلاع سلطنتِ دہلی کے ماتحت ہو گئے۔ غیاث الدین تغلق کے عہد (م ۱۳۲۴ء) میں شمالی بہار مفتوح ہوا اور یوں یہ صوبہ آہستہ آہستہ سرنگوں ہوتا چلا گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنے پوتے عظیم الشان کو بہار کا صوبے دار مقرر کیا۔ اسی بنا پر پٹنہ کا نام ''عظیم آباد'' رکھا گیا۔[1]

مسلم عہد میں بہار کا دار الخلافہ ہونے کا شرف بھی عظیم آباد کو حاصل رہا اسی بنا پر یہاں بڑی سیاسی اور تہذیبی اہمیت پیدا ہوئی۔ ہر دور میں یہاں (بہار) شعراء، ادباء، محدثین اور فقہائے کرام کا دور دورہ رہا۔ البتہ حدیث و سنت کا رواج آٹھویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم الملک شرف الدین منیری (م ۷۸۲ھ) اور ان کے تلامذہ کے دور میں عام ہوا۔ چنانچہ صحاح ستہ، مسند ابویعلیٰ، بیہقی، مستدرک اور مشارق وغیرہ کی روایات ان کی ملفوظات و مکاتب میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ حضرت مخدوم کی خدمت میں شیخ زین الدین کا صحیح مسلم پیش کرنا بھی ثابت ہے۔[2]

آپ کے خلفا میں سے منہاج راستی پھلواری اور حضرت مظفر شمس بلخی زیادہ

---

[1] بہار میں اردو (ص: ۷۹)

[2] ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) فروری ۱۹۵۱ء

مشہور ہیں۔ اول الذکر نے پھلواری ضلع پٹنہ کو رونق بخشی۔ یہاں یہ شجرہ خوب پھلا پھولا۔ اس سلسلے کے مشاہیر میں حضرت مولانا برہان الدین قادری (م ۱۰۶۰ھ بمطابق ۱۶۵۴ء) مؤلف سیدھا رستہ، مولانا عتیق بہاری[1] (م ۱۱۴۹ء، مولانا عبدالمقتدر بن مولانا عبدالنبی بہاری، مولانا شیخ وجیہ الحق بن امان اللہ پھلواری (م ۱۰۵۰ھ) اور حضرت شاہ ظہور الحق[2] (م ۱۲۳۴ھ) حافظ صحیحین و حصن حصین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں (مجلّہ ''برہان'' فروری ۱۹۵۱ء) اور امام مظفر بن شمس الدین بلخی (م ۷۸۲ھ) حضرت مخدوم بہاری کے انتقال کے بعد ان کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے آپ کثیر التصانیف ہیں اور سو کے قریب آپ کے مکاتیب ملتے ہیں، جنھیں مولوی عبدالرحمان بہاری نے ترجمہ کر کے مع متن طبع کرانا چاہا تھا۔ ۳۰/۳۲ مکاتیب طبع بھی ہوئے۔ بقیہ مکاتیب پروفیسر معین الدین دروائی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ نیز خدا بخش خاں بانگی پور لائبریری میں بھی ان کے مکتوبات ہیں اور ایک مطبوعہ دیوان فارسی میں بھی ملتا ہے۔[3]

اس کے بعد یہ خطہ مسلسل علما و فضلا کی آماجگاہ بنا رہا۔ بہار کی تاریخ حدیث کے سلسلے میں جن کے اسمائے گرامی رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ رہیں گے۔ ان میں

---

① شیخ محمد عتیق اپنے چچا مولانا عبدالمقتدر کے شاگرد ہیں ''نزهة الخواطر'' (۶/۳۳۰) اور شیخ وجیہ الحق حضرت شیخ محمد عتیق کے شاگرد ہیں۔ ''أخذ الحديث عن الشيخ محمد عتيق البهاري وقرأ عليه المشكاة والصحيحين وأجاز لسائر كتب الحديث''. ''نزهة الخواطر'' (۶/۳۹۷) بلکہ سید عبدالحی مرحوم نے شیخ محمد عتیق بہاری کا وہ اجازہ نامہ جو انھوں نے شیخ وجیہ الحق کو دیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ ''نزهة الخواطر'' (۶/۳۳۰) میں نقل بھی فرمایا ہے۔ و نہ درہ!

② آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ سے بھی اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ ''نزهة الخواطر'' (۷/۲۲۶)

③ بہار میں اردو (ص: ۱۵۲) نیز دیکھیے: ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) ۱۹۵۱ء فروری۔

شیخ الکل حضرت مولانا سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) مولانا شاہ نور علی محدث سہسرامی (م ۱۲۶۲ھ) تلمیذ شاہ اسحاق دہلوی، مولانا فرحت حسین (م ۱۲۷۴ھ)، مولانا شاہ واحق عظیم آبادی، مولانا عنایت علی (م ۱۲۷۳ھ)، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی مصنف ''حسن البیان''، مولانا محمد ابراہیم آروی (م ۱۳۲۳ھ)، مولانا رفیع الدین سکوانوی، مولانا ظہیر احسن شوق نیموی، صادقین صادق پور، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید عبدالحی اور ہمارے مولانا شمس الحق ڈیانوی سرِفہرست ہیں۔ اس مقالے میں انہی موٴخر الذکر حضرت مولانا محمد شمس الحق محدث ڈیانواں اور ان کی خدماتِ حدیث کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کرنا ہے۔

اس کم سواد کو نہ تو حضرت موصوف سے مصاحبت اور نہ ان کے تلامذہ ومتوصلین سے منسبت ومجالست کہ ان کے احوال و واقعات کا پتا لگایا جا سکے۔ صدافسوس کہ عظیم آباد کے اس عظیم محدث کے متعلق ان کے احبا و اقربا نے بھی کوئی قابلِ ذکر مواد نہیں چھوڑا۔ جن سے ان کی زندگی کے اوصاف ومحاسن اجاگر ہو سکیں اور کسی بزرگ کے سوانح کی ترتیب کے لیے یہی اجزا ترکیب ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو بکھرے ہوئے آثارِ مرحوم اخبار ''اہلِ حدیث'' (امرتسر)، [1] مجلّہ ''برہان'' (دہلی)، [2] ''ترجمان'' (دہلی) [3] اور ''الاعتصام'' (لاہور) [4] وغیرہ میں ہیں، وہ ہمارے زیرِ نظر ہیں اور غنیمت ہیں، مگر انتہائی مختصر۔ بھلا جس شخصیت نے پوری ربع صدی حدیث کی خدمت میں صرف کر دی ہو، اخبار کے تین صفحات میں ان

(1) ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' (امرتسر) ج ۱۶، شمارہ ۴۸، ۱۶ صفر ۱۳۳۸ھ بمطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء

(2) ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) فروری ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۱ء

(3) ''ترجمان'' (دہلی) ۱۵ر جولائی ۱۹۶۰ء

(4) ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) ۱۱ دسمبر ۱۹۷۰ء

کے حالات کا استیعاب اور ان کی علمی خدمات کو کیونکر اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ سنا ہے کہ ''حیاۃ المحدث شمس الحق و اعمالہ'' کے عنوان سے ہمارے ایک ہندوستانی سلفی بھائی نے ان کے آثارِ علمیہ کو جمع کیا ہے۔[1] حضرت موصوف سے عقیدت اور محبت ان سطور کا باعث بنی ہے اور بمصداق مشتے نمونہ از خروارے جو کچھ پایا، ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں اور اپنے شوق کو تسکین دے رہا ہوں۔

نام و نسب:

محمد، نام کنیت ''ابو الطیب'' اور مشہور ''شمس الحق'' ہیں (اہلِ حدیث و ہان) یہی نام خود انھوں نے عون المعبود (۵۴/۴) میں اور اپنی بعض دیگر تصانیف میں لکھا ہے۔ مگر مولانا سید عبدالحی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں آپ کا نام شمس الحق بتایا ہے۔ والدِ ماجد کا اسم گرامی امیر علی تھا اور سلسلۂ نسب یہ ہے۔ شیخ محمد بن شیخ امیر علی بن مقصود علی بن شیخ غلام حیدر بن شیخ ہدایت اللہ جو بالآخر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ والدہ کی جانب سے بھی ان کا سلسلۂ نسب سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، یوں گویا آپ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے صدیقی شیخ ہیں۔ (''اہلِ حدیث''، ''ترجمان'' وغیرہ)

وطن و پیدائش:

۲۷ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ، بمطابق جولائی ۱۸۵۷ء) کو عظیم آباد (پٹنہ) کے محلہ رمنہ میں ولادت باسعادت ہوئی۔ (''اہلِ حدیث'' امرتسر، ''ترجمان'' دہلی)

[1] زیرِ نظر مضمون کا ایک حصہ لکھا جا چکا تھا کہ سندھ جانے کا اتفاق ہوا تو سیدی پیر محب اللہ شاہ صاحب راشدی مدظلہ کے ہاں یہ رسالہ بھی مل گیا۔ اس سے ہم نے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھایا ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ. یہ سلفی بھائی فضیلۃ الشیخ مولانا عزیر شمس صاحب حفظہ اللہ نزیلِ مکہ مکرمہ ہیں۔

مگر مولانا شفیع احمد بہاری نے آپ کا مولد ڈیانواں ہی نقل کیا ہے۔ (برہان: جولائی ۱۹۵۱ء) لیکن یہ صحیح نہیں۔ پانچ سال کی عمر تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ اپنے بچوں کے ہمراہ اپنے میکے یعنی ڈیانواں [1] میں آ گئیں۔ پھر آپ ہمیشہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اسی بنا پر ڈیانوی مشہور ہوئے۔ بچپن ہی کی عمر میں (م۱۲۸۴ء) میں والدِ گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ نے اپنے بڑے ماموں مولوی محمد حسین کے ہاں تربیت پائی، جو آپ کو حقیقی فرزند سمجھتے اور آپ کی تعلیم اور ساری خواہشوں کے کفیل تھے! ("اہلِ حدیث")۔

تعلیم و تربیت اور شیوخ و اساتذہ

۱۲۷۹ھ میں جب آپ کی عمر چھے برس کی ہوئی تو مولانا ابراہیم [2] بن مدین اللہ بن امان اللہ نگرنہسوی (م۱۲۸۲ھ) سے تعلیم کا آغاز کیا۔ استادِ محترم نے تفننِ طبع کا ثبوت دیتے ہوئے تعلیم کا آغاز ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ [العلق: ۱] سے کیا ہے۔ ڈیانواں ہی میں قرآن مجید حافظ محمد اصغر رامپوری رحمہ اللہ سے ختم کیا۔ جو اس وقت

[1] مولانا شفیع احمد بہاری نے اول تو اس قصبے کا نام ڈبانواں ذکر کیا ہے۔ ثانیاً لکھا ہے کہ پٹنہ سے جنوب و مشرق میں واقع ہے۔ "برہان" (جولائی ۱۹۵۱ء) مگر مولانا عبدالرشید فوقانی نے لکھا ہے کہ ڈیانواں پٹنہ سے چھے میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں سادات و شیوخ کی قدیم آبادی ہے "حاشیہ القول الحسن" (ص: ۱۰)۔

[2] آپ نے کتبِ احادیث مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی اور کتبِ معقول مولوی نور الاسلام پوری سے پڑھیں۔ مولانا صدر الدین سے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ "تذکرۃ النبلاء" میں محدث ڈیانوی نے ان کا ترجمہ لکھا ہے اور اسی کے حوالے سے سید عبدالحی نے ان کا ذکر "نزھۃ الخواطر" (۵/۷) میں کیا ہے مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی (استاذ علامہ نیموی) نے آپ کی تاریخِ وفات پر ایک قطع لکھا۔ جس میں "شد بگلزار جنت ابراہیم" سے سنِ وفات نکالا۔ "القول الحسن" (ص: ۲۰، ۲۱)

آپ کے نانا مرحوم شیخ گوہر علی کے دربار میں معلم تھے۔ تقریباً ایک سال بعد آپ نگرنہسہ تشریف لے گئے۔ مولانا ابراہیم رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: قرآن مجید کی کوئی سورت سناؤ تو آپ نے سورۃ ﴿وَالضُّحٰی﴾ پڑھ کر سنائی۔ مولانا مرحوم نے اس کے معانی و مطالب سنانا شروع کر دیے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اس وقت اتباعِ سنت کا شوق دل میں جاگزیں ہوگیا۔ اسی دوران میں ابتدائی فارسی کتب مولوی سید راحت حسین بھوی سے پڑھیں اور بعض مختصراتِ نحو اور معقولات ایک ماہر عالم مولوی عبدالحکیم صاحب شیخ پوری سے پڑھیں۔ اور اپنے ماموں مولانا نور محمد صاحب سے بھی بعض صرف و نحو کی کتابوں کا درس لیا۔ (اہلِ حدیث و ترجمان) ابتدائی فنون سے فراغت کے بعد ۱۲۸۸ھ میں عمدۃ المعقول والمنقول حاوی فروع و اصول مولانا لطف علی بہاری (م ۱۲۹۶ھ) سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور ان سے شرح جامی قطبی، میبذی شرح وقایہ، اصول الشاشی، نور الانوار، کنز الدقائق وغیرہ متوسطات پڑھیں اور حدیث میں جامع ترمذی کی بھی قراءت تحقیق و تنقیح سے کی۔ مولانا موصوف صوبہ بہار کی معروف علمی شخصیت تھی۔ معقول و منقول اور اصول و فروع میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ شیخ الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ مولانا فضل حق رحمہ اللہ خیرآبادی اور مفتی صدر الدین جیسے اکابر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

استفارِ علمیہ:

الغرض ۱۲۹۱ھ تک اپنے مسکن ڈیانواں ہی کے اہلِ علم و فضل سے استفادہ کرتے رہے۔ تحصیلِ علم کا شوق دل میں موجزن تھا۔ اسی بنا پر دوسرے مشائخ کی خدمت میں جانے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ ۱۲۹۲ھ میں لکھنؤ کا قصد کیا۔ وہاں پہنچ کر

امام المعقولین مولانا فضل اللہ[1] (م ۱۳۱۲ھ) بن امام الریاضین مولانا مفتی نعمت اللہ سے سال بھر معقولات کی مزید کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد (۲۶/ محرم الحرام ۱۲۹۳ھ) کو مراد آباد کا رخ کیا۔ وہاں امام الصلحا مولانا قاضی محمد بشیر الدین قنوجی[2] (م ۱۲۹۶ھ) سے اکتسابِ فیض کیا۔ جہاں انھوں نے سال بھر میں بقیہ کتبِ درسیہ معقول و معانی وغیرہ کی تکمیل کی۔ سال بھر وہاں قیام کے بعد شروع ماہ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں وطن واپس تشریف لے آئے۔ جب آپ وطن واپس پہنچے تو احباب واقارب نے ۵/ ربیع الاول کو آپ کی شادی مولوی عبداللطیف صاحب صدیقی چھپروی کی صاحبزادی سے کر دی۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۱/ ۲۲ برس کے قریب تھی۔ مگر علم کی پیاس نے گھر میں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ ۲۰ جمادی الاولی کو دوبارہ مراد آباد حضرت مولانا قاضی بشیر الدین صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچے، وہاں سات ماہ قیام فرمایا اور کتبِ معقولات و معانی کے علاوہ قرآن مجید کا ترجمہ اور مشکاۃ المصابیح کا کچھ حصہ نہایت تحقیق سے پڑھا۔ اس کے بعد اوائلِ محرم ۱۲۹۵ھ میں سال بھر حضرت میاں صاحب کی خدمتِ اقدس میں رہے۔ بالآخر محرم ۱۲۹۶ھ میں علومِ تفسیر و حدیث کی تکمیل اور ان کی سندِ تکمیل[3] حاصل کر کے واپس اپنے وطن ڈیانواں تشریف لائے اور آتے ہی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ لیکن ۱۳۰۲ھ میں ایک بار پھر حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اب کی بار وہاں پورے دو

[1] ترجمہ کے لیے دیکھیں ''نزہۃ الخواطر'' (۳۶۴/۸)

[2] صاحبِ ترجمہ نے ان کا تذکرہ جمیلہ مقدمہ ''غایۃ المقصود'' (ص: ۱۳) کے حاشیہ میں کیا ہے اس سفر میں صاحبِ ترجمہ کے ہمراہ ان کے بھائی مولانا محمد اشرف بھی تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے ''إعلام أهل العصر'' (ص: ۲) میں کیا ہے۔

[3] یہ جازہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ ''حیاۃ المحدث'' (ص: ۱۱)

سال رہے اور شیخ الکل سے خوب خوب اکتسابِ علوم کیا اور آپ سے علاوہ صحاح ستہ کے موطا، سنن دارمی، سنن دارقطنی، جلالین وغیرہ کتب کمالِ ضبط و اتقاق سے پڑھیں۔ اسی اثنا میں شیخ ہی کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے۔ فتاویٰ نذیریہ میں آپ کے بعض فتاویٰ غالباً اسی دور کے ہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۰۳ھ میں جب آپ نے واپس وطن آنے کا عزم کیا تو حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے دوبارہ سندِ فراغت عطا فرمائی۔ (اہلِ حدیث و ترجمان) اسی دوران میں ۱۳۰۴ھ ہی میں شیخ العلما قاضی حسین بن محسن الانصاری یمنی (م ۱۳۲۷ھ) سے صحاح کے اطراف کی قراءت کی اور ان سے بھی اجازہ[1] حاصل کیا۔ پھر وطن واپس لوٹ آئے اور اپنے گھر ہی میں رہ کر درس و تدریس، افتا و تصنیف اور کتبِ حدیث کی تصحیح و تشریح میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ (اہلِ حدیث)

علامہ ڈیانوی رحمہ اللہ نے گو متعدد شیوخ اور ائمہ فن سے استفادہ کیا تھا، مگر حدیث کا اکتساب ہندوستان کی مشہور محدث خاندانِ ولی اللہ کے جانشین حضرت شیخ الکل میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ اور شیخ حسین بن محسن انصاری رحمہ اللہ سے کیا۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

”اللمعة الخامسة في ترجمة الشيخين الأكبرين اللذين أخذت عنهما هذا السنن وسائر كتب الحديث والتفسير فأولهما المحدث المفسر الفقيه الحاج شيخنا العلامة زين أهل الاستقامة مولانا السيد محمد نذير حسين .. وثانيهما: شيخنا العلامة البدر المنير الفهامة العمدة النحرير

[1] یہ اجازہ بھی خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ ”حیاۃ المحدث“ (ص: ۱۱)

ذو المناقب الجليلة والمحامد الشريفة المدقق الكامل، و بحر الذي ليس له في سعة النظر من ساحل، جمال العلماء الصالحين، شيخ الإسلام والمسلمين، البارع المحدث المتقن، والمفسر المتبحر الفطن، الحاج القاضي حسين بن محسن الأنصاري الخزرجي السعدي اليماني أدام الله بركاته علينا''[1]

حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ اگر میں حجرِ اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے مابین کھڑا ہو کر حلف اٹھاؤں کہ میری آنکھوں نے ان جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا اور نہ خود انھوں نے علم، عبادت، زہد، صبر و کرم، حسنِ خلق اور حلم والا کسی کو دیکھا ہے تو میں حانث نہیں ہوں گا۔[2]

جس سے ان حضرات کی جلالتِ شان اور محدث ڈیانوی کی نگاہ میں ان کے علوِ مرتبت کا پتا چلتا ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کا مختصر تعارف و تذکرہ بھی نقل کر دیا جائے۔

① شیخ الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ:

آپ کا مولد موضع بلتھوا ضلع مونگیر (صوبہ بہار) سنِ ولادت اور مہینے کی تعین میں سیرت نگاروں کا اختلاف ہے۔ البتہ ''الحیاۃ بعد المماۃ'' کے مرتب مولانا فضل حسین صاحب بہاری نے ۱۲۲۰ھ کو اختیار کیا ہے۔[3] باپ کا نام جواد علی تھا۔ حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے اور ۳۴ واسطوں سے نسب نامہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

---

[1] مقدمہ غایۃ المقصود (ص: ۱۰، ۱۷)

[2] أيضاً مقدمہ ''غایۃ المقصود''

[3] الحیاۃ بعد المماۃ

عہدِ طفولیت لہو ولعب میں گزرا۔ والدِ محترم کے ایک دوست کے ایما پر ابتدائی فارسی کی کتابیں والد ماجد ہی سے پڑھنا شروع کر دیں۔ علم کا شوق بڑھا تو تحصیلِ علم کے لیے اپنے ایک دوست مولوی مراد علی کے ساتھ صادق پور کا رخ کیا۔ وہاں مولانا شاہ محمد حسین رحمہ اللہ کے مدرسے میں پہنچے جو اس وقت صوبہ بہار کی مرکزی درس گاہ خیال کی جاتی تھی۔

بعد ازیں اپنے ساتھی مولوی مراد علی کے ہمراہ دہلی کا رخ کیا۔ ارادہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے درس سے براہِ راست اکتسابِ فیض کیا جائے۔ مگر یہ مسافرت کی صعوبتوں اور نامساعد حالات کے باعث اس وقت دہلی پہنچے، جب کہ شاہ صاحب اس سے قبل رحلت فرما چکے تھے اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت شاہ محمد اسحاق اپنی خاندانی مسند پر بیٹھے علم و عرفان کی بارش برسا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر پہلے علومِ عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی۔اس سلسلے میں متداولات مولانا عبدالخالق (م ۱۲۶۱ھ) مولانا شیر محمد (م ۱۲۵۷ھ)، مولانا جلال الدین اور مولانا کرامت علی سے پڑھیں اور علمِ ہیئت و ہندسہ کی تکمیل مولانا محمد بخش المعروف بہ تربیت خاں سے کی، جو اس وقت کے مشہور مہندس تھے اور ادبیات کی تحصیل مولانا عبدالقادر رامپوری سے کی۔

علوم وفنون سے فارغ ہو چکے تو حضرت شاہ اسحاق دہلوی سے حدیث وتفسیر کی کتابیں پڑھیں اور آخری ایام تک ان کے ساتھ ہی وابستہ رہے اور جب ۱۲۵۸ھ میں انھوں نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو اسی سال ان سے اجازہ حاصل کیا۔ ان کے بعد ۱۲۷۰ھ تک تو جملہ علوم وفنون کی تدریس کرتے رہے۔ لیکن ۱۳۰۴ھ میں خالصتاً اپنے آپ کو تفسیر و حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کی جانشینی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا کہ ''میاں صاحب'' کا لقب جو خاندانِ ولی اللہ کے

لیے چلا آ رہا تھا، اس کے ساتھ آپ ملقب ہوئے اور ''میاں صاحب'' کے پیارے لقب سے پکارے جانے لگے۔ خاندان ولی اللہ کی صحیح جانشینی اور ساٹھ سال تمام علوم بالخصوص درسِ حدیث کی وجہ سے ''شیخ الکل فی الکل'' کا لقب ملا۔ اکابر اہلِ علم نے جن الفاظ سے آپ کے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کا استیعاب مشکل ہے اور ''الحیاۃ بعد المماۃ'' وغیرہ میں وہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف دو شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، جن کا ذکر متقدمین تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا۔

مولانا امیر علی تلمیذِ رشید مولانا عبدالحی لکھنوی مترجم عالمگیری و مصنف تفسیر مواہب الرحمان، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے اپنے سلسلۂ سند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واعلم أن إسنادي اتصل إلى الشيخ الإمام المصنف رحمه الله عن شيخنا الإمام شرف الأنام الزاهد العابد العالم الرباني الذي ما أحسبني رأيت مثله بعيني هاتين مولانا السيد نذير حسين الدهلوي الخ''[2]

''امام مصنف (ابن حجر رحمہ اللہ) سے میری سند بواسطہ ہمارے شیخ امام شرف الانام زاہد عابد عالم ربانی ایسا کہ میری ان دونوں آنکھوں نے ان جیسا کسی کو نہیں دیکھا۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی ہیں۔''

شیخ غلام فرید[3] سے کون واقف نہیں۔ اشارات فریدی میں ان سے منقول ہے۔

---

[1] ''اہلِ حدیث'' (دہلی) ۲۱ صفر ۱۳۸۰ھ بمطابق ۱۵ اگست ۱۹۲۰ء میں مولانا حکیم عبدالشکور گوڑ گانوی کا ایک مفصل مضمون بعنوان ''حضرت شیخ الکل مجدد رحمانی رحمہ اللہ کا سن ولادت و عمر شریف شائع ہوا جس میں مختلف اقوال نقل کر کے آپ کا سنِ پیدائش (۱۲۲۰ھ) ہی صحیح قرار دیا ہے۔

[2] تذييب لتعقيب التقريب (ص: ٣٤)

[3] خواجہ غلام فرید سے اہلِ پنجاب اور بالخصوص اہالیان بہاولپور غافل نہیں۔ انہی کے ایک ←

''بعد ازاں سخن بہ نسبت مولوی نذیر حسین محدث دہلوی افتاد حضرت قطب الموحدین خواجہ محمد بخش ادام اللہ تعالیٰ عرض کردند، قبلہ مردم مولوی نذیر حسین راغیر مقلد وہابی مے گویند۔ او چگونہ شخص است، حضور فرمودند کہ سبحان اللہ وے یکی از اصحاب می نماید آنگاہ فرمودند کہ ایں امر کافی است برائے انسان کہ مثل او در جہاں نباشد۔ پس وے اکنوں فی زماننا ہذا در علم حدیث شریف نظیر و مانندے نمی دارد و چناں بے نفس است کہ ہیچ کسی راز فرقہ ہائی اہل اسلام بدنمی گوید اگر چہ مردم رو بروئے اُورا ناسزا و بدمیگویند او کسے رانمی گوید الخ''[1]

''ارشاداتِ فریدی'' کا اردو ترجمہ حال ہی میں ''اسلامک فاونڈیشن لاہور'' کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ہم مذکورۃ الصدر عبارت کا ترجمہ مترجم کتاب کے الفاظ سے نقل کرنا مفید سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں:

غالی عقیدت مند کا یہ شعر ہے ؏

چاچڑ وانگ مدینہ ڈسے تے کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر دے وچ پیر فریدن باطن دے وچ اللہ

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی مفید ہو گا کہ شیخ موصوف سے کسی نے پوچھا کہ شیعہ اور وہابیوں میں کیا فرق ہے تو اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: وہابی نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہتے نہ ولایت کے منکر ہیں اس کے برعکس شیعہ ولایت کے بھی منکر ہیں اور توحید کے بارے میں وہابیوں کے عقائد صوفیائے کرام سے ملتے جلتے ہیں۔ وہابی کہتے ہیں کہ انبیا اور اولیا سے مدد مانگنا شرک ہے، بے شک غیرِ خدا سے امداد مانگنا شرک ہے توحید یہ ہے کہ خاص حق تعالیٰ سے طلب کرے۔ چنانچہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا مطلب یہی ہے۔
''اشاراتِ فریدی'' مترجم (ص: ۷۹۶، ۷۹۷)

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ﴾[ق: ۳۷]

[1] ''اشارات فریدی'' (۴/ ۱۸۵، ۱۸۶) مطبع رفیق عام لاہور (م ۱۳۲۶ھ)

'اس کے بعد مولوی نذیر حسین محدث دہلوی کا ذکر ہونے لگا۔
قب الموحدین حضرت خواجہ محمد بخش نے عرض کی کہ حضور لوگ مولوی
ذیر حسین کو غیر مقلد اور وہابی کہتے ہیں وہ کیسے آدمی تھے؟ آپ نے فرمایا:
سبحان اللہ وہ تو ایک صحابی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کسی شخص کی
عظمت کے لیے یہی کافی دلیل ہے کہ دنیا میں اس کی مانند کوئی نہ ہو۔
چنانچہ آج کل کے زمانے میں علم حدیث میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔ نیز وہ
اس قدر بے نفس ہیں کہ اہلِ اسلام کے کسی فرقے کو برا نہیں کہتے۔
اگرچہ لوگ ان کو منہ پر بُرا بھلا کہتے ہیں، لیکن وہ کسی کو برا نہیں کہتے، یہ
بات کس میں ہے؟! اب اگرچہ وہ بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ تاہم وہ اپنا
کام خود کرتے ہیں۔ حتی کہ مہمان کو کھانا بھی خود اٹھا کر دیتے ہیں۔ وہ
کسی شخص سے نہیں پوچھتے کہ تم صوفی ہو یا کیا مذہب رکھتے ہو۔''[1]

علم و عرفان کا یہ ماہتاب ۱۰ رجب بروز دو شنبہ ۱۳۲۰ھ بمطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء نمازِ مغرب کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ مگر اپنے بعد تلامذہ کا ایک لامتناہی سلسلہ چھوڑ گیا۔ جو ہند کے گوشے گوشے سے تعلق رکھنے والے تھے اور جن میں عجب طرح کا تنوع پایا جاتا ہے۔ بعض نے سیدین شہیدین رحمہما اللہ کی تحریک مجاہدین کی سرپرستی کی اور بعض نے تدریس و تصنیف کا اثر قبول کیا۔ بعض میں وعظ و تبلیغ اور مناظرات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے اور بعض میں اصلاحِ احوال اور تربیتِ عوام کا جذبہ موجزن نظر آتا ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، محدث ڈیانوی رحمہ اللہ مقدمہ ''غایۃ المقصود'' (ص: ۱۱) میں حضرت میاں صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

[1] ''ارشاداتِ فریدی'' مترجم (ص: ۲۹۷) مقبوس (ص: ۸۵)

اللہ تعالیٰ نے تین صفات خاص طور حضرت شیخ الکل میں جمع کر دی تھیں۔

① تقویٰ وخشیتِ الٰہی اور مکارمِ اخلاق کے پیکر تھے۔

② تفسیر و حدیث اور فقہ میں یگانۂ روزگار۔

③ اصحابِ فضائل اور اہلِ تحقیق تلامذہ کا وسیع ترین حلقہ ان کی سرکار سے وابستہ تھا۔

سید عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اصحابِ علم و نقد کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے اور ان کے تلامذہ کے طبقۂ اولیٰ و ثانیہ کی تعداد کئی ہزاروں میں ہے۔[1]

یہاں یہ لطیفہ بھی معلوم کیجیے کہ ان کے تلامذہ میں شیخ ابو الخیر احمد بن عثمان المکی الہندی رحمہ اللہ بھی ہیں اور انہی کے واسطے سے علامہ عبدالحی الکتانی رحمہ اللہ کو حضرت میاں صاحب سے تلمذ حاصل ہے۔ شیخ ابو الخیر کا ثبت ''النفح المسكي لمعجم شيوخ أحمد المكي'' کے نام سے ہے علامہ الکتانی نے ذکر کیا ہے کہ میاں صاحب کے ''وہابی'' ہونے کی وجہ سے شیخ ابو الخیر نے انھیں اپنے شیوخ میں ذکر نہیں کیا۔[2] سبحان اللہ

② الشیخ العلامۃ القاضی حسین بن محسن الانصاری رحمہ اللہ:

آپ حضرت ڈیانوی کے دوسرے قابلِ فخر استاد ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز کیا۔ علامہ سید حسین بن عبدالباری رحمہ اللہ سے مکمل آٹھ سال تک استفادہ کیا اور سندِ فضیلت حاصل کی ان کے علاوہ اپنے بھائی شیخ محمد بن محسن انصاری رحمہ اللہ پر بھی ''صحیح بخاری'' کی قراءت کی۔ بعد ازیں امام شوکانی رحمہ اللہ کے صاحبزادے علامہ قاضی احمد رحمہ اللہ سے بھی اجازہ حاصل کیا

[1] نزهة الخواطر

[2] فهرس الفهارس (۲/۵۹۳-۶۹۴)

اس کے ساتھ ساتھ مکہ مکرمہ میں علامہ محمد بن ناصر الحازمی رحمہ اللہ سے کئی بار ملاقات کی اور ان پر صحاح ستہ کے علاوہ سنن دارمی، شمائل ترمذی کی قراءت کی۔ نیز اوائل کتبِ حدیث شیخ محمد سعید المدنی سے پڑھیں اور ان سے ان کی جمیع مرویات و مسموعات کی اجازت حاصل کی۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ دو مرتبہ ان کی زیارت سے مشرف ہوئے لکھتے ہیں:

"وقرأت عليه أطرافاً و مواضع متفرقة من الصحاح الستة وسنن الدارمي والدارقطني ... وغير ذلك و أجازني بجميع مروياته ومسموعاته إجازة عامة كما هي موجودة بخطه الشريف"[1]

قاضی صاحب رحمہ اللہ موصوف کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمہ اللہ جیسے باکمال صاحبِ علم و فضل ان کے تلامذہ کی صف میں شامل ہیں۔ حضرت نواب صاحب نے ابجد العلوم میں اپنے استاذِ محترم کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں:

"وقد ذكرت ترجمة شيخنا العلامة في موضع آخر البسيط من هذا" (مقدمه غاية)[2]

شیخ الحدیث مولانا حیدر حسین خان ٹونکی متصلب حنفی تھے، قاضی صاحب کے تلمیذ اور ان کے بڑے مداح تھے، مولانا ابو الحسن ندوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "میں نے ان سے سنا، فرماتے تھے کہ قاضی صاحب کو فتح الباری کی تیرہ (۱۳) جلدیں تقریباً حفظ اور مستحضر تھیں، جہاں سے چاہتے تھے اس کا مضمون سنا دیتے تھے۔"[3]

---

[1] مقدمہ غایہ (ص: ۱۷)

[2] غالباً اس سے مراد ان کی کتاب "نهاية الرسوخ في معجم الشيوخ" ہے۔ والله تعالیٰ أعلم.

[3] پرانے چراغ (۱/۱۸۶، ۲۱۰)

درس و تدریس:

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ تحصیلِ علوم کے بعد ڈیانواں ہی میں درس و تدریس وعظ و تذکیر اور افتا و تصنیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مولانا ابو القاسم بنارسی رحمہ اللہ، جو حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ہیں، کا بیان ہے کہ آپ کے درس میں عرب و عجم کے طلبا بھی دیکھے گئے اور بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا۔[1]

مولانا سید عبدالحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ثم رجع إلى بلدته وعكف على التدريس والتصنيف والتذكير وبذل جهده في نصرة السنة، والطريقة السلفية، وإشاعة كتب الحديث"[2]

حدیث و سنت سے محبت کا یہی نتیجہ تھا کہ علمائے حدیث سے محبت تھی اور طلبا پر بھی بہت شفقت کا اظہار فرماتے۔ قدیم ہند کے رواج کے مطابق بیوہ عورتوں کا نکاح معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خود آپ کے گاؤں میں اس فعل شنیع پر عمل ہوتا تھا۔ آپ پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے اپنے وطن ڈیانواں میں نکاح بیوگان کو جاری فرمایا۔[3]

کتبِ حدیث کی نشر و اشاعت:

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی علمی خدمات کا تذکرہ تو ہم ان شاء اللہ ان کی تصانیف کے تحت کریں گے۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ احادیث اور رجالِ حدیث کی بعض کتابیں جنھیں دیکھنے کے لیے بڑے بڑے علما کی آنکھیں ترستی تھیں۔ آپ ہی کی

---

[1] "اہلِ حدیث" (امرتسر)

[2] "نزهة الخواطر" (۱۷۹/۸)

[3] "اہلِ حدیث" (امرتسر)

مسائل جمیلہ سے منصۂ شہود پر آئیں۔ چنانچہ ''سنن دارقطنی'' کا ظہور پہلی بار آپ ہی کی تعلیقات سے ہوا، جس کی تفصیل ان شاء اللہ آیندہ آ رہی ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ کی ''تہذیب السنن'' اور امام منذری رحمہ اللہ کی ''تلخیص السنن'' بھی پہلی بار آپ کے کتب خانہ کے نسخوں سے ''غایۃ المقصود'' کے حاشیہ میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی، مگر ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

اس کے علاوہ امام بخاری رحمہ اللہ کی ''خلق افعال العباد''، علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی ''کتاب العرش والعلو...'' بھی آپ ہی کے کتب خانہ کے اصل نسخوں کے مطابق پہلی بار ''اعلام اہل العصر'' کے ہمراہ ۱۳۰۶ھ میں طبع ہوئیں۔ (''برہان'' دہلی و اشتہار کتب ملحقہ اعلام)

اسی طرح بخاری رحمہ اللہ کی ''التاریخ الصغیر'' اور ''الضعفاء الصغیر'' اور امام نسائی رحمہ اللہ کی ''کتاب الضعفاء والمتروکین'' بھی آپ ہی کی توجہ خاص سے پہلی بار طبع ہوئیں۔ جس کا اظہار مولانا محمد محی الدین الہ آبادی مرحوم نے خاتمۃ الطبع میں فرمایا ہے، بلکہ ان تینوں کتابوں پر بعض مشکل مقامات کی توضیح و تصحیح سے متعلقہ حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ کی ''الادب المفرد'' جو کہ مطبع خلیلی میں طبع ہوئی اور اس پر بھی محدث ڈیانوی کے بعض توضیحی نوٹس ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''التلخیص الحبیر'' کی طباعت کا پہلی بار انتظام مولانا تلطف حسین رحمہ اللہ نے آپ ہی کے حکم سے کیا۔ جیسا کہ انھوں نے ''التلخیص'' کے خاتمہ الطبع (ص: ۴۱۶) میں صراحت کی ہے۔

مولانا بناری نے لکھا ہے:

''حیدر آباد کے معروف مطبع دائرۃ المعارف کے آپ رکن تھے۔

’’تہذیب التہذیب‘‘ اور ’’تذکرۃ الحفاظ‘‘ آپ ہی کے مشورے سے ط ع ہوئیں۔ آخری ایام میں علامہ سمعانی کی ’’الانساب‘‘ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ’’لسان المیزان‘‘ اور حافظ ابن عبدالبر کی ’’التمہید‘‘ کی طباعت کا ارادہ فرمایا تھا، مگر عمرِ مستعار نے ساتھ نہ دیا اور اسی حسرت کو لیے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔‘‘[1]

دیگر خدمات:

اس کے علاوہ علمائے کرام کی ایک جماعت جو آپ کی شریک کار تھی ان کے مختلف رسائل کا ظہور بھی آپ ہی کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ علامہ نیموی رحمہ اللہ نے جب آثار السنن لکھی تو اس کا جواب محدث مبارکپوری نے اولاً بصورتِ اشتہار بنام "إعلام أهل الزمن" محدث ڈیانوی کے حکم سے حضرت کے دولت خانہ پر بیٹھ کر لکھا اور پھر "أبكار المنن" کے نام سے اس کا مستقل جواب بھی آپ ہی کے حکم سے شروع کیا۔ اسی طرح علامہ نیموی رحمہ اللہ نے مسلک کے موافق "جامع الآثار" بستیوں میں جمعہ کے عدمِ جواز پر ایک رسالہ لکھا تو اس کا جواب بھی حسبِ ارشاد محدث ڈیانوی مولانا مبارکپوری نے "نور الأبصار" کے نام سے تحریر فرمایا۔ "نور الأبصار" پر پھر علامہ نیموی نے محاکمہ کیا تو اس کا جواب بنام "ضياء الأبصار" بھی حضرت کے دولت خانہ پر بیٹھ کر مولانا مبارکپوری نے لکھا۔ اسی طرح "جامع الآثار" کا ایک اور جواب مولانا ابو المکارم محمد علی مرحوم سے بنام "المذهب المختار" بھی لکھوایا اور آپ کی اعانتِ خاص سے سعید المطابع بنارس سے طبع ہوا۔ ماضی قریب میں بالخصوص بعض اربابِ مقلدین کو امام بخاری رحمہ اللہ کی "الجامع

[1] ’’اہلِ حدیث‘‘ (امرتسر) ’’حیات المحدث‘‘ (ص: ۲۸)

الصحیح" کی ارجحیت گوارہ نہیں تھی۔ تو اس کے لیے انھوں نے مختلف رسالے لکھے۔ مولوی عمر کریم پٹنوی نے "الجرح علی البخاري" اور "الکلام المحکم" دو بڑے غلیظ قسم کے رسالے لکھے جس کے جواب کے لیے محدث ڈیانوی نے اپنے شاگرد رشید مولانا ابو القاسم بناری کو تیار کیا۔ چنانچہ انھوں نے اول کے جواب میں "حل مشکلات البخاري" چار حصوں میں لکھی اور ثانی کے جواب میں "الأمر المبرم" تحریر فرمائی۔ محدث ڈیانوی نے ثانی الذکر کی تکمیل پر نہایۃ ابن اثیر اور "تہذیب التہذیب" تحفتاً دینے کا بھی وعدہ فرمایا اور طباعت کے لیے نقد امداد کا بھی یقین دلایا۔

مولانا بناری لکھتے ہیں:

"نہایۃ تو اثنائے تصنیف میں ہی بھیج دی گئی، مگر انتظامِ طباعت سے پہلے حضرت اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جی کے جی ہی میں رہے ارمان سارے چل بسے"

اسی سلسلے میں مولوی عمر کریم کے دیگر اشتہارات و رسائل کے جواب میں مولانا بناری کے رسائل "ماء حمیم"، صراط مستقیم"، "الأمر المبرم" (ص ۲۴۳) "الریح العقیم"، "العرجون القدیم" میں بھی در پردہ آپ ہی کا ہاتھ تھا۔ "الریح العقیم" پر حضرت نے تقریظ لکھی تو اسے "سوط اللّٰہ الجبار علی فتن الملحدین الأشرار" کے نام سے یاد کیا۔

اسی طرح مقلدین حضرات نے عموماً اور مولانا شبلی نعمانی نے جب "سیرۃ النعمان" میں بالعموم محدثین پر اور خاص طور پر امام بخاری رحمہ اللہ کے متعلق غلط رویہ اختیار کیا تو ضرورت اس بات کی تھی کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی سیرت اور ان کی خدمات

کو صحیح طور پر پیش کیا جائے۔ جس کے لیے مولانا عبدالسلام مبارک پوری رحمہ اللہ نے ہمت باندھی، مگر اس کے لیے جس قدر کتب کی ضرورت تھی وہ دستیاب نہ تھیں۔ خود مولانا موصوف لکھتے ہیں:

''بے بضاعتی اور مواد کی قلت کسی طرح اس طرف قدم بڑھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ایک بار جناب مولانا ابو الطیب محمد شمس الحق صاحب عظیم آبادی سے اس کا تذکرہ ہوا۔ علامہ موصوف نے ہمت دلائی۔ کتابوں کا پشتارہ لگا دیا اور مواد کے فراہم کرنے کے لیے دور دراز ملکوں میں خطوط بھیجے۔ نسخ مطبوعہ اور قلمیہ برابر میرے پاس بھیجتے رہے۔''[1]

مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی مرحوم نے تراجم ''علمائے حدیث ہند'' (۱/۳۸۰) میں لکھا ہے کہ مولانا محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری کی علمی تالیفات جن کی تعداد پندرہ تھی، کے متعلق مولانا ڈیانوی نے ان کی اولاد سے درخواست کی کہ ان کو طبع کرائیں اور جو خرچ ہو وہ میں خود برداشت کروں گا۔ مگر افسوس کہ مولانا موصوف کی اولاد اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔ جس سے حضرت ڈیانوی کی کتبِ دینیہ کی نشر و اشاعت سے دلچسپی اور لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جن حضرات نے اپنی تالیفات میں محدث ڈیانوی کی طرف رجوع کیا اور ان کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ اس کا ذکر وسیع الذیل ہے۔ مولانا فقیر اللہ صاحب نے ''فسق معاوية من الفرقة الغاوية'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو ۱۳۲۷ھ میں مطبع اللطفي انباری مدراس سے طبع ہوا۔ تو اس پر محدث ڈیانوی نے تقریظ لکھی، جس میں ''عظمتِ صحابہ'' کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ رحمه الله رحمة واسعة

[1] سيرة البخاري (ص: ٣٥)

علم و فضلا اور معاصرین حضرات:

آپ گو علومِ دینیہ، ادبیہ اور عقلیہ کے جامع تھے، مگر زیادہ لگاؤ علمِ حدیث سے تھا، جس کا اندازہ "غاية المقصود، عون المعبود" اور "إعلام أهل العصر" وغیرہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ آپ کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جس بحث پر قلم اٹھایا، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا، جیسا کہ اس کی ضروری تفصیل آیندہ ان شاء اللہ ہم عرض کریں گے۔ تمام علما آپ کی جلالتِ شان کے معترف ہیں۔

مولانا عبدالرشید فوقانی ابن نیموی نے لکھا ہے:

"متعدد اہلِ علم نے عربی و فارسی میں ان کے متعلق مدحیہ قصائد لکھے ہیں جو "هداية الطالبين إلى مكاتيب الكاملين" میں مذکور ہیں۔"[1]

'یادگارِ گوہری' جو محدث ڈیانوی کے ماموں زاد بھائی مولوی محمد زبیر ڈیانوی کی تصنیف ہے۔ جس میں محدث موصوف کے خاندان کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس میں بھی ان قصائد کے لیے "هداية الطالبين" کی طرف مراجعت کا لکھا ہے۔[2]

مگر افسوس اس کتاب کا دیکھنا ہماری قسمت میں کہاں! مولانا محمد عزیر شمس صاحب بھی لکھتے ہیں کہ مجھے بھی تا حال یہ کتاب نہیں ملی۔ البتہ محدث ڈیانوی کے متعلق بعض مدحیہ قصائد "إعلام أهل العصر"، "التعليق المغني"، "عون المعبود"، "المكتوب اللطيف" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد عزیر شمس صاحب نے ان کے علاوہ بعض دیگر قصائد کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک اہلِ علم کی آرا کا تعلق ہے تو اس کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے دونوں شیخ حضرت میاں

---

[1] "ترجمان" (دہلی)

[2] "حیاۃ المحدث" (ص: ۴۹)

صاحب محدث دہلوی اور قاضی حسین بن محسن انصاری بھی آپ کی انتہائی عزت وتکریم کرتے۔ قاضی صاحب نے انھیں "شیخ الإسلام والمسلمین، إمام المحققین والائمة المدققین، صاحب التألیف المجیدة والتصانیف المفیدة المشتهر بالفضائل في الآفاق" ایسے بلند پایہ القاب سے یاد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: عون المعبود (۵۵۴/۴)

ان کے علاوہ مولانا حافظ عبدالمنان محدث رحمہ اللہ وزیر آباد، مولانا سید عبدالحی الحسنی الندوی رحمہ اللہ اور دیگر اکابر علما کا بیان: "عون المعبود، التعلیق المغني، حیاۃ بعد المماۃ، نزہۃ الخواطر (۱۷۹/۸)، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند (ص: ۱۴۱)، مقدمہ "تراجم علمائے حدیث ہند" وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ طوالت کے پیشِ نظر ہم ان علم کی یہ عبارتیں نظر انداز کرتے ہیں۔ علامہ عبدالحی الکتانی نے بھی فرمایا ہے: "هو محدث الهند في زماننا هذا" کہ وہ ہمارے زمانے میں ہند کے محدث ہیں۔ (فہرس الفہارس: ۵۹۳/۲)

اخلاق و عادات:

دیگر اوصاف حمیدہ اور انعامات جمیلہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اخلاقِ کریمہ سے بھی نوازا تھا۔

سید عبدالحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"كان حليماً متواضعاً كريماً عفيفاً صاحب صلاح وطريقة ظاهرة محبا لأهل العلم"[1]

مولانا بناری لکھتے ہیں:

---

[1] نزهة الخواطر (۱۸۰/۸)

"آپ صفاتِ صدق، حیا، سخا، ثقاہت، دیانت، امانت، عدالت کے جامع اور ملازم جمعہ و جماعت اور شب زندہ دار تھے۔" (اہلِ حدیث)

سفرِ حج:

اللہ ذوالجلال نے آپ کو دو مرتبہ اپنے گھر کی زیارت کی توفیق بخشی۔ چنانچہ پہلے ۱۰ رجب ۱۳۱۱ھ میں حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حرمین شریفین زادھما اللہ شرفاً و عزاً کی زیارت اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد ۱۰ محرم کو واپس تشریف لائے۔ پھر دو سال بعد جملہ اہل و عیال حج کے لیے تشریف لے گئے اور بخیر و خوبی واپس تشریف لائے۔ ("اہلِ حدیث" امرتسر)[1]

عقیدہ:

آپ سلفی عقیدہ کے پابند تھے۔ مذہبی جمود اور اس قسم کی دیگر آلودگیوں سے آپ کا دامن بالکل صاف تھا۔ صوبہ بہار میں ایک دفعہ حکیم وحید الحق رحمہ اللہ مہتمم مدرسہ اسلامیہ نے آپ کو سالانہ امتحان کے لیے مدعو کیا۔ مولانا مرحوم نے بطیبِ خاطر دعوت قبول فرمائی۔ یاد رہے کہ یہ مدرسہ اپنے وقت میں صوبہ بہار کے دیوبندی علما کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ مولانا امتحان لینے کے لیے تشریف لے گئے۔ سنن ابو داود کی جماعت حاضر ہوئی تو جانبین سے اعتراض و جواب کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تو مولانا طلبا کی ذہانت اور حاضر جوابی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔[2] جس سے حضرت

---

① مولانا محمد عزیز شمس حفظہ اللہ نے "حیاۃ المحدث" (ص: ۱۲) میں صرف ایک بار حج پر جانے کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ وہاں چھے ماہ قیام فرمایا۔ اس دوران وہاں کے شیوخ سے استفادہ بھی کیا۔ چند شیوخ کے نام کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے۔ (ہفت روزہ "اہلِ حدیث" امرتسر)

② [illegible]

ڈیانوی رحمہ اللہ کی وسعت ظرفی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طریقۂ سلف کے مطابق قرآن وسنت ہی مشعل راہ تھی اور ان کے خلاف کسی امام و مجتہد کے قول کو خاطر میں نہ لاتے اور مجتہدین کرام میں سے جس قول کا قرآن وسنت کے موافق پاتے۔ بلا حجاب اس کو قبول کرتے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ وضو میں مسحِ رأس کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کو صحیح قرار دیا ہے اور جوربین کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو، اسی طرح کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے اور مسحِ عمامہ کے متعلق امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

اولاد واحفاد:

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ابھی ۲۱/۲۲ برس کے تھے کہ ۱۲۹۴ھ میں آپ کی شادی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے تین لڑکے اور چار لڑکیاں عطا فرمائیں۔ نرینہ اولاد میں سے سب سے بڑے صاحبزادے کا نام محمد شعیب تھا۔ مگر پانچ ماہ کی عمر میں ۱۷ رجب ۱۲۹۷ھ کو ان کا انتقال ہوگیا، جس کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ فرمایا کرتے تھے کہ سنت کے مطابق میں نے محمد شعیب کی وفات پر بہ کثرت ''اللهم اجرني في مصيبتي واخلف لي خيراً منها'' پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم البدل عطا فرمایا۔ چنانچہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو صاحبزادے عطا فرمائے۔ ایک مولانا حکیم محمد ادریس صاحب جو ۱۶ رجب ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے[1] اور دوسرے مولوی محمد ایوب صاحب، حضرت ڈیانوی کی طرح دونوں صاحبزادے بھی علم وفضل کے حامل اور آپ کے صحیح جانشین تھے۔ چنانچہ اول الذکر تو حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ کے ساتھ عون المعبود

[1] مولانا محمد شفیع احمد صاحب بہاری نے ''برہان'' (جولائی ۱۹۵۱ء) میں آپ کو حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ کا بڑا صاحبزادہ قرار دیا ہے جو من وجہ صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

کی تصنیف و تالیف میں بھی شریک رہے۔[1] اور مولوی محمد ایوب صاحب بھی علومِ دینیہ کے فاضل تھے۔ تحصیلِ علوم سے جب فارغ ہوئے تو حضرت میاں صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے گود میں لے کر دعا دی اور سندِ فضیلت مرحمت فرمائی۔ (اہلِ حدیث" امرتسر)

وفات

متحدہ ہندوستان میں ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۱ء میں جب طاعون کی بیماری پھیلی تو اس کی لپیٹ میں پٹنہ بھی آیا۔ محدث ڈیانوی پہلے سے بیمار چلے آ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ہوا بدلنے کی خاطر کسی موزوں مقام پر چند دن گزارنے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے "راج گیر" کو منتخب فرمایا اور وہاں تشریف لے گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ وہاں سے احباب دہلی کو ملتے ہوئے واپس گھر آئیں گے۔ مگر چند دن بعد "راج گیر" ہی میں انھیں اطلاع ملی کہ ان کے قصبہ ڈیانواں میں طاعون پھیل گیا ہے۔ مولانا حیران و پریشان واپس تشریف لائے تو سارے قصبہ پر ویرانی کا سماں طاری تھا۔

۱۴ مارچ ۱۹۱۱ء کو ان تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے خود حضرت موصوف نے اپنے ہاتھ سے ایک خط شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ کو لکھا۔ مگر کرنا قدرت کا کہ اگلے دن یعنی ۱۵ مارچ ہی کو خود آپ اس بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ جس کی اطلاع آپ کے صاحبزادے حکیم مولوی محمد ادریس صاحب نے آپ کے احبا و اقربا کو دی۔ مولانا امرتسری مرحوم نے اس خبر کو اپنے جریدہ "اہلِ حدیث" میں شائع کیا اور "عامۃ المسلمین" سے ان کی صحت و عافیت کی دعا کا اعلان کیا۔[1] لیکن ع

جس کا کھٹکا تھا وہ گھڑی بھی آ گئی

---

[1] حالات کے لیے دیکھیے: ہفت روزہ "اہلِ حدیث" (امرتسر) ج ۱۷، ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء

[1] محدث ڈیانوی اور ان کے صاحبزادہ رحمہ اللہ کے مکتوب "اہلِ حدیث" (امرتسر) ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ بمطابق ۲۱ مارچ ۱۹۱۱ء بروز سہ شنبہ بوقت چھ بجے صبح ڈیانواں کا یہ آفتاب عین اسی وقت جب کہ آسمانی آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون

آپ کے شاگردِ رشید مولانا ابو القاسم بنارسی مرحوم نے ماہ و تاریخ وفات "راح شمس الحق حقاني في الربيع الأول" "انخسف شمس الحق" وغیرہ سے نکالی۔ اہلِ علم نے عربی، فارسی اور اردو نظم و نثر میں ان کے متعلق مدحیہ قصائد اور مضامین لکھے۔ مولانا عبدالرشید فوقانی لکھتے ہیں کہ وہ تمام قصائد "هداية الطالبين إلى مكاتيب الكاملين" میں مذکور ہے ("ترجمان" دہلی) جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

کتب خانہ:

اللہ جل شانہ نے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کو علم کی دولت کے علاوہ دولت وثروت سے بھی نوازا تھا، بلکہ آپ کا خاندان ڈیانواں کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ آپ کے نانا جان کی سالانہ آمدنی زمانۂ ارزانی میں بھی پچاس ہزار روپے سالانہ تھی۔ ("ترجمان" دہلی) مولانا مرحوم کتابوں کی فراہمی اور ان کے حصول کے لیے خطیر رقم صرف کیا کرتے تھے، بلکہ ان کے مال کا مصرف یہی کتابوں کو جمع کرنا تھا۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بیش بہا، نادر و کم یاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اسی بنا پر آپ کا مکتبہ ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک شمار ہوتا ہے۔

مولانا بنارسی نے لکھا ہے:

"صوبہ بہار میں گو خدا بخش لائبریری بہت مشہور ہے، مگر کتبِ حدیث و تفسیر اور اسماء الرجال کے اعتبار سے مولانا ڈیانوی کا کتب خانہ فوقیت رکھتا

ہے۔ (''اہلِ حدیث'' امرتسر)

ان کتابوں کے حصول کا کیا ذریعہ تھا۔ مولانا شفیع احمد بہاری لکھتے ہیں:

''دو تین ذرائع ایسے تھے، جن سے مولانا کے یہاں کتابیں پہنچتیں رہتی تھیں۔ آپ کا ابرِ کرم چونکہ ہر شخص کو سیراب کیا کرتا تھا۔ اس لیے عرب سائل، نیز طلبا جو تعلیم و استفادہ کی غرض سے اقصائے یمن و نجد و مدینہ منورہ ـ زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً ـ کے ہوتے، بکثرت زیارت کرتے اور اپنے اپنے دامن کو مالا مال کر جاتے۔ انھی واردین میں کوئی صاحب اپنے ساتھ قلمی کتاب بھی لے کر آتے اور منھ مانگی قیمت پاتے۔ مولانا ان کتابوں کو دیکھ کر کلی کی طرح کھل جاتے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایک عرب مسند ابو عوانہ لائے، مولانا مطالعہ میں مصروف تھے، فرطِ انبساط سے بے خود ہو کر اچھل پڑے اور پوچھا کیا قیمت ہے؟ عرب نے جو قیمت بتائی اس سے زائد دے دی۔ دوسرے مولانا زین العابدین آروی تھے، جن کا قیام حیدر آباد میں تھا۔ یہ بھی کتابیں فراہم کیا کرتے تھے۔ تیسرے مجیب اللہ بن حبیب اللہ عظیم آبادی تھے۔ (''برہان'' جولائی ۱۹۵۱ء)

ان کے علاوہ مولانا فتح محمد بھی مولانا کے لیے کتابیں فراہم کیا کرتے تھے۔''[1]

مولانا شفیع احمد صاحب نے حضرت کے کتب خانے کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ اربابِ ذوق کے لیے ان میں سے بعض نادر اور اہم کتابوں کا ذکر یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

[1] حیاۃ المحدث'' (ص: ۵٦)، ''برہان'' جولائی ۱۹۵۱ء

۔ مسند أبو عوانه: نسخہ مکمل نہیں، بلکہ ناقص تھا۔ آخری باب "باب الجہر بالقراءة في صلاة الكسوف" تھا۔ ۶۰۰ھ کا مکتوبہ ہے اور اب یہ نسخہ قلابازیاں کھاتا ہوا مشرقی کتب خانہ غازی پور میں تحت رقم ۲۷۰۱ کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔ ("برہان" دہلی)

مولانا بنارسی نے لکھا ہے کہ اس پر علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے دستخط ہیں۔ ("اہلِ حدیث" امرتسر) جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسی نسخے سے منقولہ نسخہ حضرت سید محب اللہ شاہ صاحب راشدی کے کتب خانے میں موجود ہے، جسے ان کے والدِ گرامی مولانا احسان اللہ مرحوم نے جناب فتح محمد صاحب سے نقل کروایا تھا۔ پہلے اس کتاب کی حیدر آباد ہند سے صرف چار جلدیں شائع ہوئیں۔ حال ہی میں "الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة" سے اس کی بیس جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

۲۔ معالم السنن: مکمل، اب یہ کتاب مطبوع ہے، لیکن ایک وقت تھا کہ مصر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا کو اس کی ضرورت پڑی تو انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کے ذریعے سے تلاش کرائی، مگر ان کو بھی کوئی نسخہ بہم نہیں پہنچ سکا۔ البتہ اس کی پہلی جلد جونپور کے مشہور عالم مولانا ابو بکر محمد شیث صاحب کے کتب خانہ میں دستیاب ہوئی تھی، لیکن ڈیانواں میں مکمل نسخہ موجود تھا۔ جس پر مولانا نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا:

"قد من الله تعالىٰ علي باشتراء هذا الكتاب"[1]

۳۔ "التقاسيم والأنواع" المعروف صحیح ابن حبان کے چند اجزا۔ ا...

---

[1] "برہان" (دہلی)

یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔

٤۔ "الثقات لابن حبان": ناقص، ہمارے پاکستان میں پیر آف جھنڈا کی لائبریری میں چار مبسوط جلدوں میں یہ گوہرِ نایاب موجود ہے۔ اس کی صرف تیسری جلد حیدر آباد سے طبع ہوئی تھی۔ اور اب یہ مکمل شائع ہوگئی ہے۔

٥۔ "کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للھیثمي": ناقص۔ کل اوراق ۲۵۸۔ اس نسخے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مگر افسوس کہ ناقص ہے۔ ("برہان" دہلی) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی مسند بزار کے زوائد کو جمع کیا ہے۔ پیر آف جھنڈا کی لائبریری میں مؤخر الذکر بھی موجود ہے، مگر افسوس کہ یہ بھی ناقص ہے۔

٦۔ "کشف الحثیث عمن رمي بوضع الحدیث": مؤلفہ مولانا برہان الدین سبط ابن العجمی (م ۸۴۱ھ) یہ نسخہ مؤلف کے نسخہ مکتوبہ ۸۴۰ھ سے منقول تھا۔

٧۔ "کتاب الشفا للقاضي عیاض" غایت درجہ خوشخط اور پوری کتاب مطلا تھی۔ مگر اول و آخر کے کچھ اوراق غائب تھے۔

٨۔ "ذخائر المواریث في الدلالة علی مواضع الأحادیث" مؤلفہ علامہ عبدالغنی النابلسی۔ یہ کتاب اب طبع ہو چکی ہے۔

٩۔ "معرفة السنن والآثار للبیھقي" علامہ تاج الدین سبکی کا قول ہے کہ ہر شافعی فقیہ کے پاس اس کا ہونا ضروری ہے۔ مولانا کے پاس اس کی صرف پہلی جلد تھی۔ مکتبہ علم و حکمت نے جو ایک جز شائع کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر بھی ڈیانواں کا نسخہ تھا۔ اب یہ مکمل زیورِ طبع سے آراستہ ہو کے شائع ہوگئی ہے۔

١٠۔ "تحفة الأشراف بمعرفه الأطراف" علامہ مزی کی تصنیف ہے، مولانا

کے پاس اس کا ناقص نسخہ تھا، اب یہ کتاب طبع ہوگئی ہے۔

- "التذكرة في علم الحديث" علامہ ابن الملقن کا یہ مختصر رسالہ اصول حدیث سے متعلق ہے، جس کی تالیف میں کل دو گھنٹے صرف ہوئے۔
- "النهاية لابن الأثير" غریب الحدیث میں مشہور کتاب، جس کا سنہ کتابت ۹۳۴ھ ہے۔
- "مرقاة شرح مشكاة" جس کا سنہ کتابت ۱۱۱۵ھ ہے۔
- "صحيح مسلم" اس پر علامہ شوکانی کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ایک تحریر ہے، جس میں انھوں نے اپنے کسی شاگرد کو ۱۲۴۰ھ میں اجازت دی تھی۔
- "سنن أبي داود" اس کی کتاب "كتاب الأيمان والنذور" بہترین اور مطلا خط پر مشتمل تھی۔
- "الحرز الثمين شرح حصن حصين" سنہ کتابت ۱۰۱۴ھ
- "تيسير الأصول إلى جامع الأصول في حديث الرسول ﷺ"
- "سنن النسائي"
- "فتح الباري" اور مقدمہ فتح الباری۔
- "صحيح البخاري" خط نفیس اور مطلا۔
- "أبو داود" مطلا اور خوشخط۔
- "الدراية في تخريج أحاديث الهداية"
- جامع ترمذی جس کا سنہ کتابت ۱۲۵۹ھ ہے۔
- "موطأ إمام مالك" اس کے دو نسخے تھے۔ ایک ۱۲۹۱ھ کا اور دوسرا ۱۲۳۴ھ کا مکتوبہ تھا۔

۲۵۔ "تہذیب السنن لابن قیم" سنہ کتابت ۱۲۲۴ھ۔

۲۶۔ "عمدۃ القاري" اس کی صرف چار جلدیں ان کے پاس تھیں۔

۲۷۔ "المعجم الصغیر للطبراني"

۲۸۔ "فتح القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوي"

۲۹۔ "لمعات التنقیح"

۳۰۔ "ذکر أسماء من تکلم فیہ"

۳۱۔ "جامع الأصول لابن الأثیر"

۳۲۔ "کتاب القراءۃ للبیھقي"

۳۳۔ "شرح شمائل للشیخ محمد الحنفي"

۳۴۔ "شرح عمدۃ الأحکام لابن دقیق العید"

۳۵۔ "محلی شرح موطأ" مولانا سلام اللہ حنفی۔

۳۶۔ "التمھید لابن عبدالبر" کے چند اجزا۔

۳۷۔ "مصنف ابن أبي شیبۃ" ناقص۔

۳۸۔ "تذکرۃ الحفاظ"

۳۹۔ "الجامع الصغیر للسیوطي"

۴۰۔ "اشعۃ اللمعات"

۴۱۔ "استدراك أم المومنین عائشۃ صدیقۃ علی الصحابۃ"

۴۲۔ "منھاج السنۃ"

۴۳۔ "کتاب الاختلاف للشافعي"

۴۴۔ "تنبیہ المغترین للشعراني"

۲۵۔ ''خزانة الروايات''

۲۶۔ ''من لا يحضره الفقيه''

۲۷۔ ''تهذيب الأحكام''

۲۸۔ ''لوامع النجوم المتضمن من شمس العلوم''

۲۹۔ ''الاتقان''

۳۰۔ ''تفسير مجمع البيان''

مولانا بہاری کی ذکر کردہ فہرست میں سے اہم کتابوں کا ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا بنارسی نے مختصر تاریخ بغداد، مسند حمیدی، مسند بزار ناقص، مسند عبد بن حمید کا بھی ذکر کیا۔ (''اہلِ حدیث'' امرتسر)

مولانا محمد عزیر صاحب نے النكت الظراف، تاريخ الإسلام للذهبي، الإمام، تقييد المهمل و تمييز المشكل، شرح شمائل از محمد مدشق بن عمر الحنفي، الكلام علىٰ سنة الجمعة قبلها وبعدها لابن الملقن، شروط الأئمة الخمسة للحازمي، النفس اليماني والروح الريحاني في إجازة القضاة بني الشوكاني للشيخ عبد الرحمٰن بن سليمان اليماني، التنقيح للزركشي، إسعاف المبطأ، نور العين في إثبات رفع اليدين للشيخ أبي إسحاق اللهراوي (۱۲۳۴ھ) کا بھی ذکر کیا ہے۔[1]

ان کے علاوہ دیگر مولانا مرحوم کی تصانیف بالخصوص ''غاية المقصود، عون المعبود، إعلام أهل العصر، عقود الجمان، رفع الالتباس'' وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے پاس حدیث، تفسیر، فقہ،

[1] ''حياة المحدث'' (ص: ۵۸، ۵۹)

الرجال و تاریخ اور لغت وغیرہ علوم میں بے بہا قیمتی خزانہ تھا۔ ہم نے ان کی ان تصانیف سے ایک مجمل سی فہرست تیار بھی کی۔ دل تو چاہتا ہے کہ ان کا نام بھی یہاں آ جائے، مگر قارئین کے ملالِ خاطر کے اندیشے سے ہم اسے نظر انداز کر رہے ہیں
۱۴ اپریل ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلما نے نادر کتب کی نمائش کا پروگرام بنایا تو ڈیانوا سے "مسند عبد بن حميد، مسند أبو عوانه، مصنف ابن أبي شيبة، معرفة السنن، تهذيب السنن، معالم السنن، زوائد البزار للهيثمي ملیں۔ جیسا کہ علامہ شبلی نے "مقالات" (۷/ ۱۱۱) میں ذکر کیا ہے بلکہ ندوۃ العلما میں جو نسخہ مسند عبد بن حمید کا ہے وہ حضرت ڈیانوی کے نسخے سے منقولہ ہے۔
مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد ادریس نے اکثر کتب خدا بخش لائبریری پٹنہ کو ہبہ کر دی تھیں، جو آج بھی اس لائبریری کی زینت ہیں اور بعض کتب بنگال لے گئے تھے، مگر ان کے وہاں انتقال کے بعد وہ ضائع ہو گئیں۔[3]

تصنیف و تالیف

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ۱۳۰۲ھ میں جن دنوں آپ حضرت میاں صاحب دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں تھے۔ آپ ہی کی زیرِ نگرانی فتاویٰ نویسی کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر جب وطن واپس لوٹے تو اپنے کتب خانے میں بیٹھ کر تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں پوری زندگی گزار دی۔ تصنیف و تالیف کے لیے حضرت نے ایک مخصوص ہال بنوایا تھا۔ جس میں کتب خانہ تھا۔ جس کا نظارہ مولانا شفیع احمد بہاری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(2) "حياة المحدث" (ص: ٥٩)

(3) "حياة المحدث" (ص: ٦٠)

موصوف لکھتے ہیں:

''مولانا کا تصنیفی ہال میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ جس کے چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی الماریاں اور اس میں سلیقہ سے ہر فن کی کتابیں سجی ہوئی رہتیں، وسط میں مولانا کی تپائی اور اس پر ضرورت کی کتابیں پڑی رہتیں۔ گویا ایک چھوٹا سا اکیڈیمی تھا۔ جس کا مقصد سنت سنیہ کا احیاء اور بدعتِ سیہ کا قلع قمع کرنا تھا۔ اس کمرے کے شمالی جانب برآمدہ اور چھوٹا سا خانہ باغ، جس کے بائیں ایک بہت بڑا تالاب تھا جو موسم برشگال (برسات) میں خاص لطف و بہار دیتا لیکن افسوس ع

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند [1]

اس ہال میں بیٹھ کر ۲۶ / ۲۷ سال کے عرصے میں دو درجن کے قریب کتابیں تصنیف کیں جو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر مشتمل ہیں، ان میں اکثر، بیشتر حدیث، رجالِ حدیث، فقہ و فتاویٰ پر مشتمل ہیں۔ جن سے ان کی وسعتِ معلومات، کثرتِ مطالعہ اور تبحرِ علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی تصانیف کا تذکرہ اور ان کے بعض اہم نکات اور علمی مباحث کی نشاندہی کریں گے۔

① غاية المقصود في حل سنن أبي داود:

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی یہ سب سے بڑی تصنیف ہے۔ جسے ۳۲ اجزا میں مکمل ہونا تھا، مگر افسوس کہ حضرت موصوف اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۳۲ اجزا میں مکمل ہوئی۔ [2] مگر یہ صحیح نہیں۔ ''عون المعبود'' کی

---

1. ''برہان'' (دہلی) جولائی ۱۹۵۱ء
2. ''برہان'' (دہلی) جولائی ۱۹۵۱ء، ''تذکرۃ المحدثین'' (۱/ ۳۰۱) ''ترجمان'' (دہلی) ۱۰ نومبر ۱۹۷۱ء ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) ۲۷ ستمبر ۱۹۶۸ء

جلد۴ کے آخر میں خود محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"هذا آخر الجزء الرابع من عون المعبود شرح سنن أبي داود تقبل الله مني وجعله ذخيرة ليوم المعاد ووفقني لتمام الشرح الكبير المسمى بغاية المقصود شرح سنن أبي داود"[1]

یہ بات طے شدہ ہے کہ عون المعبود کی جلد رابع ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئی تھی۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ ۱۳۲۳ھ تک غایۃ المقصود مکمل نہیں ہوئی تھی اور عون المعبود کی جس تاریخ میں علامہ حسین بن محسن انصاری رحمہ اللہ وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ "غاية المقصود" ۳۲ جلدوں میں ہے۔[2] تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ شرح ۳۲ جلدوں میں مکمل ہوگئی ہے۔ سنن ابو داود کو چونکہ خطیب بغدادی نے ۳۲ اجزا میں تقسیم کیا ہے اور اسی تقسیم کے مطابق محدث ڈیانوی اس کی شرح علاحدہ علاحدہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کا جزوِ اول طبع بھی ہوا۔ اس بنا پر ان بزرگوں نے تمام کتاب کا تخمینہ ۳۲ اجزا بتایا۔ نہ کہ یہ ۳۲ اجزا میں مکمل ہوئی ہے۔ عون المعبود کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل نہیں ہوسکی، جب کہ ہر اہم بحث کے آخر میں کہا گیا ہے کہ تفصیل "غاية المقصود" میں ملاحظہ فرمائیں۔ مگر تیسری جلد (ص: ۲۰۶) کے "باب في الدعاء للميت إذا وضع في قبره" کے بعد یہ اشارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مولانا محمد عزیر شمس صاحب "حیاۃ المحدث" (ص: ۱۸۰، ۱۸۱) میں بھی اسی نتیجے تک پہنچے ہیں، البتہ اس سلسلے میں انھوں نے مزید مفید معلومات کو جمع کرنے کی

---

[1] عون المعبود (٤/٥٤٩)

[2] عون المعبود (٤/٥٥٤، ٥٥٥)

کوشش کی ہے۔ مگر انھوں نے اس خیال کی پرزور تردید کی ہے کہ "غاية المقصود" کا نسخہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے خرید لیا تھا اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے "بذل المجهود" کی تکمیل کی۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ "غاية المقصود" کی تکمیل نہیں ہوئی، اگر مکمل ہو کر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی تو سنن ابو داود کے لیے "لا مقصود إلا هو" کا مصداق ہوتی اس کی افادیت کا اندازہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے، کہتے ہیں:

"حتى رأيت جزأ واحداً من الشرح الذي ألفه الشيخ أبو الطيب شمس الحق المسمى بغاية المقصود، فوجدته لكشف كنوزاته كافلًا و بجميع مخزوناته حافلًا فلله دره قد بذل فيه وسعه وسعى سعيه"[1]

"میں نے ایک جز "غاية المقصود" کا دیکھا جو شیخ ابو الطیب شمس الحق رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ میں نے اسے ابو داود کے پوشیدہ خزانوں کو کھولنے والی اور تمام جواہرات سے بھری ہوئی پایا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل فرمائے۔ انھوں نے شرح کا حق ادا کیا ہے۔"

مولانا عبدالرشید بن مولانا ظہیر احسن نیموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وهذا شرح نفيس ليس له نظير بين شروحه وقد رزق بالقبولية بين العلماء الأعلام تقبل الله منه"[2]

"یہ شرح بہت عمدہ ہے اور ابو داود کی تمام شروح میں سے اس کی نظیر نہیں۔ علما و اعلام نے اسے شرفِ قبولیت بخشا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس

---

[1] "مقدمة بذل (1/1)
[2] "ترجمان" (دہلی)

ی کو قبول فرمائے۔"

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ابو داود کی تمام شروح سے یہ فائق ہے، جس میں حسبِ ذیل خصوصیات ایسی ہیں، جو کم سے کم دوسری شرح میں نظر آتی ہیں۔

① اسانید کی وضاحت، یعنی روایتِ حدیث کے تراجم مع بیانِ کنیت نسب، اور لقب وغیرہ نیز مشکل اسما کے ضبط اور ان کے ثقہ یا ضعیف ہونے کی صراحت۔

② سند یا متن میں اضطراب ہو تو اس کی وضاحت۔

③ مشکل الفاظ کے معنی۔

④ ان کی نشاندہی۔

⑤ حدیث کی تشریح خوب شرح و بسط سے اور مسائلِ فقہیہ جو اس سے مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کے بیان کرنے میں۔

⑥ فقہائے کرام کے مابین مختلف فیہ فقہی اختلاف پر سیر حاصل بحث اور قولِ راجح کی نشاندہی مع بیان دلائل۔

⑦ حدیث کی تخریج مع بیانِ صحت وضعف۔

⑧ حدیث ترجمۃ الباب کے مؤیدات وشواہد مع بیانِ صحت وضعف۔

⑨ اختلاف الرواۃ والنسخ۔

⑩ اصولی وفنی مباحث کی توضیح وتشریح۔

⑪ فقہی اختلاف کو بیان کرتے ہوئے، ائمۂ دین میں سے جس کسی کے قول کو دلائل و براہین کے قریب پایا اسے قبول کیا اور مخالفین پر طعن اور ان کے استخفاف سے احتراز کامل فرمایا۔ مقلدین حضرات کی طرح نہیں کہ ہر صورت اپنے فقہی مسلک کو ہی صحیح ثابت کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے دور دراز تاویلات ہی کا

سہارا لینا پڑے۔

⑫ جن روایات کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے معلق بیان کیا ہے دوسری کتب حدیث سے ان کا اتصال مع بیانِ صحت وضعف۔

⑬ جو روایات مختصر ہیں اور احادیث کی دوسری کتابوں میں وہ مفصل ہیں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

⑭ حدیث کی تصحیح وتضعیف اور ترجمۃ الباب سے مناسبت وعدمِ مناسبت اور اسی نوعیت کے دیگر مباحث میں امام ابو داود کے موقف سے اختلاف اور اس پر دلائل۔

یہ ہیں وہ امور جن کا اس شرح میں اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر ہم ان مباحث میں سے ہر ایک کی ایک مثال پیش کرتے تو بات لمبی ہو جاتی، اس لیے ہم قصداً اس سلسلے کو نظر انداز کرتے ہیں۔

الغرض یہ شرح اسی قسم کے گوناگوں فوائد وتنقیحات پر مشتمل ہے۔ رجال اور اسانید کے بارے میں تحقیقی انداز اختیار کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرنِ اولیٰ کا محدث اسناد و اطراف پر بحث کر رہا ہے۔ اگر سنن ابو داود کے شارحین سے کوئی تسامح ہوا ہے تو اس کی وضاحت بھی فرماتے ہیں، مثلاً پہلی حدیث کے تحت مولانا سراج احمد السرہندی نے ترمذی کے ترجمہ میں جو ''ابو سلمۃ'' راوی کو منصور بن سلمۃ الخدادی کہہ دیا ہے۔ مولانا مرحوم نے اس پر تعاقب کیا اور فرمایا یہ منصور بن سلمۃ نہیں، بلکہ ابو سلمۃ بن عبدالرحمان الزہری المدنی ہے۔ منصور تو دسویں طبقہ کا راوی ہے وہ صحابی سے روایت کیسے کر سکتا ہے؟! بلکہ کبھی سنن ابو داود پر استدراک اور تتبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً امام ابو داود ''باب الخاتم يكون في ذكر الله تعالىٰ يدخل به الخلاء'' میں ایک حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''لم يروه

إلا همام" جس پر ہمارے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"امام ابو داود کا یہ قول کہ ہمام اس میں منفرد ہے، محلِ نظر ہے، کیوں کہ ان کی متابعت یحییٰ بن المتوکل (الباہلی) اور یحییٰ بن الضریس البجلی نے کی ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے العلل اور امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک اور امام بیہقی نے السنن الکبری میں ذکر کیا ہے۔" [1]

اسی طرح "المسح علی الخفین" میں بریدۃ بن الحصیب کی روایت کے بعد امام ابو داود فرماتے ہیں:

"هذا مما تفرد به أهل البصرة"

"اس روایت کے بیان کرنے میں اہلِ بصرہ منفرد ہیں۔"

لیکن محدث ڈیانوی قدس سرہ پہلے اصولِ حدیث کی کتابوں سے تفرد کی تعریف اور پھر تفرد کی اقسام بیان کرتے ہیں، پھر لکھتے ہیں:

"امام ابو داود کا کہنا کہ اہلِ بصرہ اسے بیان کرنے میں منفرد ہیں اس میں ان سے تسامح ہوا ہے، کیوں کہ اس میں بصری صرف ایک راوی مسدد رحمہ اللہ بن مسرھد ہے اور وہ بھی منفرد نہیں، بلکہ احمد بن ابی شعیب نے اس کی متابعت کی ہے، جیسا کہ خود امام ابو داود رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہناد کی روایت ترمذی میں علی بن محمد اور ابن ابی شیبۃ کی ابن ماجہ میں ہے اس کے بجائے دلھم بن صالح کوفی اس روایت میں منفرد ہے۔"

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے:

"هذا مما تفرد به أهل الكوفة"

---

[1] "غاية المقصود" (ص: ٤١) اس پر مزید بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔

یہ امور اس بات کے غماز ہیں کہ فنِ رجال سے مولانا ڈیانوی کو گہرا لگاؤ تھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے جامع ترمذی طبع ہند کے دوسرے صفحے پر "حدثنا" محمد بن حمید بن اسماعیل کے بجائے محمد بن اسماعیل سے اس کی تصحیح کروائی۔ (اہلِ حدیث)

مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ نے "تحفة الأحوذي" (١٦/١) میں "قال بعضهم" کہہ کر جو اس تصحیف کی تصویب فرمائی ہے تو اس سے مراد غالباً مولانا ڈیانوی ہی ہیں۔ اس فن میں ان کی وسعتِ معلومات ہی کا نتیجہ تھا وہ بسا اوقات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے ناقدِ رجال اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ جیسے جامع العلوم پر بھی تنقید کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً امام ابو داود اپنی سنن میں "باب السواك من الفطرة" کے تحت فرماتے ہیں۔

"وفي حديث محمد بن عبد الله بن أبي مريم عن أبي سلمة"

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے پہلے محمد مذکور کی توثیق اور اس کی روایت کی نشاندہی کی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں کہ تعجب ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "إسعاف المبطأ" کے نام سے رجالِ موطا پر مستقل کتاب لکھی ہے، جس میں اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب اور تقریب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"والعجب من الشيخ جلال الدين السيوطي أنه لم يذكر ترجمته في إسعاف المبطأ برجال الموطأ ثم العجب من الحافظ ابن حجر وغيره من النقاد أنه كيف لم يذكره في التهذيب ولا في التقريب مع كونه من رجال الموطأ ومن

التزامه بإخراج من كان في كتاب الموطأ"

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے جو الزام یہاں علامہ سیوطی رحمہ اللہ پر عائد کیا ہے، اس سے ہمیں اتفاق ہے، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ پر اظہارِ تعجب صحیح نہیں، ان کا یہ کہنا: "حافظ صاحب نے "تہذیب وتقریب" میں موطأ کے رجال کا بھی التزام کیا ہے۔" یہی بات دراصل صحیح نہیں۔ یہ کتابیں تو صحاح ستہ اور اصحابِ صحاح کی دیگر کتب کے رجال ہی سے مختص ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمہ "تہذیب" میں صراحت کی ہے۔ رجالِ موطأ اور دیگر ائمہ ثلاثہ کی کتب کے رجال پر انھوں نے ایک مستقل کتاب بنام "تعجیل المنفعة بزوائد رجال الأئمة الأربعة" لکھی ہے۔ جس میں ان رواۃ کا ذکر کیا ہے جو صحاح ستہ سے زائد ہیں اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے ان سے روایت کی ہے اور اس کتاب میں محمد بن عبداللہ مذکور کا ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو: تعجیل المنفعة۔ [1]

معلوم یوں ہوتا ہے کہ مذکورۃ الصدر الفاظ لکھتے ہوئے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کے سامنے "تعجیل المنفعه" نہ تھی۔ جس سے حضرت موصوف کی ذات ستودہ صفات پر حرف نہیں آتا۔ علم وفضل میں اعلیٰ مقام کے حامل بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں اور ان کی بھول ان کے علمی مقام کو قطعاً مجروح نہیں کرتی، بلکہ ایسے امور تو انسانی معلومات کی حدود اور بشری عقل وفکر کی نارسائی کا پتا دیتے ہیں۔ بالآخر کون ہے جس کا قدم اس وادی خارزار میں بالکل محفوظ رہا ہو۔ والمعصوم من عصمه الله

عموماً کسی بزرگ کے حالات وسوانح لکھتے وقت صرف اس کے محامد اور اوصاف ہی کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اور بشری کمزوریوں سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے ایک لحاظ سے یہ طریقِ کار صحیح بھی ہے، مگر دیانت داری سے سوچا جائے تو اس انداز سے

[1] "تعجیل المنفعة" (ص: ٣٦٨)

شخصیت پرستی کی بو آتی ہے۔ علم وفن کی اس قدر خدمت نہیں ہوتی، ہمارے اسلاف کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ علمی میدان میں اگر کسی بزرگ سے انسانی تقاضے کے مطابق فروگزاشتیں ہوئیں۔ تو اس کا اظہار برملا کر دیا جاتا، اسے توہین یا استخفاف پر محمول کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ ہمارے محدث ڈیانوی ہی کو لیجیے "باب الرجل یجدد الوضوء من غير حدث" کے تحت امام ابو داود رحمہ اللہ کے قول: "هذا حديث مسدد هو أتم" کے متعلق لکھتے ہیں:

"شاید امام صاحب کو محمد بن یحییٰ کی مفصل روایت جو ابن ماجہ میں مذکور ہے نہیں ملی، تبھی وہ مسدد کی روایت کو "اتم" فرماتے ہیں۔ حالانکہ ابن یحییٰ کی روایت مسدد کی روایت سے "اتم" ہے۔"[1]

اسی طرح فقہی مسائل میں بھی محدث موصوف نے ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اقوال کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور جسے اقرب الی الصواب پایا اسے قبول فرمایا اور مرجوح قول کو دلائل سے رد کیا ہے۔ مگر فکری جمود کے حامل اس حریت فکر کو قبول کرنے کے بجائے الٹا اسے ائمہ کی توہین قرار دیتے ہیں۔ عموماً حنفی مکتبِ فکر چونکہ صحیح حدیث کے موافق نہیں۔ اس لیے جابجا مولانا ڈیانوی نے اس کی کمزوریوں کو بیان کیا ہے، مگر اربابِ تقلید کو یہ بات راس نہ آئی تو کہہ دیا:

"إلا أنه في بعض المواضع منه استخفه الشيطان فاستطال اللسان على إمام الائمة أبي حنيفة النعمان عليه سجال الرحمة والغفران"[2]

دیانت داری کا تقاضا تھا کہ مولانا سہارنپوری ایسے مواقع کی نشاندہی فرماتے،

[1] "غاية" (ص: ۷۷، ۷۸)

[2] مقدمہ بذل المجہود

جہاں مولانا ڈیانوی مرحوم نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں۔ ''غایۃ المقصود'' کا ایک پارہ ہمارے سامنے ہے۔ از اول تا آخر اسے پڑھا جائے کسی مقام پر بھی آپ اس بات کو محسوس نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ ''غایۃ المقصود'' کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آپ کسی ایک مقام پر بھی ادب و احترام کا پہلو چھوٹا ہوا نہیں پائیں گے۔ ائمہ مجتہدین کے مابین اختلافات اور ان کی نوعیت کا ذکر بالخصوص امام صاحب کے شرف و فضل کا اعتراف ''رفع الالتباس'' میں دیکھیے گا۔ جو ان کی تصنیف ہے۔ ہم مولانا سہارنپوری کے اس قول کو معاندانہ مخاصمت و مخالفت پر محمول کرتے ہیں یا پھر بہتانِ عظیم سمجھتے ہیں۔ عفا اللہ عنا وعنہم.

آخر میں شائقین حضرات کو یہ مژدہ جانفزا بھی سنائے دیتے ہیں کہ ''غایۃ المقصود'' کے مزید دو پارے پٹنہ لائبریری سے مل گئے ہیں۔ سنا ہے کہ ہندوستان میں حضراتِ سلفیین ان کی طباعت کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہ دن جلد لائے کہ یہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوں اور ذریعہ تسکین اہلِ ایمان ہوں۔[1]

مقدمہ غایۃ المقصود:

دیکھنے کو یہ بظاہر غایۃ المقصود کا مقدمہ ہے، مگر بڑے سائز کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امام ابو داود کا ''رسالہ مکیہ'' بھی اس میں شامل کر دیا ہے جو پہلی بار ان کی خدمت سے منصۂ شہود پر آیا۔ جو سنن ابو داود کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے علاحدہ تصنیف قرار دیا ہے، جس میں

[1] بحمداللہ اس کی تین جلدیں حدیث اکادمی فیصل آباد پاکستان اور ''المجمع العلمی کراتشی'' کے زیرِ اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئی ہے۔

حسبِ ذیل مسائل کا تذکرہ ہے:

① کتبِ احادیث میں سنن ابی داود کا مقام۔

② امام ابو داود کے حالات۔

③ سنن ابی داود کے نسخے۔

④ شروح وحواشی سنن۔

⑤ اپنے شیوخ کا تذکرہ جن سے سنن کی سند حاصل کی۔

⑥ سنن ابو داود کی امام ابو داود تک ان کی سند

یہ ہیں وہ امور جن کا اس مقدمے میں ذکر کیا ہے اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جو فوائد اس مقدمہ میں پائے جاتے ہیں، سنن کی تمام شروح کے مقدمہ میں نہیں نظر نہیں آتے اور بعد کے حضرات نے بھی کوئی اس میں قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا۔

② عون المعبود شرح سنن أبي داود:

یہ شرح دراصل ''غاية المقصود'' کا اختصار ہے جو مبسوط چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مبارک شرح پہلی بار مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوئی۔ پہلی تین جلدیں تو حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ دہلوی کی زندگی میں ۱۳۱۹ھ میں ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی تھیں۔ البتہ آخری جلد ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد دار الکتاب العربی بیروت سے اس کا فوٹو عکس دوسری بار شائع ہوا اور ۱۳۸۸ھ بمطابق ۱۹۶۸ء کو شیخ محمد عبدالمحسن الکتبی مالک المکتبة السلفیه (مدینہ منورہ) نے تیسری[1] بار طباعت کا اہتمام کیا اور اسے حروفِ ابجد پر چودہ جلدوں میں شائع کیا۔

[1] شیخ الکتبی نے الطبعة الثانیہ لکھا ہے جو صحیح نہیں، غالباً انھوں نے طبع ثانی کا اعتبار اس بنا پر نہیں کیا کہ وہ طبع اول ہی کا فوٹو آفسٹ ہے۔ یا پھر طبع ثانی پر وہ مطلع نہیں ہوئے۔ واللہ اعلم۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ''المكتبة السلفية'' کی دیگر مطبوعات مثلاً سنن دار قطنی، معجم طبرانی صغیر وغیرہ کی طرح اس میں بھی طباعتی اغلاط بہ کثرت ہیں۔ مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے کہ طبع ثالث میں کثرتِ اغلاط کی بنا پر عرب میں بعض علم دوست حضرات نے اس کی طبع رابع کا فیصلہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی پہلی دو جلدوں کا خطی نسخہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ جن کا نمبر شمار ۳۱۱۸۔۳۱۷۹ ہے جس کی جلد اول ورق ۳۳۴ میں اور ثانی ورق ۱۱۴ میں مشتمل ہے، جو ہمارے مطبوعہ نسخہ کے اعتبار سے جلد دوم (ص: ۲۷۶) تک ہے جس پر مؤلف کے قلم سے کچھ زیادات ہیں جس سے اس نسخے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ (''حیاۃ المحدث'' ص: ۱۴۲، ۱۴۳) اور حال ہی ۱۳۹۹ھ میں اس کا چوتھا ایڈیشن بڑی آب و تاب سے ادارہ نشر السنۃ ملتان نے جو شائع کیا ہے وہ ہندی نسخے ہی کا عکس ہے اور مناسب کتابی سائز ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

سببِ تالیف:

صوبہ بہار میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ سنن ابو داود کی شرح کا خیال سب سے پہلے مولانا رفیع الدین صاحب شکرانوی[1] کو ہوا۔ اس بات کا علم جب علامہ ڈیانوی کو ہوا تو انھوں نے مسابقت کرتے ہوئے دو شرحوں کی طرح ڈالی۔ مولانا شکرانوی کو اس کی محرومی کا صدمہ تاحیات رہا، بلکہ اس سے آگے مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ تک لکھ دیا کہ واللہ اعلم یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ شرح ''عون المعبود''

[1] آپ بھی صدیقی شیخ اور محدث ڈیانوی کے معاصر تھے حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی طرح نوادرات و مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ انھوں نے جمع کر رکھا تھا۔ سنن ابی داود کے رجال پر انھوں نے ایک مستقل رسالہ بنام ''رحمة الودود على رجال سنن أبي داود'' لکھا ہے۔ حالات کے لیے دیکھیے: ''اہلِ حدیث'' (امرتسر) ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء، جلد: ۱۶، شمارہ: ۴۷۔ ''برہان'' (دہلی) فروری ۱۹۵۱ء۔ ''نزهة الخواطر'' (۱۰۳/۸)

ہو"غایۃ المقصود" کا خلاصہ ہے۔مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اس کی تالیف میں مولانا رفیع شکرانوی کی شرح ابو داود سے بہت نفع اٹھایا، لیکن افسوس کہ خود مولانا شکرانوی کی شرح ضائع کر دی گئی یا ہو گئی۔[1]

مگر افسوس تو مولانا گیلانی مرحوم پر ہے کہ اس بے پر کی ہوائی میں ان کا ذہن یہ کام نہ کر سکا کہ"عون المعبود" خلاصہ تو ہے"غایۃ المقصود" کا"اگر مولانا شکرانوی کی شرح ابو داود سے نفع مولانا ڈیانوی نے اٹھایا تو وہ"غایۃ المقصود" میں اٹھایا ہوگا نہ کہ "عون المعبود" میں۔ مزید لطف یہ کہ مولانا شفیع احمد بہاری تو اسے محض مولانا شکرانوی کا شرح ابو داود لکھنے کا خیال ظاہر کرتے ہیں، مگر مولانا گیلانی ان کی شرح سے"عون المعبود" میں باقاعدہ نفع اٹھانے کی بات کرتے ہیں اور مولانا شکرانوی کی شرح کے بارے میں یہ تاثر بھی کہ وہ ضائع کر دی گئی یا ہو گئی۔" إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون

جب کہ حقیقت اس افسانے کی کچھ بھی نہیں، چنانچہ مولانا شفیع احمد بہاری اسی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حق یہ ہے کہ اس کی کوئی اصلیت نہیں، ممکن ہے کہ مولانا شکرانوی کا خیال ہوا ہو، مگر اس کا کوئی اثر مولانا ڈیانوی نے نہیں لیا۔"[2]

مولانا ڈیانوی کے شرح لکھنے کا سبب مولانا سید محمد تلطف حسین جو مولانا ڈیانوی کے ہم عصر اور ہم مشرب تھے، یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم نے ایک جماعت کی موجودگی میں حضرت میاں نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ سے بارہا سنا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ کے پاس ابو داود کا

[1] "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" (۱/۳۵۲)

[2] "برہان" (دہلی) جولائی ۱۹۵۱ء

یک نسخہ تھا، جس کا متعدد نسخوں سے مقابلہ کرتے ہوئے پوری کتاب کو حاشیہ وتعلیقات سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جس میں کتاب کے تمام مشکل مقامات کا حل تھا اور حضرت شاہ صاحب کا علما پر یہ بہت بڑا احسان تھا۔ خوش قسمتی سے یہی نسخہ حضرت میاں صاحب کے ہاتھ لگا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے حادثہ فاجعہ میں یہ قیمتی نسخہ ضائع ہوگیا۔ میاں صاحب کو ہمیشہ اس کا رنج والم دامن گیر رہتا اور بارہا فرماتے کہ کاش کہیں وہ نسخہ مل جائے تو باوجود کم سرمایہ کے ہر قیمت پر اسے خریدلوں۔ حضرت میاں صاحب کی زبان سے ہمارے دوست ابو الطیب (محدث ڈیانوی) نے بارہا یہ تذکرہ سنا تو یہ سنن ابی داود کی شرح کا سبب بنا۔ جس میں انھوں نے اپنی تمام تر کوشش صرف کر دی۔"[1]

خوش قسمت کہ محدث ڈیانوی اپنے مقصد عزیز میں کامیاب و کامران ہوئے حضرت میاں صاحب کی زندگی ہی میں جب اس کی تین جلدیں شائع ہوئیں تو انھیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور جب سنن کا مطالعہ کرتے تو اس کے شارح و طابع کے لیے دعا کرتے اور فرماتے:

"زال عني الغموم التي حصلت لي بإضاعة النسخة العزيزة"

"نسخہ عزیزیہ کے ضیاع سے جو غم لاحق ہوا تھا وہ اس نسخے سے دور ہوگیا۔"

جس سے اس شرح اور اس کے متن کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عون المعبود کی اہمیت:

اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے عرب و عجم سے سنن ابی داود کے گیارہ نسخے جمع کیے۔ جن میں تین مطبوعہ اور آٹھ خطی

[1] "عون المعبود" (٤/٥٥٢)

تھے۔ جن کی مدد سے متن کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا۔ ان نسخوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) نسخہ مکتوبہ (۱۰۰۳ھ) بخط شیخ صدیق بن محمد حنفی زبیدی تلمیذ علامہ زکی الدین طاہر بن حسین بن عبدالرحمان رحمہ اللہ۔

(۲) نسخہ مکتوبہ (۱۱۴۷ھ) بخط شیخ محمد خلیلی، اس پر علامہ مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کے خطوط تھے۔

(۳) نسخہ مکتوبہ (۱۱۸۳ھ) بخط سید یحییٰ بن احمد بن علی بن احمد بن حسین یمنی۔

(۴) نسخہ صحیحہ عتیقیہ، یہ نسخہ حضرت مولانا سید نذیر حسین المعروف حضرت میاں صاحب محدث دہلوی کی ملکیت تھا، مگر نامکمل تھا۔

(۵) نسخہ مکتوبہ (۱۲۲۴ھ) بخط مرزا حسن علی محدث لکھنوی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ یہ نسخہ مولانا عبدالحی لکھنوی کی ملکیت تھا۔

(۶) ایک نسخہ ایسا تھا جو شیخ عبدالغنی بن اسماعیل نابلسی کے نسخے سے مقابلہ شدہ تھا۔ شیخ نابلسی کے نسخے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۰۹۹ھ میں بارہ نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کی گئی تھی۔

(۷) مطبوعہ مصر (۱۲۸۰ھ)۔

(۸) مطبوعہ دہلی (۱۲۲۷ھ) جو مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ سہارنپوری کے اصلی مکی نسخہ سے منقول تھا۔ جو حضرت مولانا حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی مرحوم سے دستیاب ہوا۔

(۹) نسخہ مطبوعہ ہند جو کہ ہند ایام فتن میں چھپا تھا اور اس پر حواشی بھی نہ تھے۔

(۱۰) قاضی حسین بن محسن انصاری یمنی کے اصل نسخے سے مقابلہ کردہ نسخہ۔

(۱۱) نسخہ عتیقیہ قدیمہ ناتمام جو ابن داسہ کی روایت سے تھا۔[1]

[1] "عون المعبود" (٤/٥٥٢، ٥٥٣)

محدث ڈیانوی ان نسخوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

'ان گیارہ نسخوں میں ایک نسخہ بروایت ابن داسہ ہے اور باقی لؤلؤی کی روایت سے ہیں۔ میں نے نسخہ عتیقیہ کو اصل قرار دیتے ہوئے اہلِ علم کی ایک جماعت کی اعانت سے جب مقابلہ کیا تو ان میں چار قسم کے اختلافات پائے گئے:

① متون و اسانید کے الفاظ میں اختلاف۔

② ابواب کے الفاظ میں اختلاف اور بعض نسخوں میں ایک باب کے تحت متعدد احادیث ہیں اور بعض میں وہی احادیث مختلف ابواب کے تحت ذکر کی گئی ہیں۔

③ کتاب اور ابواب کی تقدیم و تاخیر میں اختلاف۔

④ بعض نسخوں میں احادیث زیادہ اور بعض میں کم، اس اختلاف کو دیکھ کر میں بہت حیران ہوا اور نسخہ لؤلؤی کے امتیاز میں بڑی مشکل میں مبتلا ہوا۔ لیکن ائمۂ متقدمین کی کتب مثلاً: "تحفة الأشراف للحافظ المزي، مختصر السنن للحافظ المنذري، جامع الأصول للحافظ ابن الأثير، معالم السنن للخطابي، معرفة السنن والآثار للبيهقي، المنتقى للإمام مجد ابن تيميه، كتاب الأحكام لعبد الحق الإشبيلي، نصب الراية للزيلعي، حاشيه سنن أبي داود لابن قيم، التلخيص الحبير لابن حجر، الاستيعاب لابن عبد البر، أسد الغابة لابن الأثير، تجريد أسماء الصحابة للذهبي، الإصابة لابن حجر" اور دیگر متعدد اور معتمد کتب کو دیکھا تو بحمد اللہ یہ اشکال رفع ہوگیا اور میں اس نتیجے

پہنچا کہ نساخ حضرات نے لؤلؤی کے نسخے میں دوسرے نسخوں کو بھی خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ نسخہ لؤلؤی کو سامنے رکھ کر اس کی ایک ایک حدیث کا مختصر سنن ابی داود للمنذری سے مقابلہ کیا۔ جسے اس مختصر اور حافظ المزی کی تحفۃ الاشراف کے مطابق پایا اسے لؤلؤی کی روایت قرار دیا۔ خواہ وہ حدیث لؤلؤی کے علاوہ دوسرے نسخوں میں موجود ہے یا نہیں اور وہ حدیث جو بعض نسخوں میں موجود ہے۔ مگر وہ مختصر منذری رحمہ اللہ میں مذکور نہیں اور نہ ہی اس کا انتساب علامہ المزی رحمہ اللہ نے لؤلؤی کی طرف کیا ہے۔ بلکہ کہا ہے کہ ابن داسہ یا ابن العبد یا ابن الاعرابی کے نسخہ کی روایت ہے۔ جس سے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ لؤلؤی کی روایت نہیں ہے۔ میں نے شرح کے لیے گو نسخہ لؤلؤی کو منتخب کیا ہے۔ مگر مذکورہ نسخوں میں جو روایات اس سے زائد ہیں۔ انھیں بھی نہیں چھوڑا تا کہ فائدہ تام حاصل ہو۔ البتہ غیر لؤلؤی کی روایت کے تحت علامہ المزی رحمہ اللہ کی تحفۃ الاشراف کی مدد سے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ فلاں نسخے کی روایت ہے تا کہ نسخہ لؤلؤی اور دیگر نسخوں میں اختلاط واقع نہ ہو۔'' (عون المعبود: ۴/ ۵۴۸، ۵۴۰)

متن کی تصحیح کے متعلق محدث ڈیانوی کی اس کاوش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''باب السواك لمن قام بالليل'' کے آخر میں جو روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ روایت اکثر نسخوں میں موجود نہیں اور نہ ہی یہ مختصر منذری رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ کی شرح ''معالم السنن'' کے نسخے میں ہے۔ البتہ بعض مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ بعض میں تو اسی باب کے تحت اور بعض میں یہ ''باب الرجل يستاك بسواك'' کے تحت مذکور ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث کی موافقت ان دونوں ابواب سے ثابت نہیں
ہوتی۔ یہ دیکھ کر جامع الاصول لابن الاثیر رحمہ اللہ کی طرف مراجعت کی تو
اس میں انھوں نے اسے ابو داود کے بجائے صحیح مسلم کی طرف منسوب
کیا۔ لیکن مجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے المنتقی میں لکھا ہے: "أخرجه
الجماعة إلا البخاري والترمذي"۔ اسی طرح شیخ کمال الدین
الدمیری نے حاشیہ ابن ماجہ میں اسے ابو داود وغیرہ کی طرف منسوب کیا
ہے۔ جس سے میرا اشکال مزید تقویت اختیار کر گیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ
نے مجھے تحفۃ الاشراف کے مطالعے کی نعمت سے نوازا تو وہاں اسے مسلم،
ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ کی طرف منسوب پایا اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی
پائی گئی کہ ابو داود کی یہ روایت ابوبکر بن داسہ کی ہے، جس سے میرا اشکال
رفع ہو گیا کہ یہ روایت فی الاصل ابن داسہ کی ہے۔ لیکن نساخ نے اسے
لولوی کے نسخے میں درج کر دیا ہے۔"

اس قسم کے دیگر متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں انھوں نے متن کی تصحیح میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن اس تحقیق و تنقیح کے باوجود بعض مقامات مزید غور و فکر کے محتاج ہیں۔ اس فن میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تنقیح و تہذیب سے کون واقف نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں وہ بھی اس نوعیت کی فروگزاشتوں سے محفوظ نہیں ہے۔ بالآخر کوئی ہے بھی جس کا قدم اس چشمہ صافی کی غواصی میں ڈگمگانے سے محفوظ رہا ہو۔ مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ بھی آخر انسان تھے۔ ان سے بھی اگر اس قسم کی کوتاہی واقع ہوئی تو کوئی عجیب بات نہیں۔ مثلاً "أبو داود: باب صلاة الليل" میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت جو بواسطہ ابوسلمہ اور علقمہ بن وقاص

سے مروی ہے کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”روى الحديثين خالد بن عبد الله الواسطي عن محمد بن عمرو مثله، قال فيه قال: علقمة بن وقاص يا أمتاه كيف كان يصلي الركعتين. فذكر معناه، حدثنا وهب بن بقية عن خالد ح و نا ابن المثنىٰ ناعبد الأعلىٰ ناهشام الخ“[1]

مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ اس سند کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قال في الشرح رواية وهب بن بقية عن خالد عن هشام ما وجدناها في أطراف المزي وأما رواية ابن المثنىٰ عن عبد الاعلىٰ فثابتة فيه والله أعلم“

کہ شرح غایۃ المقصود میں ہے کہ وہب بن بقیہ کی روایت حافظ ابوالحجاج المزی رحمہ اللہ کی تحفۃ الاشراف میں ہمیں نہیں ملی، البتہ ابن المثنیٰ کی روایت موجود ہے۔

لیکن دراصل مولانا موصوف سے تسامح ہوا ہے۔ جب کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہشام کی روایت ”ابن المثنیٰ نا عبد الأعلى“ اور ”وهب بن بقية عن خالد“ دو مختلف طریق سے مروی ہے اور درمیان ”ح و نا“ تحویل الاسناد کے حرف سے ہے۔ حالانکہ یوں نہیں بلکہ امام ابوداود ”حدثنا وهب بن بقية عن خالد“ سے دراصل سابقہ روایت جو ”روى الحديثين خالد بن عبد الله الواسطي“ کے الفاظ سے معلق ذکر کی ہے۔ اسے متصل بیان فرما رہے ہیں، جس کی تائید السنن الکبریٰ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

[1] أبو داود مع العون (١/٥١٥)

''قال أبو داود: روى الحديثين خالد بن عبد الله عن محمد بن عمرو مثله، قال فيه قال علقمة بن وقاص يا أمه كيف كان يصلي الركعتين؟ فذكر معناها، حدثناه وهب بن بقية عن خالد انتهى''[1]

اور فرمایئے یہ بعینہ وہی الفاظ ہیں جو سنن ابی داود میں ہیں، مگر امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے ''حدثناه وهب بن بقية عن خالد'' ضمیر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ سند سابقہ معلق روایت کی ہے۔ مگر بعض نساخ سے یہ غلطی ہوئی کہ اولاً: ''حدثناه'' سے ''ہ'' ضمیر ساقط ہوگئی اور یہ سمجھ لیا کہ ''نا ابن المثنیٰ نا عبد الأعلی'' دوسری سند ہے، اس لیے ''ح و نا'' کا اضافہ کر دیا جو کہ صحیح نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہشام کی روایت کو حافظ المزی رحمہ اللہ نے وہب بن بقیہ عن خالد کے واسطے سے ذکر نہیں کیا۔ ''هشام عن سعد عن عائشة'' کی سند سے یہ روایت علاحدہ (۱۱/۴۰۳) اور ''وهب بن بقية عن خالد عن محمد بن عمرو عن علقمة عن عائشة'' کی سند کو علاحدہ (۱۲/۲۴۶) ذکر کیا ہے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بھی اس مقام کی خوب وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ ''نسخہ احمدیہ'' میں ''ح و نا'' متن میں نہیں، بلکہ حاشیہ میں ہے۔ بات دراصل وہی ہے جو ہم عرض کر آئے ہیں کہ نساخ نے ہشام کی روایت کی دو اسناد خیال کرتے ہوئے ''ح و نا'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ لفظ متن میں ہوں یا حاشیہ میں، بہرحال صحیح نہیں۔ والله أعلم

اسی طرح ''باب في السلام'' میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت کے

[1] السنن الکبریٰ (۳/۳۲)

الفاظ یوں ہیں:

"صليت مع النبي ﷺ فكان يسلم عن يمينه: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وعن شماله: السلام عليكم ورحمة الله"[1]

سنن کے تمام متداول نسخوں میں اسی طرح صرف "عن یمینه" کے بعد "وبرکاته" کا اضافہ ہے اور "عن شماله" کے بعد نہیں، حالانکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں ابو داود ہی کے واسطے سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس میں "وعن شماله" کے بعد بھی "برکاته" کا اضافہ موجود ہے۔ بلکہ مولانا عبدالصمد مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"ایک قدیم نسخے میں دونوں مقامات میں یہ لفظ موجود ہے اور یہی صحیح ہے۔"[2]

گویا بعض نسخوں میں صرف دائیں جانب سلام میں "وبرکاته" کے الفاظ ہیں اور بعض میں دونوں جانب سلام میں ہیں۔ مگر اس پہلو سے عون المعبود میں کوئی اشارہ نہیں۔ اس کی مزید ضروری وضاحت شائقین "أصل صفة صلاة النبي ﷺ" (۱۰۲۶/۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔ ہم انہی دو مقامات کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ تتبع و تلاش سے اس قسم کے مزید مقامات بھی مل سکتے ہیں، جو غور و فکر کے محتاج ہیں، لیکن اس کے لیے محنتِ شاقہ، وسیع مطالعہ اور کتب بینی کی ضرورت ہے، جس کا اس دور میں شدید فقدان ہے، بلکہ نوبت بایں جا رسید کہ ان جیسے مضامین پر لکھنا تو کجا، پڑھنا بھی طبیعت پر شاق گزرتا ہے۔ سطحی قسم کے مضامین اور قصص و واقعات ہمارا مبلغِ علم

---

[1] ابو داود مع العون (۱/ ۳۸۰)

[2] "اہلِ حدیث" امرتسر (٦ شوال ۱۳٦۴ھ، ۱۴ستمبر ۱۹۴۵ء)

ہیں۔ درسِ بخاری شریف پڑھ لی تو عالم و فاضل بن بیٹھے اور اگر صحیح بخاری کا ایک مرتبہ درس دے لیا تو شیخ الحدیث ہو گئے۔ اپنے اکابر کو دیکھیے اور ان کی خدمات کا جائزہ لیجیے، ان کی تعریف میں آپ علمائے مصر کو یوں رطب اللسان پائیں گے۔

”لو لا عناية إخواننا علماء الهند لعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق“ ①

اگر ہمارے ہندی علما کی علومِ حدیث میں خدمات نہ ہوتیں تو علمِ حدیث دیارِ مشرق سے ختم ہو جاتا۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ اسی گروہ کے گلِ سرسبد تھے، جنھوں نے فنِ حدیث کی خالص سلفی نقطۂ نظر سے خدمت کی۔ ”غاية المقصود“ کا تعارف آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ”عون المعبود“ گو اس سے مختصر ہے تاہم سنن کے مشکل مقامات کی توضیح، فقہی اور فنی مباحث کی تنقیح میں ایسی بے مثل ہے کہ بقول شیخ محمد منیر دمشقی۔

”كل من جاء بعده من شيوخ الهند وغيره استمدوا من شرحه“ ②

ان کے بعد ہندوستان اور دیگر ممالک کے تمام شیوخ نے اس شرح سے استفادہ کیا ہے۔ عون المعبود کی جلد چہارم کے آخر میں اہلِ علم، مثلاً: علامہ محمد بشیر سہسوانی، قاضی ابو اسماعیل یوسف حسین خانپوری، مولانا محمد نعیم کریمی، شیخ ابو ابراہیم نذیر الفرید، مولانا سید شاہجہاں، سید محمد عبدالحفیظ دہلوی، استاد پنجاب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کے علاوہ محدث ڈیانوی کے شیخ حضرت مولانا قاضی حسین بن محسن

① مقدمہ مفتاح كنوز السنة

② نموذج من أعمال الجبريه (ص: ٦٢٧)

انصاری یمانی رحمہ اللہ کی آرا و تقاریظ دیکھی جا سکتی ہیں۔ شائقین حضرات اصل کی طرف مراجعت فرمائیں۔ ہم نے اختصار کے پیشِ نظر اس کی تفصیل کو حذف کر دیا ہے۔

خود مؤلف مرحوم نے گو اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس کتاب میں اختصار سے کام لیا ہے اور بجز بعض مواضع کے مذاہب کی تفصیل بیان کرنے سے اجتناب کیا ہے (عون المعبود: ۲/۱)۔ مگر جن مباحث پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ شائقین حضرات حسبِ ذیل مواضع کی مراجعت فرمائیں۔

① بحث من أدرك الركعة فقد أدرك الصلاة (۱/۳۳۲، ۳۳۷)

② بحث الجمعة في القرىٰ (۱/۴۱۴، ۴۱۵)

③ الأذان بين يدي الإمام لصلاة الجمعة (۱/۴۲۴ـ۴۲۶)

④ عدد تکبیرات العیدین (۱/۴۴۷، ۴۴۸)

⑤ طلاقِ ثلاثہ (۲/۲۲۸ـ۲۳۰)

⑥ صلاۃِ جنازۃ اور اس کے مسائل (۳/۱۹۰ـ۱۹۷)

⑦ غائبانہ نمازِ جنازہ (۳/۱۹۸ـ۲۰۳)

⑧ حدیث: نهى رسول الله ﷺ عن كل مسكر ومفتر (۳/۳۷۰ـ ۳۷۹)

⑨ عورتوں کو لکھنے کی تعلیم دینا جائز ہے یا نہیں (۴/۱۳ـ۱۵)

⑩ حديث مجدد (۴/۱۷۸ـ۱۸۲)

⑪ شرح حدیث نزولِ مسیح (۴/۲۰۳ـ۲۰۷)

⑫ توثیق محمد بن اسحاق (۴/۳۷۱ـ۳۷۳)

⑬ شرح أحادیث امارات الساعۃ (۴/۱۹۱ـ۱۹۵)

⑭ شرح حديث: ”لا يزال هذا الدين قائما حتى يكون عليكم اثنا

عشـ ة خليفة الخ" (٤/١٧٠_١٧٢)

⑮ بابـ فيمن أعتق نصيباله من المملوك (٤/٣٧_٤٠)

ن مواضع کے علاوہ بھی بعض مقامات قابلِ مراجعت ہیں، جہاں مولانا ڈیانوی ۔ قلم کی جولانی اور تحقیقِ حق کی ادائیگی کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں بعض ۔ ت تو ایسے ہیں جو خصوصی شان لیے ہوئے ہیں اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا ق ہے کہ ان مباحث کی تفصیل کسی اور کتاب میں ملنا مشکل ہی نہیں، بلکہ محال ۔ ۔ کتاب الاشربہ میں عنبر، کستوری، زعفران، جوز بوا، جلوتری، عود ہندی اور افیون و ر کے متعلق جو فاضلانہ بحث محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے کی ہے وہ کم ہی کسی کتاب ں ملے گی۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے اس شرح میں صرف احادیث کی توضیح ہی پر ا ا نہیں کیا، بلکہ وہ عصری مسائل پر گفتگو فرماتے ہیں اور باطل نظریات کی بیخ کنی کرتے ہیں، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی "فرقہ نیچریہ" وغیرہ پر (۴/۲۰۵،۲۰۶) میں بھرپور ر کیا ہے اور ان کے عقائد ونظریات کا ابطال ظاہر کیا ہے۔ سیدین شہیدین حضرت مولانا سید احمد بریلوی اور سید محمد اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ سے کون ، نف نہیں "إعلاء کلمة الله" کے لیے سرفروشی کا وہ مظاہرہ کیا کہ قرونِ اولی کی یا زہ ہوگئی۔ مگر بدقسمتی سے ان کے رفقا میں بعض غالی ایسے بھی ہوئے، جنھوں نے ۔ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ سید احمد بریلوی رحمہ اللہ معرکہ بالاکوٹ میں شہید نہیں ہوئے ہ روپوش ہو گئے ہیں اور وہی مہدی موعود ہیں۔ معاذ الله۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے ہ ی موعود کے مسئلے پر جہاں شیعہ حضرات کے "امامِ غیب" کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہاں سید احمد بریلوی کے متعلق اس غلط نظریہ کی پرزور تردید کی ہے کہ و مہدی موعود ہیں اور دوبارہ آئیں گے اور بالآخر لکھا ہے:

"ونعوذ باللہ من هذه العقيدة المنكرة الواهية"[1]

ان مباحث کو دیکھ کر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے اس قول کی
مزوری واضح ہو جاتی ہے۔

"هذا الشرح قاصر عن أن يسمى شرحاً مع أن مؤلفه
تجاوز عن الحد في الطعن والسب كأنه تقلد صاحب
غاية المقصود"[2]

"یہ شرح شرح کہلانے کی حق دار نہیں، پھر اس کے مؤلف نے طعن و تشنیع
میں حدود سے تجاوز کیا اور اس باب میں مؤلف نے صاحبِ غایۃ المقصود
کی تقلید کی ہے۔"

ہمیں اعتراف ہے کہ غایۃ المقصود جیسی تفصیلی بحث اس میں نہیں، لیکن یہ کہنا
کہ یہ شرح شرح کہلانے کی حق دار ہے۔ سورج پر تھوکنے کے مترادف ہے جن
مباحث کی ہم نے نشاندہی کی ہے۔ ان کا تقابل بذل المجہود سے کر لیجیے جس سے ان
شاء اللہ اس بات کی حقیقت کھل جائے گی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صوم و صلاۃ کے
اختلافی مسائل کے بعد بذل المجہود کے آخری اجزا کی حقیقت ہی کیا ہے اور کون سے
مباحث ہیں جن میں مؤلف مذکور نے اپنے "اجتہادی" جوہر دکھلائے ہیں۔ جہاں
تک آخری الزام کا تعلق ہے وہ صرف ان کے مسلکی تعصب کا آئینہ دار ہے۔ ہم
غایۃ المقصود پر تبصرے میں عرض کر آئے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا ان کے
رفقا کے متعلق طعن و تشنیع کا یہ الزام محض افترا اور غلط بیانی ہے۔ ایسے کسی ایک مقام کی

[1] "عون" (١٧٢/٤)

[2] مقدمہ بذل

بھی ثناندہی نہیں کی جاسکتی، لیکن اگر امام صاحب کے بعض فقہی مسائل پر تنقید و تبصرہ کا نام طعن اور سب وشتم ہے تو ہم عرض کریں گے ع

این گناہ ایست کہ در شہر شمانیز کنند

اس ''جرم'' میں وہ تنہا نہیں، بلکہ ان کے ہمنوا امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگردانِ رشید قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ بلکہ دیگر تلامذہ مثلاً امام زفر رحمہ اللہ، امام عبداللہ بن مبارک وغیرہ بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے استاد سے اصول وفروع میں جائز وناجائز اور حلت وحرمت کے مسائل میں اختلاف کیا ہے تو کیا مولانا سہارنپوری یا ان کے ہمنوا ان کے متعلق بھی یہی رائے دینے کے لیے تیار ہیں! دیدہ باید!

''عون المعبود'' کا مصنف کون ہے؟

عموماً یہ بات مشہور ہے کہ اس بلند پایہ شرح کے مصنف محدث شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ ہیں، مگر ''عون المعبود'' کے جلد اول اور ثانی کے خاتمہ سے مترشح ہوتا ہے کہ ''غایۃ المقصود'' کی تلخیص و اختصار المسمی بہ عون المعبود کا کام محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کے بھائی مولانا ابو عبدالرحمان شرف الحق المعروف بہ محمد اشرف رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ چنانچہ جلد اول کے دیباچہ میں بھی تصریح ہے:

''أما بعد فيقول العبد الفقير إلى الله أبو عبد الرحمٰن شرف الحق الشهير بمحمد أشرف بن أمير بن علي بن حيدر الصديقي العظيم آبادي إن هذه الفوائد المتفرقة والحواشي النافعة ... وسميتها بعون المعبود على سنن أبي داود تقبل الله مني''[1]

[1] ''عون المعبود'' (۱/۲)

''حمد و ثنا کے بعد اللہ کا غلام وفقیر ابو عبدالرحمان شرف الحق جو کہ محمد اشرف کے نام سے مشہور ہے عرض کرتا ہے کہ یہ متفرق فوائد اور مفید حواشی ہیں ... میں نے اس کا نام ''عون المعبود علی سنن ابی داود'' رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے۔''

اس کے علاوہ اس کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ پہلی دو جلدوں میں تقریباً ہ اہم ث کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''وقد أطال أخونا المعظم في شرح حديث في غاية المقصود''

اور کبھی لکھتے ہیں:

''وأبسط في غاية المقصود''

یعنی اس حدیث کی شرح میں ہمارے بھائی نے ''غایۃ المقصود'' میں تفصیل ے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے ''بذل ا و د'' ں اور صاحب ''معجم المؤلفين'' (٩/٦٣) نے بھی اس کو مولانا محمد اشرف کی صنیف قرار دیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ عون المعبو کے شارح مولانا محمد اشرف رحمہ اللہ ہیں، مگر جب ہم اس کی تیسری جلد کے اواخر اور چ ں کا فتتاحیہ اور خاتمہ کو دیکھتے ہیں تو یہ یقین تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے لاوہ ون المعبود کے اواخر میں ملحقہ تقاریظ میں بھی اسے مولانا ڈیانوی ہی کی تصنیف رار یا گیا ہے اور مولانا امام خاں نوشہروی مرحوم نے اپنے مقالہ ''ہندوستان میں علم حد ث'' ں بھی اسے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ ہی کی طرف منسوب کیا ہے جس سے بظاہر یہ ماملہ لجھا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن غور وفکر کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے ہ یہ

اختصار بھی دراصل محدث ڈیانوی ہی کی طرف منسوب کیے جانے کا مستحق ہے۔ جس پر حسب ذیل امور دلالت کرتے ہیں۔

① بظاہر گو یہ اختصار مولانا محمد اشرف رحمہ اللہ کا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی تلخیص و تحقیق میں اکثر و بیشتر چونکہ حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ ہی کے فرمودات کا حصہ ہے۔ اس لیے اسے مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ اہلِ علم بخوبی واقف ہیں کہ سؤالات الحاکم اور سؤالات السلمی و حمزہ عن الدارقطنی کو اصحابِ التراجم نے امام دارقطنی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان کے جامع اور مرتب امام حاکم رحمہ اللہ، ابو عبدالرحمان سلمی اور حمزہ السہمی رحمہم اللہ ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی معروف کتاب ''العلل'' بھی امام برقانی رحمہ اللہ کی مرتبہ ہے اور امام دارقطنی رحمہ اللہ سے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ بایں ہمہ وہ امام دارقطنی رحمہ اللہ ہی کی کتاب شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح ''عون المعبود'' میں گو قلم مولانا محمد اشرف رحمہ اللہ کا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہے مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ کے نظر و فکر کا۔ اس لیے اسے مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور اس اعانت کا اعتراف خود مولانا محمد اشرف رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں:

''وقد أعانني شارحه في هذه الحاشية في جل من المواضع وأمدني بكثير من المواضع فكيف يكفر شكره''

''اس اختصار میں ابو داود کے شارح نے اکثر مقامات میں میری مدد کی ہے، لہٰذا ان کے شکر کا انکار کیونکر ہو سکتا ہے۔''

اس کے بعد اس اختصار کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمارے بڑے بھائی جنھوں نے ایک شرح ''غایۃ المقصود'' کے نام

سے لکھنے کی داغ بیل ڈالی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ شرح بڑی طوالت اختیار کر گئی ہے۔ معلوم نہیں یہ اس صورت میں مکمل بھی ہوتی ہے یا نہیں اور نہ ہی میں اسے مختصر کرنا پسند کرتا ہوں۔ ادھر حبیب مکرم مولانا تلطف حسین رحمہ اللہ عظیم آبادی اس پر مُصر تھے کہ مختصر شرح کا بھی ہونا ضروری ہے۔ میں ان کی بات کو رد نہ کر سکا، تاہم آمادگی کا اظہار بھی نہ کیا۔ اسی اثنا میں علامہ ابو الطیب رحمہ اللہ نے اسی بات کا مجھے حکم دیا تو میں نے معذرت کر دی، لیکن انھوں نے میری معذرت قبول نہ کرتے ہوئے فرمایا: تمھیں یہ کام ہر حال میں کرنا چاہیے۔ مقدور بھر میں بھی تمھارے ساتھ تعاون کرتا رہوں گا۔ تو میں نے اللہ کریم پر بھروسا کرتے ہوئے اس کام کا آغاز کر دیا۔''

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اختصار میں فکری راہنمائی محدث ڈیانوی ہی کی تھی اور انھی کے تعاون سے مولانا محمد اشرف مرحوم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

(۲) عون المعبود کو محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی تصنیف قرار دینے کی دوسری بڑی وجہ مولانا تلطف حسین رحمہ اللہ کی شہادت ہے۔ جو محدث موصوف کے ہم عصر، بلکہ ہم سبق اور بے تکلف دوست بھی تھے اور جن کے اہتمام سے یہ شرح شائع ہوئی۔ چنانچہ موصوف کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

''مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابو داود لکھنے کا خیال حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ محدث دہلوی کی ترغیب سے ہوا۔ سنن کے گیارہ نسخوں کو جمع کیا اور ایک صحیح نسخہ تیار کیا۔ اس کے علاوہ تحفۃ الاشراف للمزی، تلخیص السنن للمنذری، معالم السنن للخطابی اور دیگر نایاب کتب کو بھی پیشِ نظر رکھ

کر ''غایۃ المقصود'' کی تالیف شروع کی۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر اسی دوران میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو عون المعبود کا آغاز کر دیا۔ متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ہاتھ بٹانے کے لیے علما کا بورڈ تشکیل دیا اور ان سے حسبِ استعداد کام لیا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ① مولانا ابو عبدالرحمان شرف الحق معروف بہ محمد اشرف۔
② حضرت مولانا عبدالرحمان محدث مبارکپوری صاحبِ تحفۃ الاحوذی۔
③ مولانا محمد ادریس صاحبزادہ حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ۔ ④ مولانا عبدالجبار ڈیانوی جو حضرت مصنف رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔''[1]

مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی رحمہ اللہ نے اس بورڈ میں مولانا قاضی یوسف بن حسین ہزاروی اور مولانا محمد شاہجہاں پوری کو بھی شامل کر دیا ہے۔[2] اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ نے شرح کے سلسلے میں ان حضرات سے استعداد کے مطابق کام لیا۔ البتہ پہلی دو جلدوں کے اختصار میں چونکہ مولانا محمد اشرف صاحب رحمہ اللہ نے نمایاں حصہ لیا ہوگا۔ اس لیے ان کا نام ان جلدوں میں پایا جاتا ہے، لیکن آخری دو جلدوں میں جب یہ امتیاز نہ رہا تو غالباً اسی بنا پر ان میں ان کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ لہٰذا انھیں عون المعبود کا مصنف و شارح قرار دینا صحیح نہیں وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے۔ چھوٹا بھائی ہونے اور علمی استعداد کی بنا پر اگر محدث ڈیانوی نے ان سے ابتدائی مباحث قلم بند کروائے اور ان کی دلداری کی خاطر انھیں اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی اصل

[1] ''عون المعبود'' (٥٥٣/٤)
[2] تراجم ''علمائے حدیث ہند'' (ص:٤٠٢)

شارح ہیں اور یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب غایۃ المقصود کی تکمیل مشکل نظر آئی تو بالآخر محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے بنفسِ نفیس اس کام کا خود بیڑا اٹھایا اور رفقا کی اعانت سے اس کی تکمیل کی اور ابتدائی جلدوں میں چونکہ اختصار کا کام بالفعل مولانا محمد اشرف صاحب رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ اس لیے اس حصے میں تو ان کا نام پایا جاتا ہے، مگر بعد کی جلدوں میں ایسا نہیں۔

③ التعليق المغني على سنن الدارقطني:

کتبِ حدیث میں سنن دارقطنی کا شمار گو تیسرے طبقہ میں ہوتا ہے، لیکن اس کی خوبی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ علمائے فن نے اسے ''مظان حسن'' میں شمار کیا ہے۔[1] حاجی خلیفہ رحمہ اللہ اور طاش کبریٰ زادہ رحمہ اللہ نے احادیث کی امہات الکتب میں اسے شمار کیا ہے۔ ''امام دارقطنی'' کے عنوان سے ادارہ علوم اثریہ کی طرف سے ہمارا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے، جس میں ہم نے سنن دارقطنی کی اہمیت پر کافی شرح و بسط سے بحث کی جو قابلِ دید ہے۔ اور اب یہ اسی مجموعہ مقالات میں شامل کر دیا گیا ہے۔

حدیث کی یہ بلند پایہ کتاب ہمارے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی محنت و کاوش سے منصۂ شہود پر آئی۔ ''سنن دارقطنی'' کا ایک نہایت خوشخط کامل نسخہ ان کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ دوسرا نسخہ شیخ عبدالغنی الزبیدی رحمہ اللہ کا مصححہ نسخہ جو انھوں نے مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی رحمہ اللہ سے مستعار لیا اور تیسرا نسخہ مولانا رفیع احمد شکرانوی رحمہ اللہ سے حاصل کیا جو محدث موصوف کے ہم عصر و ہم مشرب بزرگ تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ نسخہ گو ناقص تھا، لیکن بہت قدیم اور صحیح تھا، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر بائیس کبار حفاظِ حدیث کے دستخط تھے۔ جن میں حافظ

[1] تدريب الراوي (ص: ٩٨)

ابو ا لحجاج المزی، حافظ عبدالمومن دمیاطی، حافظ عراقی، حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی، شیخ عبید اللہ بن عمر العجمی، شیخ صالح فلانی، علامہ ہیثمی رحمہم اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ [1]

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے ان تینوں نسخوں کو سامنے رکھ کر سند و متن کی تصحیح کی اور حاشیہ میں جابجا نسخوں کے اختلاف کا بھی ذکر فرمایا اور دورانِ مطالعہ و تصحیح سند و متن میں جہاں ابہام محسوس فرمایا اس کی توضیح و تشریح کر دی جو ''التعلیق المغنی'' کے نام سے سامنے ہی طبع ہوئی۔ خود مؤلف موصوف لکھتے ہیں:

''هذه تعليقات شتى علقتها على السنن للإمام علي بن عمر بن أحمد الدارقطني وقت مطالعة ذلك الكتاب المبارك'' [2]

کتاب کے شروع میں ایک تو مقدمہ ہے جس میں تین فصلیں ہیں:

① فصل اول میں امام دارقطنی کے حالات۔

② فصلِ ثانی میں رواۃ السنن اور نسخوں کا اختلاف۔

یہاں یہ بات فائدے سے خالی نہیں کہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ''بستانِ محدثین'' (ص: ۲۸) میں اور انہی کی اتباع میں محدث ڈیانوی نے ذکر کیا ہے کہ امام دارقطنی سے سنن کا سماع گو ان کے متعدد تلامذہ نے کیا ہے۔ لیکن اس کی روایت کا یہ سلسلہ جن حضرات سے قائم ہے وہ تین ہیں:

(۱) امام ابو بکر محمد بن عبدالملک بن بشران۔

(۲) امام ابو طاہر محمد بن احمد بن محمد۔

(۳) امام ابو بکر رحمہ اللہ محمد بن احمد البرقانی۔ [3]

---

(1) اشتہار ملحقہ ''غاية المقصود'' إعلام أهل العصر، التعليق المغني، الطبعة الأولىٰ

(2) ''التعليق المغني'' (ص: ۷)

(3) غالباً محدث عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ''بستان المحدثين'' میں اسی طرح تیسرا نسخہ البرقانی کا ←

ان کے علاوہ ابو الطیب، طاہر بن عبداللہ الطبری اور ابو الحسن محمد بن علی بن عبداللہ المہتدی باللہ بھی السنن کی روایت کرتے ہیں، لیکن زیادہ مشہور یہی تین نسخے ہیں۔ راقم آثم عرض کرتا ہے کہ ان حضرات کے علاوہ احمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ بن الحارث ابوبکر التمیمی المقری المتوفی ۴۳۰ھ بھی امام دارقطنی رحمہ اللہ سے سنن کے راوی ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے السنن الکبریٰ اور کتاب القراءۃ وغیرہ میں سنن دارقطنی کی روایات انہی کے واسطے سے ذکر کی ہیں۔ علامہ ابن العماد لکھتے ہیں: راوی السنن عن الدارقطنی، شذرات (۳/۲۴۵)

مقدمے کی تیسری فصل میں محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے امام دارقطنی رحمہ اللہ تک اپنے سلسلہ سند کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد التعلیق المغنی کا آغاز ہوتا ہے، جسے بادیٔ النظر میں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں محدث ڈیانوی نے رجال کی تحقیق، ضبطِ اسما، اسانید کی تعلیل و تصحیح، احادیث کی تخریج، اماکن کی توضیح، غریب الحدیث کی تشریح کا خصوصی اہتمام کیا ہے، اسی طرح حسبِ ضرورت فقہی مباحث میں بھی کافی شرح و بسط سے کلام کیا ہے، مثلاً: "باب إعادة الصلاة في جماعة" کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مسجد میں ایک یا دو مرتبہ یا اس سے زیادہ بار بھی جماعت ہو چکی ہو تو پھر بھی اس میں جماعت سے نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اس

← ذکر کیا ہے۔ اسی بنا پر علامہ ڈیانوی نے امام ابوبکر احمد بن محمد البرقانی کو السنن کا راوی قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں، ان کے بجائے السنن کے راوی ابو منصور محمد بن محمد بن احمد التوقانی ہیں، جیسا کہ المعجم المفهرس لابن حجر (ص: ٤٨) اور سیر أعلام النبلاء (۱۸/٦) میں ہے۔ بستان المحدثین کے مطبوعہ فارسی اور مترجم نسخوں میں البرقانی کے بجائے توقانی ہے مگر وہ بھی صحیح نہیں۔ واللہ أعلم

نمل رہا ہے اور جن حضرات نے دوبارہ جماعت کو مکروہ فرمایا ان کا یہ
ل ضعیف، بلکہ بلا دلیل ہے۔''

اس کے بعد اپنے اس دعوے پر حضرت انس، ابو سعید الخدری، ابو امامہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کی روایات سے استدلال کرنے اور ان کی فنی حیثیت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے اس قصے کا ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس نووارد کے ساتھ نماز جماعت سے دوبارہ پڑھی۔ جب کہ پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہی نماز پڑھا چکے تھے اور یہاں یہ کہنے کی گنجایش نہیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا اس نووارد صحابی کے ساتھ نماز پڑھنا ن پر جماعت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ ابن ماجہ اور دوسری کتبِ احادیث میں با صراحت مروی ہے: "الاثنين فما فوقهما جماعة" ''دو یا اس سے زائد جماعت ہے۔'' اگر کہا جائے کہ اس واقعے سے استدلال تام نہیں، کیوں کہ اس میں تو مفترض کی اقتدا متنفل کے لیے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے، حالانکہ بحث مفترض کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان « ألا رجل يتصدق علىٰ هذا؟» یا « أيكم يتجر على هذا؟» عام ہے جو مفترض اور متنفل دونوں کی اقتدا کو شامل ہیں اور اگرچہ اس واقعے میں متنفل کے لیے مفترض کی اقتدا ثابت ہوتی ہے، لیکن اس سے عموماً دوبارہ جماعت کرانے سے منع کرنا بھی محتاجِ دلیل ہے۔ جب کہ اصول یہ ہے کہ ایک خاص واقعے سے عام الفاظ کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس پر راویِ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عمل بھی شاہد ہے جسے ابو یعلی رحمہ اللہ اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے یوں ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے بیس ساتھیوں کے

ساتھ صبح کی نماز ہو جانے کے بعد مسجد بنی ثعلبہ میں تشریف لائے تو انھوں نے ایک آدمی کو اذان اور اقامت کا حکم دیا، پھر تمام ساتھیوں سمیت جماعت سے نماز ادا کی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ یہی قول متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا ہے کہ مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق رحمہ اللہ اسی بات کے قائل ہیں، مگر دوسرے اہلِ علم مثلاً امام سفیان ثوری، ابن مبارک، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ جب جماعت ہو جائے تو دوبارہ اکیلے نماز پڑھنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ پہلا قول صحیح ہے، اس پر دلائل بھی ہیں۔ ہمارے شیخ محمد نذیر حسین محدث دہلوی کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ ملخصاً

"التعلیق المغنی" پہلی بار ۱۳۱۰ھ میں مطبع انصاری دہلی سے ۵۵۴ بڑے صفحات پر مشتمل طبع ہوئی، جس کے آخر میں علامہ حسین بن محسن انصاری رحمہ اللہ کے دو گراں قدر رسالے بھی مطبوع ہیں۔ پہلا رسالہ "البیان المکمل في تحقیق الشاذ و المعلل" اور دوسرا "القول الحسن المتیمن في ندب المصافحة بالید الیمنی" ہے۔ کتاب کے اختتام پر شیخ ابو عبدالرحمان اسحاق بن عبدالرحمان بن حسن بن الشیخ محمد بن عبدالوہاب اور شیخ محمد بن حسین بن محسن الانصاری کی تقاریظ بھی ہیں۔

یہ نسخہ چونکہ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے اپنی زیرِ نگرانی طبع کرایا تھا۔ اس لیے اس میں انھوں نے سنن کی تصحیح کا مقدور بھر اہتمام فرمایا۔ نسخوں کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے جابجا ان کی علامت سے دوسرے نسخوں کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ کاتب کی غلطی سے جہاں کہیں اغلاط پائے گئے: "مزیل الاغلاط" کے نام سے اس کا صحت نامہ بھی شائع کیا، لیکن افسوس طبع ثانی میں جو ۱۳۸۶ھ میں بمطابق ۱۹۶۶ء میں شیخ عبداللہ ہاشم یمانی المدنی کی تصحیح سے شائع ہوئی۔ اس میں ان امور کا چنداں اہتمام نہیں کیا

گیا، نہ اختلافِ نسخ کو تو بالکلیہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس سے بسا اوقات عبارت میں عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً: "باب القهقهة في الصلاة وعللها" کے تحت امام دارقطنی رحمہ اللہ ایک جگہ ابو العالیہ رحمہ اللہ کی روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كان أربعة يصدقون من حديثهم ولا يبالون ممن يسمعون الحديث: الحسن وأبو العالية وحميد بن هلال قال الشيخ ولم يذكر الرابع"

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ یہاں "هلال" پر نسخے کی علامت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هلال و داود بن أبي هند"[1]

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تهذيب التهذيب" (۵۲/۳) میں حمید بن ہلال کے ترجمے میں صراحت کی ہے: "شیخ نے تین کا ذکر کیا ہے اور چوتھے راوی کا ذکر نہیں کیا، البتہ سنن کے بعض نسخوں میں داود بن ابی ہند کا نام بھی ملتا ہے۔" لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس مصری طبع میں چوتھے راوی (یعنی داود بن ابی ہند) کو متن میں ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ "ولم يذكر الرابع" ملاحظہ ہو (۱۰۲/۱) اسی طرح طبع ہند کے (ص: ۳۲۸) سطر بیس میں "أخبرنا عمرود بن دينار" پر محدث ڈیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "هكذا في النسخ الموجودة لعله عمرو بن دينار" (ص: ۳۲۹، سطر: ۸) میں "عن ابن شريح الخزاعي" کے متعلق لکھتے ہیں: "هكذا في النسختين وهو أبو شريح كما في رواية أخرى لكن يصح ابن شريح أيضا بقول من قال اسم أبي شريح

---

[1] سنن دار قطني (ص: ٦٣) طبع هند

خویلد بن شریح بن عمرو'' یعنی دونسخوں میں اسی طرح ابن شریح ہے۔ مگر دراصل وہ ابوشریح ہے، جیسا کہ بعد کی روایت میں ہے، لیکن ابن شریح بھی صحیح ہے، جب کہ کہا گیا ہے کہ ابوشریح کا نام خویلد بن شریح بن عمر ہے، لیکن طبع ثانی میں اول الذکر مقام پر اصل نسخہ کے بجائے عمرو بن دینار ہی نقل کر دیا اور ثانی الذکر مقام میں ''ابن شریح'' کی جگہ ''ابوشریح'' کر دیا گیا ہے اور بس، دیکھیے علی الترتیب (ص: ۹۵، سطر ۵۔ ص: ۹۶، سطر ۱۴، ج ۳) جس سے ایک طرف تو محدث ڈیانوی کی دیانت امانت کا ثبوت باہم پہنچتا ہے تو دوسری طرف طبع ثانی کے مصحح جناب عبداللہ ہاشم صاحب کی تساہل پسندی کا بھی علم ہوتا ہے اور اگر سنن کی طبع اول میں کوئی غلطی بشری تقاضے کے مطابق رہ بھی گئی ہے تو اس پر قطعاً غور نہیں کیا گیا۔ مثلاً: ''باب صلاۃ المریض جالسا بالمأمومین'' کے تحت پانچویں حدیث کی سند یوں ہے۔ ''عن عبداللہ بن أبي السفر عن عبد اللہ بن الأرقم بن شرحبیل عن ابن عباس الخ'' طبع اول و ثانی میں یہ سند یوں ہی منقول ہے۔ حالانکہ صحیح عبداللہ بن ابی السفر عن الارقم بن شرحبیل ہے، جیسا کہ ''مسند احمد'' (۲/۲۰۹) میں ہے۔

علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے مسند بزار سے بھی یہ روایت بواسطہ الارقم ہی ذکر کی ہے۔ ''نصب الرایہ'' (۲/۵۱) معلوم یوں ہوتا ہے کہ کاتب کی نظر عبداللہ بن ابی السفر لکھنے کے بعد پھر عبداللہ پر جا لگی اور اس کے بعد عبداللہ بن الارقم بن شرحبیل لکھ دیا ہے۔ یاد رہے کہ نصب الرایہ کے حاشیہ میں سنن دارقطنی کے حوالے سے جو عبدالملک بن الارقم لکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ صحیح عبداللہ بن الارقم ہے۔

ہاں تو بات ''التعلیق المغنی'' کی طبع ثانی کے متعلق تھی کہ شیخ عبداللہ صاحب نے اس میں خاصا تساہل سے کام لیا ہے اور ان کا یہ تساہل معجم طبرانی صغیر طبع ثانی میں

بھی نظر آتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والے احباب کو ان امور کا خیال رکھنا چاہیے۔ حال ہی میں نشر السنۃ ملتان کی طرف سے "التعلیق المغنی" کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے، جس پر سنِ طباعت مذکور نہیں. لیکن یہ غالباً ۱۴۰۰ھ کا ہے۔ یہ ایڈیشن دراصل مصری نسخہ کا ہی عکس ہے، ناشرین حضرات سے ہم نے گزارش بھی کی کہ اس میں نسبتاً ہندی نسخہ کے اغلاط زیادہ ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہندی نسخہ کو شائع کیا جائے اور ہمارے ہاں یہی نسخہ حوالہ جات میں بھی متداول ہے۔ مگر بعض فنی وجوہ کی بنا پر انھوں نے مصری نسخے ہی کو شائع کرنا مناسب سمجھا۔ ہمارے ہاں چونکہ سنن دارقطنی تقریباً ناپید تھی، اس لیے ناشرین حضرات بہرحال شکریہ کے مستحق ہیں کہ بہترین کاغذ میں شائع کر کے سستے داموں اہل علم کے ہاتھوں ہاتھ پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔

اس کے بعد ۱۴۲۰ھ میں نشر السنۃ ملتان نے دوسری بار اس کی طباعت کا اہتمام کیا جس میں شیخ مجدی حسن کی تخریج کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۴۲۲ھ میں السنن کا نسخہ شیخ عادل احمد اور شیخ علی محمد کی تحقیق و تعلیق سے دار المعرفۃ بیروت سے تین جلدوں پر مشتمل شائع ہوا ہے جسے انھوں نے السنن کے مطبوعہ نسخہ کے ساتھ ساتھ تین مخطوط نسخوں کے تقابل سے شائع کیا ہے۔

اس ضمن میں یہاں یہ بات بھی یقیناً فائدے سے خالی نہ ہوگی کہ سنن دارقطنی میں باب التیمم کے تحت (ص: ۱۸۱) پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ سے جو روایت "ضربة للذراعين إلى المرفقين" کے الفاظ سے منقول ہے۔ اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله كلهم ثقات والصواب موقوف"۔ سنن کے مطبوعہ نسخوں میں یہ کلام اسی طرح متن ہی میں مذکور ہے، لیکن

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام دارقطنی نے یہ الفاظ سنن کے حاشیہ میں لکھے ہیں:

"قلت وقال الدارقطني في حاشية السنن عقب حديث عثمان بن محمد كلهم ثقات والصواب موقوف"[1]

اسی طرح "لسان المیزان" اور "تہذیب التہذیب" میں عثمان بن محمد کے ترجمے میں تصریح ہے کہ امام دارقطنی کا یہ قول حاشیہ سنن میں ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "کلھم ثقات والصواب موقوف" کے الفاظ دراصل امام دارقطنی نے حاشیہ میں ذکر کیے ہیں، لیکن بعد میں ناسخ نے انھیں متن میں داخل کر دیا ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے معارف السنن میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے ذکر کرنے کا انداز بڑا معنی خیز ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"وقد اعترف الدارقطني في حديث جابر أن رجاله ثقات، وما وقع في سننه من قوله: والصواب موقوف. فهو كتبه في الحاشية دون متن السنن كما قاله في التلخيص، ولذا لم يذكره الزيلعي في التخريج هذه اللفظة مع شدة حرصه على النقل كله كما هو معروف من عادته فكأن الدارقطني لم يجزم بوقفه وأدخل بعضهم الحاشية في المتن كما هو في المطبوع فهو صنيع غير محمود نبه عليه شيخنا رحمہ اللہ"[2]

"امام دارقطنی نے اعتراف کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور سنن میں جو یہ ہے: "والصواب موقوف" کہ صحیح ہے کہ یہ موقوف ہے تو انھوں نے یہ الفاظ حاشیے میں لکھے ہیں۔ سنن

[1] "التلخيص الحبير" (١/١٥٢)

[2] "معارف السنن" (١/٤٨٠)

ں نہیں، جیسا کہ حافظ نے تلخیص میں کہا ہے یہی وجہ ہے علامہ
یلعی رحمہ اللہ نے تخریج ہدایہ میں یہ لفظ ذکر نہیں کیے، حالانکہ وہ مکمل الفاظ
قل کرنے میں بڑے حریص ہیں، جیسا کہ ان کی معروف عادت ہے۔
گویا امام دارقطنی رحمہ اللہ کو اس کے وقف پر اعتماد نہ تھا۔ اس لیے حاشیے
ں لکھا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے، مگر بعض نے اس حاشیہ کو متن میں
اخل کر دیا۔ جیسا کہ مطبوعہ نسخہ میں ہے اور یہ فعل اچھا نہیں۔ ہمیں اس
ت کی خبر ہمارے شیخ (علامہ کشمیری رحمہ اللہ) نے دی ہے۔"

جہاں تک اس غلطی کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ بہت برا فعل ہے کہ حاشیے کی عبارت کو متن میں داخل کر دیا گیا، مگر انھوں نے جو اپنے شیخ علامہ کشمیری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ "والصواب موقوف" حاشیہ کے الفاظ ہیں یہ بات علامہ کشمیری نے العرف الشذی (ص: ۸۶) میں فرمائی ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

"قال الدارقطني رجاله ثقات وكتب في الحاشية والصواب
نه موقوف"

حالانکہ امر واقع یہ ہے التلخیص میں صرف یہ نہیں کہ حاشیۃ السنن میں "والصواب انه موقوف" ہے بلکہ اس میں "کلهم ثقات" کے الفاظ بھی حاشیے ہی میں ہیں۔ جیسے کہ ہم التلخیص کی مکمل عبارت پہلے نقل کر آئے ہیں۔ یہی مکمل عبارت "لسان المیزان" (۱۵۲/۴) اور "تہذیب" (۱۵۲/۷) میں عثمان بن محمد انماطی کے ترجمے میں ہے۔ مگر علامہ کشمیری اور ان تلمیذ رشید "رجالهم ثقات" کے الفاظ کو تو متن میں ہونے کا تاثر دیتے ہیں اور "والصواب موقوف" کو حاشیہ کے الفاظ کہہ کے مشکوک بنا رہے ہیں۔ السنن پر امام دارقطنی کے حواشی اور بھی ہیں۔ "لسان المیزان"

کی (۱۲۳/۴) پر عبید بن محمد کے ترجمے میں بھی حاشیہ دارقطنی سے عبارت منقول ہے۔ تہذیب میں بھی اس کا ذکر ہے تو کیا ان سب کو مشکوک قرار دیا جائے۔

امام دارقطنی کے حاشیے کا یہ مکمل کلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "إتحاف المهرة" (۴۸۷/۳) میں نقل کیا ہے، مگر یہ نہیں کہا کہ یہ حاشیہ سنن میں ہے۔ یہ مکمل کلام متن میں ہے یا حاشیہ میں یہ بہر نوع امام دارقطنی ہی کا کلام ہے۔ "كلهم ثقات" کو تسلیم کرنا مگر "والصواب موقوف" کو تسلیم نہ کرنا "يؤمنون ببعض الكتاب ويكفرون ببعض" کا مصداق ہے۔

حاشیے کی اس عبارت کو متن میں داخل کرنے کی ذمہ داری محدث ڈیانوی رحمہ اللہ پر نہیں ڈالی جا سکتی، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے۔ ان کے پیشِ نظر جو تین نسخے تھے ان میں یہ عبارت حاشیہ ہی میں تھی۔ ورنہ یہ جسارت رجماً بالغیب کے قبیل سے ہو گی۔ محدث موصوف رحمہ اللہ کی شان اس قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے وہ تو خود ان اصحاب پر سخت رنجیدہ ہیں جو دیدہ دانستہ متونِ حدیث میں حک و اضافہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے درج ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث جسے امام حاکم نے ابان بن یزید العطار عن قتادہ عن زرارۃ بن اوفی عن سعد بن ہشام کے واسطے سے "لا يقعد إلا في آخرهن" کے الفاظ سے نقل کیا ہے، جیسا کہ المستدرک کے اصل نسخے میں اور امام بیہقی کی معرفۃ السنن والآثار کی طرف مراجعت سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے التلخیص الحبیر، فتح الباری میں اور المواهب اللدنیہ اور اس کی شرح میں علامہ زرقانی نے یہی لفظ المستدرک سے نقل کیے ہیں اور مجھے

المستدرك کے ایک نسخے کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جو شیخ حسن علی محدث لکھنوی، جو کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے، کی زیرِ نظر رہ چکا تھا۔ اس میں یہ روایت دیکھی جس میں ''لا یقعد'' کی جگہ بیاض تھا۔

''یعنی اس نسخے میں نہ تو ''لا یقعد'' کے الفاظ تھے اور نہ ہی ''لا یسلم'' کے، جب علمائے احناف میں سے کسی ایک نے اس نسخے کو نقل کروایا تو میں نے انھیں لکھا کہ اس اصل نسخہ میں ''لا یقعد'' کے الفاظ کی جگہ بیاض ہے۔ شاید کاتب سے یہ الفاظ رہ گئے ہیں تو انھوں نے مجھے جواب دیا کہ جو بات تم کہتے ہو درست ہے۔ پھر میں نے انھیں لکھا کہ یہاں ''لا یقعد'' کے الفاظ ہونے چاہییں تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ تو میں نے کہا کہ علما نے اس روایت کو یوں ہی نقل کیا ہے اور یہ روایت انھی الفاظ سے المستدرك کے نسخے میں مشہور ہے، لیکن اس نے میری بات پر بھروسا نہ کیا۔ اس وقت شرح زرقانی علی المواہب کے علاوہ میرے پاس اور کوئی کتاب بھی نہ تھی اور وہ تھی بھی اسی کے پاس۔ میں نے اس کی آٹھویں جلد طلب کی اور روایت کی نشاندہی کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہاں اسی طرح بیاض رہنے دو اور اس کے حاشیہ میں لکھ دو کہ اصل نسخہ میں یہاں بیاض تھا۔ البتہ شرح زرقانی میں یوں ہے، لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا اور اس کے حاشیے میں یہ لفظ لکھ دیے: ''لا یسلم إلا في آخرھن'' [1] إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

[1] ''التعليق المغني'' (۲/۲۷)

اندازہ فرمایئے خود مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ حدیث میں حک و اضافہ کو کس قدر مذموم قرار دیتے ہیں اور اس کے مرتکبین پر کس طرح اظہارِ ناراضی فرماتے ہیں، لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ علمائے احناف مثلاً: ابو الحسن امروہی، میر حسن نعمانی وغیرہ نے جب المستدرک کی طباعت کا بیڑا اٹھایا تو متن ہی میں ''لا یسلم في آخرھن'' کے الفاظ داخل کر دیے، حالانکہ ''فتح الباري'' (۲/۳۸۵) ''السنن الکبریٰ للبیهقي'' (۳/۲۸) ''تلخیص المستدرك'' (۱/۱۱٦) ''معرفة السنن والآثار، سبل السلام'' (۲/٦) ''فتاویٰ مولانا عبد الحي لکھنوي (۱/۱۸۳) ''التلخیص الحبیر'' (۱/۱۱٦) ''شرح الزرقاني علی المواهب'' میں المستدرك کے حوالے سے یہی روایت ''لا یقعد إلا في آخرھن'' کے الفاظ سے منقول ہے۔ بلکہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''راجعت ثلاث نسخ للمستدرك فلم أجده فیها بلفظ الزیلعي وإنما فیها ''وکان لا یقعد .... وظني'' أنه لا بد أن یکون في نسخة باللفظ الذي حکاه الزیلعي فإنه متثبت جداً في النقل''[1]

''میں نے مستدرک کے تین خطی نسخے دیکھے ہیں۔ میں نے ان میں ان الفاظ سے ''لا یسلم الخ'' یہ روایت نہیں دیکھی، جن الفاظ سے زیلعی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ ان میں ''لا یقعد الخ'' ہے میرا خیال ہے کہ ضرور کسی نسخہ میں ''لا یسلم'' کے الفاظ ہوں گے۔ جنھیں زیلعی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، کیوں کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نقل میں نہایت

[1] معارف السنن (۴/۱۹۰) العرف الشذي (ص: ۲۰۷)

بات ثابت ہوئے۔"

اس غلطی کا ارتکاب اولاً کس سے ہوا؟ اس کے لیے علاحدہ ایک مقالے کی ضرورت ہے۔ "لا یقعد" کے الفاظ کی صحت میں یہی بات بین ثبوت ہے کہ امام بیہقی، امام حاکم کے براہِ راست شاگرد ہیں اور المستدرک ہی کی سند سے انھوں نے "لا یقعد" کے الفاظ معرفۃ السنن اور السنن الکبریٰ میں نقل کیے ہیں اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا تلخیص المستدرک میں "لا یقعد" کے الفاظ ہی نقل کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ المستدرک میں "لا یقعد" ہی ہے۔ "لا یسلم" نہیں خیر اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں سردست مصححین مستدرک کی بدیانتی کے لیے ہم ایک اور بین ثبوت ذکر کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ مصححین حضرات نے خطی نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"و نسخة كاملة من مكتبة مولانا السيد شاه إحسان الله بن رشد الله السندهي المعروف بصاحب اللواء وهو أصح النسخ و أحسنها كتابة" [1]

"ایک مکمل نسخہ مولانا سید احسان اللہ بن رشد اللہ صاحب سندھی پیر آف جھنڈا کے مکتبہ سے حاصل ہوا یہ نسخہ تمام نسخوں سے زیادہ صحیح اور خوشخط ہے۔"

الحمدللہ یہ نسخہ مبارکہ ان گناہگار آنکھوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے جو ان دنوں حضرت مولانا سیدی و مرشدی محب اللہ بن احسان اللہ صاحب رحمہ اللہ پیر آف جھنڈا درگاہ شریف کے نامی کتب خانہ کی زینت ہے۔ ہم نے جب اس میں اس حدیث کی تلاش کی تو اس کے ورق: ۱۲۰ پر یہ حدیث مل گئی۔ مگر وہاں نہ "لا یسلم"

[1] المستدرک (۴/ ۶۱۱)

کے الفاظ ہیں اور نہ "لا یقعد" کے، جیسا کہ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے "التعلیق المغنی" میں شیخ حسن علی لکھنوی کے نسخہ میں ذکر کیا ہے، لیکن اس مقام کے حاشیے پر حضرت پیر احسان اللہ مرحوم کے والدِ گرامی سید رشد اللہ ابو تراب رحمہ اللہ کے ہاتھوں سے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

"ترك الكاتب في الأصل ههنا اللفظة "لا يقعد" وهي موجودة في كتب الحفاظ الناقلين لهذه الرواية من المستدرك نبه عليه العلامة شمس الحق في تعليقه على الدار قطني فليتنبه لذلك"

"کاتب نے اصل نسخہ میں یہاں "لا یقعد" کے الفاظ چھوڑ دیے ہیں اور یہ الفاظ حفاظ ناقلین کی کتابوں میں مستدرک کی اس روایت میں موجود ہیں، جیسا کہ علامہ شمس الحق نے سنن دارقطنی کی تعلیقات میں متنبہ فرمایا ہے۔"

اس کے باوجود مصححین حضرات نے اس نسخے کے حسن وصحت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی نہ بیاض رہنے دیا اور نہ ہی حاشیہ میں یہ تشریح کی کہ سندھی نسخہ میں (جو اصح واحسن ہے) بیاض ہے۔ مگر وائے افسوس ان خادمین سنتِ نبوی ﷺ نے برادرانِ یوسف کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے بالکل برعکس متن میں "لا یسلم" کے الفاظ نقل کر دیے اور حاشیہ میں کہہ دیا گیا کہ بعض نسخوں میں "لا یقعد" ہے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" ہماری اس توضیح سے "مصححین مستدرک" پر مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے کورانہ اعتماد کی قلعی بھی کھل جاتی ہے، جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ سے فرمایا:

وهو كذلك في نسخة المستدرك المطبوعة بدائرة المعارف الهند وكانت عند الطابعين أربع نسخ مختلفة واجتهدوا في تصحيحها ولم ينبهوا هنا على الاختلاف الخ"[1]

'لا يقعد' کے الفاظ اسی طرح المستدرک کے مطبوعہ نسخہ میں ہیں جو دائرۃ المعارف ہند سے طبع ہوا ہے۔ طابعین کے پاس مختلف چار نسخے تھے، انھوں نے اس کی تصحیح میں بڑی کوشش کی ہے، مگر انھوں نے اختلاف پر تنبیہ نہیں فرمائی۔"

لیکن یہ محض حسن ظن کا نتیجہ ہے۔ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ المستدرک کا خطی نسخہ پیر آف جھنڈا میں جو کہ "أصح و أحسن" ہے۔ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے، جس سے اس ڈھول کے پول کا آسانی سے پتا لگایا جا سکتا ہے۔

خیر بات توقع سے کچھ زیادہ لمبی ہوگئی۔ ذکر تھا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث تیمم کا، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے حاشیۂ سنن میں فرمایا ہے: "كلهم ثقات والصواب موقوف" مولانا بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "والصواب موقوف" کے الفاظ حاشیۂ سنن میں ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ اسے موقوف کہنے میں متردد ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں حاشیۂ سنن میں صرف "والصواب موقوف" ہی کے الفاظ نہیں، بلکہ "رجاله كلهم ثقات والصواب موقوف" یہ سب الفاظ حاشیہ میں ہیں جیسا کہ ہم "التلخيص الحبير"، "تهذيب التهذيب" اور "لسان الميزان" کے حوالے سے پہلے ذکر کر آئے ہیں، اور یہ امام دارقطنی کا ہی کلام ہے جیسا کہ اتحاف المہرۃ کے حوالے سے ہم نقل کر آئے ہیں۔ یوں نہیں کہ امام دارقطنی نے

[1] "معارف السنن" (١٩٠/٤)

اس میں کوئی تردد تھا، اس لیے حاشیہ میں اسے لکھا ہے۔ پھر یہاں علامہ زیلعی ﷫ کی رفعتِ شان اور ''نقلِ صادق'' کا بہانہ بھی نہایت کمزور ہے۔ جب کہ حافظ ابن حجر ﷫ نے بالصراحت تین کتابوں میں اس پورے جملے کا حاشیہ میں ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ہم اگر یہاں علامہ زیلعی ﷫ کے متعلق ''نقلِ صادق'' کا جائزہ شروع کریں تو بات لمبی ہو جائے گی اور یہ بحث بھی سرِ دست ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن کیا اس پر بھی غور کیا کہ ''کلهم ثقات'' کے الفاظ کو متن میں شمار کرے۔ اور ''والصواب موقوف'' کو حاشیہ کے الفاظ باور کرانے میں کیا راز ہے؟ تو یقین جانیے، اس کا باعث محض مسلکی حمیت ہے، کیوں کہ اس حدیث میں تیمّم کے۔ یے دو ضربات کا ثبوت ہے۔ جیسا کہ احناف کا مسلک ہے اور یہی مسلکی حمیت مستدرک کے نسخہ میں تحریف کا باعث ہے۔ اللہ کریم ہماری اور ان بزرگوں کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

تنبیہ:

سنن دارقطنی کا شمار چونکہ تیسرے طبقے کی کتبِ احادیث میں ہوتا ہے، جس میں ضعیف اور منکر روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لیے اس کے رجال و اسناد پر بھی محدث ڈیانوی نے خصوصی توجہ دی ہے۔ رجال کی تحقیق و اسانید کی تعلیل و تصحیح میں مبداءِ فیض سے جو ذوق محدث ڈیانوی ﷫ کو ملا تھا۔ اس کے اعتراف کے باوجود سہو و نسیان سے ہم انھیں مبرا خیال نہیں کرتے اور نہ ہی اس سلسلے میں ان کے فیصلے ہر جا کافی و شافی سمجھتے ہیں۔ آخر وہ تھے تو انسان ہی اور بالخصوص اس صحرا نوردی میں کس کا قدم ڈگمگانے سے محفوظ رہا ہے، مثلاً باب النیہ میں حضرت انس ؓ کی حدیث: ۲) کے متعلق فرماتے ہیں: ''هذا إسناد ليس فيه مجروح'' (۱/۱)۔ حالانکہ اس میں ''الحارث بن غسان'' راوی مجہول ہے عقیلی نے اسے ضعفاء

میں ذکر کیا ہے۔[1]

اسی طرح "باب ما روي من قوله رسول الله ﷺ الأذنان من الرأس" میں (حدیث: ۴۹) کے تحت فرماتے ہیں:

"ليس في إسناد هذا الحديث مجروح"[2]

حالانکہ اس میں ایوب بن عبداللہ ابو خالد القرشی مجہول ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی ؒ نے "میزان" (۱/۲۹۰) میں کہا ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" (۱/۴۸۷) میں ذکر کیا ہے کہ ابن عدی نے اسے الکامل میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح "سنن دارقطنی" (۱/۱۶۵) میں "باب أحاديث القهقهة" کے تحت (حدیث ۱۲) کی سند میں محمد بن عیسیٰ بن حنان ہے جو الحسن بن قتیبۃ سے روایت کرتا ہے۔ علامہ ڈیانوی کا خیال ہے یہ محمد بن عمرو بن حنان الحمصی ہے اور "عیسیٰ" عمرو سے تصحیف ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، بلکہ راوی محمد بن عیسیٰ بن حیان ہے اور اس کا ترجمہ "تاریخ بغداد" (۲/۳۹۸) "میزان الاعتدال" (۳/۶۷۸) ہے اور "لسان" (۵/۳۳۴) میں حیان کے بجائے "حبان" ہے جو تصحیف ہے۔ "إتحاف المهرة" (۱۲/۹) میں بھی "حیان" ہی ہے۔ امام ابن عدی نے یہ روایت "الکامل" (۵/۱۷) میں ذکر کی ہے اور وہاں بھی علی محمد بن عیسیٰ بن حیان ہی ہے۔ رہا محمد بن عمرو بن حنان الحمصی تو اس کا ترجمہ خطیب نے "تاریخ بغداد" (۳/۱۲۸) میں ذکر کیا ہے۔ اس نوعیت کے مقامات اور بھی ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کی تحقیق کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اسے من وعن قبول کر لینا اہلِ تحقیق کے لیے زیبا ہے۔

---

[1] لسان المیزان (۲/۱۵۵)

[2] (۱/۱۰۶)

دورِ تصنیف:

''التعلیق المغنی'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک شرح کا آغاز ''غایۃ المقصود'' ہی کے دورِ تصنیف میں ہوا تھا، مگر ''غایۃ المقصود'' کی تکمیل سے قبل یہ تعلیقات مکمل ہوگئیں، جیسا کہ حسبِ ذیل دو عبارتوں سے عیاں ہوتا ہے۔

① کتاب الحیض میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی روایت کے تحت لکھتے ہیں: ''وقد ذكرت في شرح أبي داود أزيد من هذا'' (التعليق المغني: ١/٦٠٢) اور کتاب النکاح میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت لکھتے ہیں: ''وللشيخ العلامة الشوكاني فيه مسلك آخر إن ساعدني الله التوفيق فأبين إن شاء الله تعالىٰ في غاية المقصود شرح سنن أبي داود كلاماً جامعاً في هذا الباب'' (٣/٣١٤) جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''التعلیق المغنی'' کا آغاز تو غایۃ المقصود کے بعد ہوا، مگر اس کی تکمیل غایۃ المقصود سے پہلے ہوئی اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ''غایۃ المقصود'' غالباً کتاب الجنائز تک مکمل ہو چکی تھی اور یہ مسئلہ کتاب النکاح سے متعلق ہے جو سنن ابی داود کتاب الجنائز سے پہلے ہے۔ اسی طرح کتاب الاقضیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''أفصل المسألة إن شاء الله تعالىٰ في شرح أبي داود وفقنا الله تعالىٰ لإتمامه'' (التعليق المغني: ٤/٢١٥) جس سے ہمارے سابقہ دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ أعلم

④ إعلام أهل العصر في أحكام ركعتي الفجر:

حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ نے یہ کتاب ۱۳۰۵ھ سے پہلے تحریر فرمائی، جیسا کہ کتاب کے آخر میں حضرت مولانا محمد عبدالرحمان صاحب بقا غازی پوری کے مدحیہ

قصیدہ سے واضح ہوتا ہے۔ محدث ڈیانوی ''التعلیق المغنی'' میں ''باب الصلاۃ بعد الفجر إلا سجدتین'' کے تحت فرماتے ہیں:

''قد روي هذا الحديث من طرق أخرىٰ ذكرنا كلها في كتابي إعلام أهل العصر في أحكام ركعتي الفجر، فللّٰه حمده''[1]

''یہ حدیث اور طرق سے بھی مروی ہے، جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''إعلام أهل العصر في أحكام ركعتي الفجر'' میں کیا ہے۔''

لیکن اس سے یہ نتیجہ صحیح نہ ہوگا کہ ''إعلام أهل العصر''، ''التعلیق المغنی'' سے پہلے لکھی گئی تھی جب کہ ایک جگہ ''اعلام'' میں لکھتے ہیں:

''قد بسطت ترجمته في التعليق المغني''[2]

میں نے امام دارقطنی کا مفصل ترجمہ ''التعلیق المغنی'' میں ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلام کے کچھ حصص ''التعلیق المغنی'' سے پہلے لکھے گئے اور کچھ اجزا اس کے بعد اور مناسب موقع پر ایک کا حوالہ دوسری کتاب میں ذکر کر دیا گیا۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کتاب کا سببِ تالیف ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑی مدت سے یہ بات کھٹکتی تھی کہ صبح کی سنتوں کے متعلق ایک مکمل و مدلل رسالہ لکھوں جس میں دو مسئلوں کی وضاحت ہو: ① تکبیر کے وقت سنتوں کا ادا کرنا۔ ② فرض نماز کے بعد اور طلوعِ شمس سے پہلے سنتوں کا ادا کرنا۔ چنانچہ ۱۲۹۳ھ میں اس مسئلے پر چند اوراق تحریر بھی کیے، مگر

---

[1] ''تعليق المغني'' (۱/۴۱۹)

[2] إعلام (ص: ۲۲۶) طبع ثاني (ص: ٦٠) طبع أول

دوسرے مسئلے کے متعلق مجھے تردد تھا، کیوں کہ اس کے جواب پر مجھے حضرت قیس رضی اللہ عنہ بن عمرو کی حدیث کے سوا اور کوئی روایت نہیں ملی تھی اور بر بنا قولِ امام ترمذی رحمہ اللہ وہ تھی بھی منقطع، لیکن میں چونکہ اس کے جواز کا قائل تھا، لہٰذا اس معاملے میں بڑا حیران تھا تو یہ دیکھ کر میں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور اس کے عدمِ جواز کا یقین ہو گیا، لیکن جب میں اپنے بھائی محمد اشرف رحمہ اللہ صاحب کے ساتھ حصولِ علم کے لیے علامۂ زماں مولانا بشیر الدین قنوجی رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچا تو ان سے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی حدیث ایسے طریق سے بھی مروی ہے جو متصل ہے۔ پھر جب میں وطن واپس لوٹا تو کافی دنوں کے بعد دوبارہ پہلے مسودے کی تکمیل کا خیال گزرا، مگر پہلا مسودہ گم ہو گیا تھا۔ اب جب کہ اللہ جل شانہ نے توفیق عطا فرمائی تو یہ بے نظیر کتاب تیار ہو گئی۔ جس میں مَیں نے مذکورۃ الصدر دونوں مسئلوں پر خوب سیر حاصل بحث کی اور تتبع بسیار سے میرا پہلا شک و ریب جاتا رہا اور اب میں یہی کہتا ہوں کہ جماعت کے بعد صبح کی سنتیں پڑھنا بلاکراہت جائز ہیں اور جو اسے صحیح نہیں سمجھتا وہ بہت بڑے خبط میں مبتلا ہے۔ نیز ان دونوں مسئلوں کے علاوہ آٹھ اہم مسائل کو بھی ذکر کر دیا ہے۔ جن کا اس مسئلے سے گہرا تعلق ہے۔''[1]

محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کا یہ مکمل بیان اور خصوصاً خط کشیدہ الفاظ اس بات کے غماض ہیں کہ حضرت موصوف مسائل میں گروہی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر غور و فکر

---

[1] ''إعلام'' (ص: ۱۔۳)

کرتے اور جسے حق سمجھتے اس کا برملا اظہار فرماتے اور یہی اندازِ فکر ان کی تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔

مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے کتاب کو دس فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل پر محدثانہ، فقیہانہ، محققانہ بحث کی ہے۔ اسانید کی تحویل و تعلیل دیکھ کر ... معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کا محدث اسانید پر گفتگو کر رہا ہے۔ ان دس فصلوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

① الفصل الأول: صبح کی سنتوں کی محافظت و نگہداشت اور اس کی فضیلت کے بارے میں۔

② الفصل الثاني: سنتوں کی ادائیگی کے وقت دونوں رکعتوں میں قراءت کے بیان میں کہ قراءت لمبی ہونی چاہیے یا کم، نیز بآواز بلند پڑھا جائے یا آہستہ۔

③ الفصل الثالث: دو رکعتوں کے بعد ''اضطجاع'' دائیں پہلو پر لیٹنے کے بیان میں۔

④ الفصل الرابع: دو رکعتوں کے بعد کلام کے جواز کی دلیل اور مانعین کے دلائل کا جواب۔

⑤ الفصل الخامس: دو رکعتوں کے بعد ماثورہ دعاؤں کی تفصیل۔

⑥ الفصل السادس: طلوعِ فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنے کی کراہت کا بیان۔

⑦ الفصل السابع: تکبیر کے بعد سنتیں پڑھنے کی کراہت کا بیان۔

⑧ الفصل الثامن: ان اوقات کا بیان جن میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

⑨ الفصل التاسع: جس نے صبح کی سنتیں فرض نماز سے پہلے نہیں پڑھیں، کیا وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے سنتیں پڑھ سکتا ہے؟

⑩ **الفصل العاشر:** سنن ونوافل کی قضا کے بیان میں، نیز صبح کی سنتوں ، سورج نکلنے کے بعد قضا کے بیان میں۔

اندازِ بیان یہ ہے: پہلے بالاسناد حدیث ذکر کرتے ہیں، پھر فنی ا ر اصولی نقطۂ نظر سے اس پر نقد وتبصرہ فرماتے ہیں۔ کتبِ احادیث کی اسانید ومتوا میں اگر تصحیف وتحریف واقع ہوئی ہو تو اس پر متنبہ فرماتے ہیں اور اگر مسئلے میں ، فقہا کا اختلاف ہے تو فریقین کے ادلہ ذکر کرتے ہوئے اپنا ترجیحی فیصلہ دیتے ہیں اور وجوہِ ترجیح کو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں، بلکہ بعض مقامات تو ایسے ہیں جو اجتہادی شان لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ جب صبح کی سنتیں نمازِ فرض سے پہلے نہ پڑھی جا سکیں تو کیا انھیں طلوعِ شمس کے بعد پڑھنا اولیٰ ہے یا فرضِ نماز کے بعد ع شمس سے پہلے پڑھنا اولیٰ ہے تو اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"الأولیٰ لمن لم یصل قبله أن یصلیهما بعد الفرض ق ل الطلوع لأن فعلهما قبل الطلوع یکون في وقت الأ ، وأما بعد الطلوع فیکون في وقت القضاء الخ"[1]

"اولیٰ یہ ہے کہ فرضِ نماز کے بعد طلوعِ شمس سے پہلے پڑھنا اولیٰ و ف ہے، کیوں کہ طلوعِ شمس سے پہلے ان کی ادائیگی وقتِ ادا میں ہوگی ور سورج نکلنے کے بعد ان کی ادائیگی وقتِ قضا میں ہوگی۔ کیوں کہ سنن کے اوقات نمازِ فرض کے آخری وقت تک ممتد ہوتے ہیں۔"

یہ بات بدیہی ہے کہ طلوعِ شمس کے بعد فرض بھی قضا ہیں۔ اس لیے اگر سنتوں کی ادائیگی وقتِ ادا میں ہو تو اولیٰ ہے۔

---

[1] إعلام (ص: ۲۳۷، ۲۳۸)

ساری کتاب اسی طرح کے مختلف علمی اور فنی مباحث سے بھری ہوئی ہے اور آخر میں محل مسئلے کے متعلق فیصلہ یہ دیتے ہیں۔

"فرض نماز کے بعد طلوعِ شمس سے پہلے سنتوں کی ادائیگی ضروری ہے، کیونکہ اس کی تاکید میں آیا ہے کہ صبح کی سنتیں دنیا ومافیہا سے بہتر ہیں اور جو کوئی سنتیں نہیں پڑھتا تا آنکہ سورج نکل آیا تو اسے چاہیے کہ طلوعِ شمس کے بعد بھی سنتوں کی قضا دے اور جن حضرات نے کہا ہے کہ سنن کی قضا نہیں ان کا قول ضعیف اور مرجوح ہے جس پر کوئی دلیل و برہان نہیں۔"[1]

اس کتاب کی قدر و منزلت کے لیے یہی کافی ہے کہ اس پر ان کے شیخ حضرت میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے تقریظ لکھی اور اس کی تحسین کی اور ان کے علاوہ مولانا محمد عبدالرحمان صاحب غازی پوری رحمہ اللہ نے اس پر ایک طویل مدحیہ قصیدہ لکھا جو کتاب کے آخر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۰۶ھ میں مطبع انصاری دہلی سے بڑے سائز کے ۶۸ صفحات میں شائع ہوئی۔ جس کے ساتھ امام بخاری رحمہ اللہ کی "خلق افعال العباد" اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی "کتاب العلو" بھی مطبوع ہے اور اس کے بعد "ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد" سے اس ناکارہ ہی کی تحقیق و تعلیق سے ۲۰۰۔۱۹ء میں دوسری بار ۲۸۶ صفحات میں شائع ہوئی۔ مولانا محمد عزیر شمس صاحب نے لکھا ہے کہ اس کا خطی نسخہ خود حضرت مؤلف کے خط سے خدا بخش پٹنہ لائبریری میں محفوظ ہے جو کہ ۱۸۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ "حیاۃ المحدث" (ص: ۴۳) یہاں یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ رضا کحالہ نے "معجم المؤلفین" (۹/۶۸) میں محدث ڈیانوی کی اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور آپ کو حنفی المسلک قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

[1] إعلام (ص: ۱۵۳)

"محمد بن أمير علی بن حيدر الصديقي العظيم آبادي الشهير بشمس الحق الهندي الحنفي أبو الطيب فقيه، من آثاره: إعلام أهل العصر في أحكام ركعتي الفجر، فرغ منه سنة ۱۲۹۳ھ"

حالانکہ کتاب میں جس مسئلے پر بحث ہے وہی اس کی تردید کے لیے کافی ہے کہ آپ حنفی المسلک نہیں، بلکہ مسلکِ محدثین کے امین تھے اور اس مسئلے میں حضرات علمائے احناف نے جس طرح کج روی کا مظاہرہ فرمایا ہے جا بجا اس کی نشاندہی کی ہے، بلکہ ایک جگہ انھوں نے اپنے دور کا ایک عجیب واقعہ بھی لکھا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

''مولانا احمد علی رحمہ اللہ سہارنپوری نے صحیح بخاری کے حاشیہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: « إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة » کے تحت لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ محدث دہلوی سے سنا کہ بیہقی میں اس حدیث کے آخر میں "إلا ركعتي الفجر" کے الفاظ بھی ہیں جس پر ہمارے شیخ مولانا نذیر حسین رحمہ اللہ محدث دہلوی نے انھیں ۱۲۹۳ھ میں ایک خط لکھا کہ جناب نے حاشیہ بخاری میں جو یہ لکھا ہے کہ بیہقی کی روایت میں یہ حدیث « إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة إلا ركعتي الفجر » کے الفاظ سے ہے اور عموماً طالبِ علم آپ پر اعتماد کرتے ہوئے صبح کی سنتیں عین جماعت کی حالت میں ادا کرتے اور جماعت کے فوت ہو جانے کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ یہ جملہ استثنائیہ بے اصل

ہے اور محققین کے نزدیک مردود و مطرود ہے بالخصوص خود امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کے بے اصل ہونے کی صراحت کی ہے اور شیخ سلام اللہ حنفی نے ''المحلی شرح الموطأ'' میں اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں امام بیہقی رحمہ اللہ سے اس کا بے اصل ہونا نقل کیا ہے، بلکہ شیخ نور الدین وغیرہ نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا آپ کو اس جملہ کے بارے میں محققین کی رائے کا اظہار کرنا چاہیے اور طلبا کو بتلا دینا چاہیے کہ یہ جملہ بے اصل ہے اور اس کے مطابق عمل جائز نہیں۔ امید ہے آپ اس کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔ (محدث ڈیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:) مگر مولانا سہارنپوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ یہ خط اپنے معاون مولانا عالم علی مراد آبادی کے پاس بھیج دیا، تاکہ اس کے جواب میں وہ ان کی اعانت کریں میں اس سال مراد آباد حضرت مولانا بشیر الدین قنوجی کی خدمت میں تھا۔ ہمیں اس مکتوب کا پتا چلا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی حضرت میاں صاحب کا مکتوب آیا ہے، مگر وہ بھی اس کا جواب نہ دے سکے۔''[1]

یہاں یہ بات فائدے سے خالی نہیں کہ ''إعلام أهل العصر'' پر علامہ نیموی رحمہ اللہ وغیرہ علمائے احناف نے جو بعض مقامات پر نقد کیا ہے۔ طبع ثانی کے حاشیہ میں بفضل اللہ تعالیٰ وعونہ اس کا جواب دیا گیا ہے، البتہ گزشتہ سال جب سندھ حضرت مولانا سید محب اللہ راشدی کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے نامی کتب خانہ میں ''أوہام عن رسالته الأعلام'' نامی ایک رسالہ نظر سے گزرا جو اردو میں ۳۲

[1] اعلام (ص: ۱۳۵، ۱۳۶) ملخصاً.

صفحات پر مشتمل ہے اور جس کے مؤلف ہیں مولانا سید ولایت حسین صاحب یادی
اور مطبوعہ ہے اشاعت محلّہ مفتی سہارنپورہ کا۔ جس میں عموماً امام بیہقی رحمہ اللہ پر
علمائے احناف کے روایتی غیظ وغضب کا اظہار ہے جس کا جائزہ یہاں بے محل ہوگا۔
اس رسالے سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اپنے حلقے کے ناخواندہ حضرات کو باور کرایا گیا
کہ ہم نے ''إعلام أهل العصر'' کا جواب دے دیا ہے، لیکن اہلِ علم کے ہاں
اس کو پزیرائی نصیب نہ ہوئی۔

⑤ القول المحقق في تحقيق إخصاء البهائم:

فارسی میں یہ رسالہ ایک سوال کا جواب ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا
جاتا ہے، انھیں خصی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جس کا جواب محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے
بڑے محققانہ انداز میں دیا، بلکہ متقدمین اہلِ علم نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ان کی
آرا کا خلاصہ بھی اس رسالے میں ذکر کر دیا گیا ہے اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی
جا سکتی ہے کہ اس سے جامع بحث کسی اور جگہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ مولانا کے
جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ سلف سے اس مسئلے پر اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ایک جماعت
اسے جائز سمجھتی ہے اور دوسری ناجائز۔

اولاً: انھوں نے مانعین کے دلائل کو ذکر کرتے ہوئے ان پر نقد کیا ہے، پھر قائلینِ جواز
کے ادلہ کو بیان کیا ہے اور اسی کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ آخر میں فرماتے ہیں:

''پس حاصل کلام در بارہ خصی بہائم ایں است کہ غیر ماکول اللحم را اصلاً
جائز نیست و ماکول اللحم را خصی نہ کردن اولیٰ و عزیمت و خصی کردن جائز
و رخصت است۔''

''جانوروں کو خصی کرنے کے متعلق خلاصۂ کلام یہ ہے کہ غیر ماکول اللحم کو

خصی کرنا بالکل ناجائز ہے اور ماکول اللحم جانور کو خصی نہ کرنا اولیٰ ہے اور عزیمت یہی ہے، البتہ خصی کرنا جائز ہے۔''

یہ رسالہ ۱۳۰۶ھ میں مطبع انصاری دہلی سے مجموعہ ''إعلام أهل العصر'' کے ساتھ مطبوع ہے اور پانچ بڑے صفحات پر مشتمل ہے۔

⑥ لمکتوب اللطیف إلی المحدث الشریف:

معلوم یوں ہوتا ہے کہ شیخ الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ جب ۱۳۰۰ھ میں حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو موسمِ حج پر اطراف و اکناف سے آنے والے اصحابِ علم و فضل نے جب آپ سے استفادہ کیا اور خصوصاً حاکمِ وقت نے (سید عثمان نوری کے دربار میں حضرت میاں صاحب پر عائد کردہ الزامات کا مسکت و مدلل جواب پا کر) جو حفاظت نامہ انھیں حاکمِ مدینہ کے نام لکھ دیا تھا، اس سے دوسرے علما عموماً اور اہلِ حجاز خصوصاً بے حد متاثر ہوئے۔ جس سے ان کی عزت و شرف کا دوبالا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ غالباً یہ وجہ تھی کہ ان کے شاگردِ رشید حضرت علامہ شمس الحق محدث ڈیانوی رحمہ اللہ جب ۱۳۱۲ھ میں حجِ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو علمائے اہلِ حجاز نے انھیں مجبور کیا کہ وہ حضرت شیخ الکل سے اجازہ لے دیں، تاکہ انھیں بھی اس سلسلۃ الذہب کی کڑی ہونے کا شرف حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے ہندی محدث لکھتے ہیں:

''إن كثيرا من العلماء العاملين لما تشرفنا بزيارتهم غير مرة في موسم الحج وجدتهم حراصاً و راغبين إلى إسنادكم، ويحبون أن يدخلوا في سلسلتكم، ومن الفضلاء أكدوا علي بأن أطلب لهم منكم رقعة الإجازة،

بل أمر أكثر منهم من كان هو أفضل مني وأكمل وأعلم لأخذ الإجازة مني"[1]

"المكتوب اللطيف" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے حجاز اگرچہ حضرت میاں صاحب دہلوی کی قدر و منزلت کا اعتراف کر چکے تھے، مگر مخالفین کے غلط پروپیگنڈہ سے قدرے متاثر تھے۔ انھی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ میاں صاحب کو صرف حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ سے تلمذ ہے اور ان کا سلسلۂ سند صرف اسی واسطہ پر محصور ہے اور اسی بات کا ذکر انھوں نے حضرت محدث ڈیانوی کے پاس کیا تو انھوں نے وضاحت کی حضرت شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے علاوہ مختلف شیوخِ وقت سے بھی انھیں شرفِ تلمذ ہے جب کہ حضرت میاں صاحب کو ان شیوخِ وقت سے معاصرت کا بھی شرف ہے، جنھوں نے اپنی مرویات کی عام اجازت دی تھی اور وہ یہ ہیں:

(۱) علامہ عبدالرحمان بن سلیمان مؤلف "النفس اليماني والروح الريحاني"

(۲) مسند دمشق علامہ عبدالرحمان الشامی۔

(۳) الشیخ محمد عابد السندھی ثم المدنی۔

(۴) الشیخ عبداللطیف البیروتی الشامی اور حضرت میاں صاحب بوجۂ معاصرت ان شیوخ کے اجازۂ عام میں شامل ہیں۔ علمائے حجاز نے جب یہ بات سنی تو خاموش ہو گئے اور حضرت میاں صاحب سے اجازہ کی تمنا کی۔

اس تفصیل کے بعد محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے اس اجازۂ عامہ جو کہ حدیث کے اخذ و ادا کا ایک طریقہ ہے، پر فنی نقطۂ نظر سے بحث کی اور یہ کہنا بجا ہے: "الإجازة العامة" کے جواز پر یہ مکتوب اصولِ حدیث کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس میں انھوں

[1] المکتوب (ص: ۱۵)

نے نہ صرف اصولِ حدیث کی کتابوں سے اس کے جواز پر حوالے ذکر کیے ہیں، بلکہ اکابر علما و اعیان کے اقوال جن میں "اجازۃ عامہ" کا ثبوت ہے نقل کر دیے ہیں، پھر آخر میں حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ سے تین سوال کیے ہیں:

① کیا آپ اجازہ عام کے قائل ہیں؟

② اگر قائل ہیں تو کیا آپ اپنی جمیع مرویات کی اجازتِ عام بخشیں گے؟

③ اگر قائل ہیں تو اپنے ہم عصر علما پر احسان فرمائیں اور اجازہ عام مرحمت فرمائیں، جس طرح کہ آپ کو آپ کے معاصر شیوخ سے اجازہ حاصل ہے۔

یہ مکتوب مبارک ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے، جو کہ پانچ دیگر رسائل کے ساتھ ۱۳۰۴ھ میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوا اور علامہ قاضی ابو اسماعیل یوسف حسین الخانپوری نے تاریخ طباعت فارسی میں لکھی جو کہ اس مجموعہ رسائل کے آخر (ص: ۱۹) میں مطبوع ہے اس مکتوب کا جواب حضرت میاں صاحب نے ۱۳۱۳ھ میں دیا اور علما نے معاصرین کو عموماً اور حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ اور شیخ نور احمد ڈیانوی کو خصوصاً اپنی مرویات کی عام اجازت دی یہ جواب بھی "المکتوب اللطیف" کے ساتھ ہی مطبوع ہے۔ حیاۃ المحدث کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ مکتوب حضرت ڈیانوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا خدا بخش پٹنہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ علامہ عبدالحی الکتانی رحمہ اللہ نے بھی فہرس الفہارس والاثبات (۵۹۲/۲، ۵۹۳) میں اس مکتوب کا تعارف کروایا ہے۔

⑩ الكلام المبين في الجهر بالتأمين:

یہ رسالہ آمین بالجہر کے مسئلے پر ہے، مولانا ڈیانوی نے "التعليق المغني" (۳۳۸/۱) میں خود اس کا ذکر کیا ہے۔ جو دراصل مولوی محمد علی مرزا پوری کے رسالے "القول المتين في إخفاء التامين" کا جواب ہے۔ یہ رسالہ ۴۴ صفحات پر

مشتمل ہے، جس میں مرزا پوری صاحب کے اعتراض کو "قوله" سے نقل کر کے "أقول" سے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوا تھا۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کے علاوہ مولانا محمد سعید بنارسی رحمہ اللہ اور مولانا ابو المکارم محمد علی المتوفی نے بھی "القول المتین" کا جواب لکھا ہے۔

اس موضوع پر ہمارے ہندی علما نے خاصی طبع آزمائی کی ہے اور اس مسئلے میں فریقین نے ایک دوسرے کی تردید میں رسالے لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں علمائے احناف کی وکالت علامہ نیموی رحمہ اللہ نے بڑے شد و مد سے کی ہے، حالانکہ ان کے استاذ محترم مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اعتراف کیا ہے کہ "الإنصاف أن الجهر قوي من حيث الدليل" "انصاف کی بات یہ ہے کہ اونچی آواز میں آمین کہنا دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔" "التعلیق الممجد" (ص: ۱۰۳)

نیموی صاحب نے اس کے کفارے کی لاکھ کوشش کی، لیکن افسوس وہ ناکام رہی۔ چنانچہ جب انھوں نے "حبل المتین" کے نام سے ایک رسالہ لکھا، جس کا جواب مولانا محمد سعید بنارسی مرحوم نے "السکین لقطع حبل المتین" کے نام سے دیا جو ۱۳۱۹ھ میں ۱۴۰ صفحات میں مطبع سعید البنارس سے شائع ہوا۔ جس پر محدث ڈیانوی نے تقریظ لکھی۔ اس کے جواب میں نیموی صاحب رحمہ اللہ نے کوشش کی اور "رد السکین" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۲ ۱۴ھ میں لکھنؤ سے طبع ہوا تھا۔ جس کا جواب مولانا بنارسی رحمہ اللہ نے "سیف الموحدین" کے نام سے لکھا۔ اس کا جواب مولانا محمد قاسم ابو البقا عظیم آبادی نے "تردید سیف" کے نام سے دیا۔ جس کا جواب الجواب پھر بنارسی صاحب نے "التردید" کے نام سے دیا۔ علامہ نیموی رحمہ اللہ نے پھر اس کا جواب "رد الرد" کے نام سے لکھا

تو اس کا جواب پھر مولانا بنارسی رحمہ اللہ نے "الرد لرد الرد" کے نام سے جو ۱۳۱۵ھ میں چھ صفحات پر مشتمل مطبع گردید سے طبع ہوا۔ اس موضوع پر دیگر اہلِ علم نے بھی رسائل لکھے ہیں، مگر استیعاب مقصود نہیں۔

⑧ التحقیقات العلیٰ بإثبات فرضیة الجمعة في القریٰ:

بستیوں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر بھی ہمارے ہندی علما نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور فریقین نے ایک دوسرے کی تردید میں رسائل لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مولانا رشید احمد گنگوہی نے ایک رسالہ بنام "أوثق العریٰ في تحقیق جمعة في القریٰ" لکھا۔ جس میں بستیوں میں جمعہ کے عدمِ وجوب کو مدلل کرنے کی کوشش کی۔ علمائے اہلِ حدیث کی طرف سے اس کے تین جواب شائع ہوئے:

① "التجمیع في القریٰ بنقض ما في اوثق العریٰ" مؤلفہ مولانا مولا بخش صاحب بڑاگری۔

② "کسر العریٰ بإقامة الجمعة في القریٰ" مؤلفہ مولانا محمد سعید بنارسی۔

③ "هدایة الوریٰ إلیٰ إقامة الجمعة في القریٰ" مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب اعظم گڑھی۔

مؤخر الذکر دونوں رسالے طبع ہوئے تو شیخ الہند مولانا محمود حسن صدر مدرس دار العلوم دیوبند نے ان کا جواب "أحسن القریٰ في توضیح أوثق العریٰ" کے نام سے ان کا جواب دیا جو ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا جواب الجواب مولانا عبدالرحمان بقا غازی پوری مرحوم نے "سرمن یریٰ في بحث الجمعة في القریٰ" کے نام سے دو حصوں میں دیا جو ۱۳۲۷ھ میں مطبع سعید المطابع سے شائع

ہوا۔ علمائے احناف کی طرف سے اس مسئلے کی تائید میں مولانا نیموی مرحوم نے بھی طبع آزمائی کی تو "جامع الآثار" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کے دو جواب علمائے اہلِ حدیث کی طرف سے شائع ہوئے۔

① "المذهب المختار" مؤلفہ مولانا ابو المکارم مرحوم، جو محدث ڈیانوی کی اعانت سے ۱۳۱۸ھ میں سعید المطابع بنارس سے طبع ہوا اور اس پر محدث ڈیانوی نے تقریظ بھی لکھی۔

② "نور الأبصار" مؤلفہ مولانا عبدالرحمان محدث مبارکپوری جو ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۱۹ھ میں مطبع سعید البنارس سے مطبوع ہے۔ مؤخر الذکر کا جواب جب علامہ نیموی رحمہ اللہ نے "تبصرة الأنظار" کے نام سے لکھا تو اس کا جواب الجواب محدث مبارکپوری نے "ضياء الأبصار" کے نام سے دیا۔ اس موضوع پر مولوی احمد علی رحمہ اللہ پروفیسر صاحب نے ایک رسالہ "نور اللمعة في ظهر الجمعة" کے نام سے لکھا تو اس کا جواب حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی نے "إطفاء الشمعة في ظهر الجمعة" کے نام سے تین حصوں میں دیا۔ ردود کا یہ سلسلہ بڑا وسیع ہے۔ ہم نے چند اہم کا ہی ذکر کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اسی موضوع پر ہمارے محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے دو رسالے لکھے ہیں، جن میں سے ایک کا نام "التحقيقات العلى" ہے جو دراصل تین سوالات کا جواب ہے:

① فرضیتِ جمعہ قصبات و دیہات میں ثابت ہے یا نہیں؟

② کتبِ حنفیہ میں صلاۃ جمعہ کی جو شروط و قیود لکھی ہیں وہ احادیث صحیحہ سے مستنبط ہیں یا نہیں؟

④ ظہر احتیاطی جائز ہے یا نہیں؟

اس رسالے میں ان سوالات کا نہایت شرح وبسط سے جواب دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ پہلی بار مطبع احمدیہ پٹنہ سے ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوا اور اسی سال مولانا نے یہ رسالہ لکھا تھا، جیسا کہ کتاب کے آخر میں انھوں نے خود وضاحت کی ہے۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس مسئلے کی گو اب چنداں ضرورت نہیں رہی جب کہ خود علمائے احناف بستیوں میں جمعہ کی نماز پڑھ پڑھا رہے ہیں، مگر نامعلوم بعض حضرات کو کیا سوجھی کہ انھوں نے "أوثق العرىٰ" اور "القول البديع" کو رسالے "گاؤں میں جمعہ کے احکام" کے عنوان سے پھر شائع کر دیے۔ بنابریں محسوس کیا گیا کہ اہلِ حدیث نقطۂ نظر کی بھی وضاحت ضروری ہے، چنانچہ استاذ العلماء حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب بھوجیانی شارح سنن نسائی کے مشورے سے ہماری جمعیت شبان اہلِ حدیث خالد آباد فیصل آباد نے یہی رسالہ "التحقيقات العلىٰ" اور اس کے ساتھ محدث مبارکپوری کا رسالہ "نور الأبصار" اور "التجميع في القرىٰ بنقض ما في أوثق العرىٰ" مؤلفہ مولانا بڑا گری صاحب شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ تینوں رسالے ۱۹۷۸ء میں طبع ہوئے جو کہ نعمانی کتب خانہ لاہور سے دستیاب ہیں۔

⑨ النور اللامع في أخبار صلاة الجمعة عن النبي الشافع:

اس کتاب کا ذکر خود مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے "التحقيقات العلىٰ" میں کیا ہے اور لکھا ہے: "وفقني الله تعالىٰ لإتمامه كما وفقني لابتدائه وما ذلك على الله بعزيز" (مجموعہ نور الھدیٰ ص: ۱۱۹) اس کے علاوہ "التعليق المغني" اور "عون المعبود" میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مولانا بنارسی نے اہلِ حدیث امرتسر میں اور

مولانا ندوی نے ”نزہۃ الخواطر“ (۱۸۰/۸) میں لکھا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی۔

⑩ غنية الألمعي:

یہ رسالہ تین سوالات کا جواب ہے:

① محدثین کی اصطلاح ”لا یصح ھذا الحدیث“ یا ”لا یثبت ھذا الحدیث“ میں کیا فرق ہے اور کیا یہ آپس میں مغایر ہیں یا ایک ہی معنیٰ میں مستعمل ہیں؟

② کیا سینے پر ہاتھ باندھنے کی حدیث صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ ”علیٰ صدرہ“ کے الفاظ سفیان رحمہ اللہ سے بجز مؤمل بن اسماعیل کے اور کسی نے بیان نہیں کیے؟

③ میت کی طرف سے قربانی جائز ہے اور کیا اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے؟

یہ رسالہ انہی مسائل کی تحقیق و تنقیح پر مشتمل ہے اور قابلِ دید ہے۔ سب سے پہلے یہ رسالہ مطبع انصاری دہلی سے ۱۳۱۱ھ میں المعجم الصغیر للطبرانی کے ساتھ طبع ہوا، جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد دوسری بار ۱۳۸۸ھ میں شیخ عبدالرحمان بن محمد کی تصحیح و مراجعت سے المکتبۃ السلفیہ مدینہ منورہ سے المعجم الصغیر للطبرانی کے ساتھ ہی طبع ہوا۔ حیاۃ المحدث کے مرتب حفظہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا یہ رسالہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں موجود ہے۔[1]

⑪ رسالہ در ردِ تعزیہ:

اس رسالے کا نام ”نزھۃ الخواطر“ (۱۸۰/۸) میں رسالہ ”في الرد علی الضرائح المتخذۃ من الخشب و الثیاب“ اور ”ثقافت اسلامیہ“ (ص: ۳۴۳) میں ”رسالہ في إبطال الضرائح“ ذکر کیا ہے اور ”اہل حدیث“

[1] حیاۃ المحدث (ص: ۱۹۵)

(امرتسر) میں مولانا بنارسی نے اس کا ذکر ''رسالہ در ردِ تعزیہ'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ رسالہ مطبع سعید المطابع بنارس سے ۲۰ بڑے صفحات میں شائع ہوا ہے، جس پر تاریخِ طبع موجود نہیں۔ جو دراصل ایک فتوے کا جواب ہے کہ کیا تعزیہ بنانا کبیرہ گناہ ہے یا نہیں؟ ایسا کام کرنے والے کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے اور اہلِ سنت میں جو حضرات اس فعلِ شنیع میں شریک ہوتے ہیں اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ جس کا جواب ہمارے ہندی محدث نے بیس صفحات میں دیا ہے۔ پہلے انھوں نے تعزیہ کے بنانے کی ترکیب لکھی ہے کہ کس طرح کن چیزوں سے بنایا جاتا ہے، پھر اس کے متعلق حکمِ شرعی ذکر کیا ہے کہ یہ شرک اور بدعت ہے اور اس پر دلائل لائے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ اہلِ سنت کو اصحابِ تعزیہ سے اجتناب لازم ہے، بلکہ ان پر انکار بھی ضروری ہے، ورنہ روزِ قیامت انھی اشرار لوگوں میں سے اٹھائے جائیں گے۔ اس رسالے پر متعدد علمائے کرام کے دستخط اور ان کے تائیدی بیان ہیں جن میں شیخ الکل حضرت میاں صاحب دہلوی، مولانا تلطف حسین صاحب، مولانا اشرف الحق ڈیانوی، مولانا نور محمد ڈیانوی، مولانا غلام رسول پنجابی، مولانا محمد حسین دہلوی، مولانا محمد سعید بنارسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[1]

(۱۲) فضل الباري شرح ثلاثيات البخاري:

اس کا ذکر مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے ''سیرۃ البخاری'' (ص: ۳۰۳) میں کیا ہے اور حاشیہ میں مولانا عبیداللہ رحمانی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکی۔ اس رسالے میں صحیح بخاری کی ان روایات کی شرح ہے، جنھیں امام بخاری نے تین واسطوں سے ذکر کیا ہے اور جو ''ثلاثیات البخاري'' کے نام سے مشہور ہیں، جن کی تعداد باعتبار مکررات کے ۲۲ اور حذفِ تکرار سے ۱۷ ہے۔ حیات المحدث کے فاضل

(1) ملخصاً من حیاۃ المحدث (ص: ۱۹۷، ۱۹۸)

مرتب نے لکھا ہے کہ افسوس ہمیں خدا بخش لائبریری میں اس کا سراغ نہ مل سکا۔

⑬ النجم الوهاج في شرح مقدمة الصحيح لمسلم بن الحجاج:

اس کتاب کا ذکر بھی مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے ''سیرۃ البخاری'' (ص: ۴۵) میں کیا ہے۔''حیاۃ المحدث'' کے مرتب مولانا محمد عزیر صاحب لکھتے ہیں کہ اس شرح کا ایک ناقص نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہماری نظر سے گزرا ہے جو بڑے سائز کے ۴۷ صفحات پر مشتمل ہیں اور ہر صفحے میں ۳۰ سطریں ہیں اور اس کے ہر ورق پر لکھا ہے کہ شاید اس کے مصنف محدث شمس الحق عظیم آبادی ہیں۔ مگر جب مبارک پور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جناب حکیم عبدالسمیع صاحب کے ہاں مقدمہ مسلم کی شرح کا ایک نسخہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ہاتھ سے لکھا ہوا ملا اور میں نے جب دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں کوئی اختلاف نہ پایا، جس سے اسی نتیجے پر پہنچا کہ ایک نسخہ دوسرے سے منقولہ ہے اور یہ دراصل مولانا غازی پوری ہی کا مصنفہ ہے۔ مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے استفادہ کی خاطر مولانا غازی پوری کی اس کتاب کو نقل کر آیا ہوگا، تاکہ مقدمہ مسلم کی شرح میں وہ بھی پیشِ نظر رہے اور یہ بات مسلمہ ہے۔ غازی پوری مرحوم نے ''البحر المواج'' کے نام سے مقدمہ مسلم کی شرح لکھی تھی۔ بنابریں خدا بخش لائبریری کے نسخہ کو مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے ذکر کیا ہے کہ ''النجم الوهاج'' مکمل شرح تھی، مگر ''وا اسفا'' کہ اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔[1] ''النجم الوہاج'' کا ذکر خود محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے ''الوجازة في الإجازة'' میں کیا ہے اور ''الوجازة'' کے فاضل محقق نے بھی لکھا ہے کہ ہم اس پر مطلع نہیں ہو سکے۔

[1] حياة المحدث (۲۰۷۔۲۱۰)

⑭ نخبة التواريخ:

محدث ڈیانوی نے سیر و تراجم پر بھی فارسی اور عربی میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہی "نخبة التواریخ" فارسی میں، جس کا ذکر مولانا فضل حسین مظفر پوری نے ''الحیاۃ بعد المماۃ'' میں کیا ہے اور اس کی ایک طویل عبارت بھی نقل کی ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالسمیع مبارکپوری نے بھی مقدمہ تحفۃ الاحوذی کے آخر میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری اور حضرت میاں صاحب کے تراجم میں اس سے استفادہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی زیرِ نظر رہی ہے، مگر حیات المحدث کے مرتب لکھتے ہیں کہ افسوس ہماری نظر آج تک اس کو دیکھنے کے لیے ترستی ہے۔

⑮ نهاية الرسوخ في معجم الشيوخ:

خود محدث ڈیانوی نے اس کا ذکر ''عون المعبود'' کے مقدمہ (۱/۳،۴) میں کیا ہے، جس میں انھوں نے اپنے شیوخ اور اپنی سند کے مشائخ کے حالات کو قلم بند کیا ہے، اس کے حوالے سے مقدمہ عون المعبود میں گیارہ شیوخ کا مختصر تذکرہ ہے۔ یہ کتاب بھی غیر مطبوع ہے، بلکہ اس کا کہیں بھی ذکر نہ پایا۔

⑯ الوجازة في الإجازة:

اس رسالے کا ذکر ''حیاۃ المحدث'' کے علاوہ اور کسی ترجمہ نویس نے نہیں کیا۔ مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے کہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں اس کے دو خطی نسخے ہیں۔ دیکھیے ایک تو خود محدث ڈیانوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو کہ بڑے سائز کے ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے میں ۱۸ سے ۲۰ سطریں ہیں۔ مؤلف کے قلم سے اس کے حاشیہ میں جابجا زیادات ہیں اور سن کتابت جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ ہے اور دوسرا

نسخہ اس سے منقولہ ہے۔ نسخہ اولیٰ میں جو حواشی ہیں وہ متنِ کتاب میں داخل کر دیے گئے ہیں اور دوسرا نسخہ ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالے میں مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے اپنے شیوخ کی اسانید کو ذکر کیا ہے اور جب کوئی طالب علم آپ سے اجازہ طلب کرتا تو آپ انھیں یہ رسالہ بھیج دیتے۔[1] دراصل یہ اجازہ علامہ الشیخ الفاضل الکامل عبدالحفیظ بن شیخ محمد الطاہر الفہری الناسی کی طلب پر لکھا گیا تھا، جس میں انھوں نے اپنے شیوخ کی اسانید، معروف کتبِ احادیث کی اسانید اور معروف کتب الاثبات کی اسانید کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ شیخ بدرالزماں نیپالی حفظہ اللہ کی تحقیق سے، "مؤسسة المجمع العلمي" (کراچی، پاکستان) سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہو گیا ہے۔

⑰ هداية النجدين إلى حكم المعانقة و المصافحة بعد العيدين:

یہ رسالہ چھوٹے سائز کے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے جو کہ مطبع احسن المطابع پٹنہ سے شیخ ولی اللہ خاں کی عنایت سے طبع ہوا ہے۔ اصل رسالہ اردو میں ہے۔ عموماً تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ موضوع نام سے ظاہر ہے کہ اس میں عیدین کے بعد معانقہ و مصافحہ کے جواز و عدمِ جواز پر بحث ہے، جو دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ مولانا محمد عزیر صاحب نے اس کی تعریب کر دی ہے، جو کہ "حیاۃ المحدث" (ص: ۲۲۰۔۲۲۷) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ بدعت ہے۔

⑱ هدية اللوذي بنكات الترمذي:

مولانا بنارسی اور مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ایک ناقص خطی نسخہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں موجود ہے۔ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے "مقدمه غاية المقصود" کی طرح یہ کتاب بھی سنن ترمذی کے

[1] حياة المحدث (ص: ۲۱۷۔۲۱۹)

لیے بطور ''مقدمہ'' تحریر کی تھی، جسے انھوں نے حسبِ ذیل سات فصلوں میں تقسیم کیا ہے:

① ترجمة الإمام الترمذي.

② في أحوال كتابه الجامع.

③ في فوائد شتى.

④ تراجم شيوخ الترمذي.

⑤ ذكر شراح الترمذي.

⑥ ترجمة شيوخي (أي المؤلف) الذين أخذت عنهم هذا الكتاب.

⑦ إسناد الكتاب مني (أي المحدث الديانوي) إلى المؤلف الترمذي)

مولانا محمد عزیر صاحب حفظہ اللہ نے لکھا ہے کہ معلوم نہیں مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ اس کی تکمیل بھی کر پائے تھے یا نہیں، اس کا جو خطی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے وہ صرف بڑے سائز کے ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں، جس میں پہلی تین فصلیں کامل ہیں اور چوتھی فصل ناقص ہے۔ محدث ڈیانوی کے رفیق حضرت مولانا عبدالرحمان شارح جامع ترمذی نے ''مقدمه تحفة الأحوذي'' کا آغاز کیا، جس کی تکمیل مولانا عبدالصمد صاحب مبارکپوری نے کی۔ یہ کتاب مطبوع ہے اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی موجودگی میں ''هدية اللوذعي'' کا احتیاج باقی نہیں رہتا۔

⑲ غاية البيان في حكم استعمال العنبر والزعفران:

اس رسالے کا ذکر خود محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے ''عون المعبود'' (۳/ ۷۷) میں کیا ہے اور لکھا ہے:

''وإن شاء ربي سأفصل الكلام على الوجه التمام في هذه

المسئلة في رسالة مستقلة أسميها بغاية البيان في حكم استعمال العنبر والزعفران"

"اگر میرے رب نے چاہا تو اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ میں بحث کروں گا، جس کا نام "غایۃ البیان" رکھوں گا۔"

لیکن نامعلوم حضرت ڈیانوی اس عزم کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں۔

⑳ عقود الجمان في جواز تعليم الكتابة للنسوان:

یہ رسالہ بھی ایک استفسار کا جواب ہے۔ سوال یہ تھا کہ کیا عورتوں کو لکھنے کی تعلیم دینا جائز ہے یا نہیں؟ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ اس کے جواز کے قائل تھے، پہلے انھوں نے مانعین کے دلائل کا تجزیہ کیا اور پھر اس کے جواز کے دلائل دیے ہیں اور ان محدثات کا بھی ذکر کیا ہے، جو کہ اپنے وقت کی محدثہ تھیں اور کتابت جانتی تھیں اور آخر میں لکھا ہے کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا جائز ہے اور فساد کے ڈر سے جو عدمِ جواز کے قائل ہیں تو یہ فساد دراصل جہالت اور سوءِ تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی اہمیت و جامعیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف مرحوم نے اسے ۳۴ مختلف کتب سے مرتب کیا ہے، جن میں اکثر مطبوع اور بعض مخطوط ہیں۔ مولانا نے یہ رسالہ ۱۳۰۷ھ میں رقم فرمایا تھا۔ جسے مولانا تلطف حسین عظیم آبادی نے مطبع فاروقی دہلی سے ۱۳۱۱ھ میں طبع کرایا جو چھوٹے سائز کے پانچ صفحات پر مشتمل ہے اور سبل السلام مطبوعہ فاروقی دہلی کے ساتھ ملحق ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت حضرت مولانا عبدالتواب صاحب رحمہ اللہ ملتانی کا مملوکہ نسخہ ہے جو ان دنوں الجامعہ السلفیہ فیصل آباد کی لائبریری کی زینت ہے۔ جس کے سر ورق پر مولانا محدث ملتانی نے لکھا ہے کہ ۱۳۱۱ھ میں مجھے یہ کتاب مبارک حضرت مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے تحفتاً دی ہے گویا جن دنوں میں کتاب طبع ہوئی انھی ایام میں محدث

ملتانی مولانا ڈیانوی کے ہاں قیام پزیر تھے۔ رحمهما الله رحمة واسعة

"عقود الجمان" اصل میں فارسی میں ہے، جس کی تعریب ۱۳۸۱ھ میں المکتب الاسلامی دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔ ہمارے زیرِ نظر اس کا کوئی نسخہ نہیں، البتہ مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے کہ "تعریب" میں مختلف نوعیت کی بڑی فاش غلطیاں ہیں۔ حد یہ ہے کہ مترجم نے بعض عبارتوں تک کا ترجمہ نہیں کیا۔ بعض عبارتوں اور اسماء کتب کو بھی بدل دیا ہے اور اس تبدیلی میں ان سے خطائیں ہوئی ہیں۔ نیز لکھتے ہیں کہ اس کا خطی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے جو کہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کل آٹھ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا عربی ترجمہ محترم دکتور وصی اللہ محمد عباس حفظہ اللہ مدرس الحرم المکی کا ہے جس پر حواشی بھی ہیں اور یہ ۱۴۰۸ھ میں علمی اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا ہے۔

(۲۱) سیرۃ الشیخ المحدث عبداللہ "جھاؤ میاں" اِلٰہ آبادی:

اس رسالے کا ذکر مولانا ابو ضیا محمد قمر الدین اِلٰہ آبادی نے اپنے ایک مکتوب میں کیا جو کہ مرحوم اخبار "اہلِ حدیث" (امرتسر) بمطابق ۱۱ اگست ۱۹۱۸ء میں مطبوع ہے۔ مگر وائے افسوس کہ اس سیرت کا کہیں علم نہ ہو سکا۔ مولانا سید عبدالحی الحسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں تذکرۃ النبلاء کے حوالے سے مولانا عبداللہ صاحب محدث اِلٰہ آبادی کا ذکر کیا ہے "تذکرۃ النبلاء" محدث ڈیانوی ہی کی تصنیف ہے جو کہ فارسی میں ہے اور مولانا قمر الدین صاحب کے مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدث الٰہ آبادی کی یہ سیرت اردو میں تھی، ممکن ہے مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے اسی کا اختصار تذکرۃ النبلاء میں کیا ہو۔[1] واللہ تعالیٰ أعلم. ملخصاً

[1] حیاۃ المحدث (ص: ۱۲٦)

محدث الہ آبادی کا ترجمہ ''نزہۃ الخواطر'' (۷/۳۰۴-۳۰۶) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۲ تذكرة النبلاء في تراجم العلماء:

اس کا ذکرِ خیر ''اہلِ حدیث'' (امرتسر) اور نزہۃ الخواطر میں ملتا ہے، بلکہ سید عبدالحی حسنی مرحوم نے ساتویں جلد میں تین درجن تراجم اسی ''تذكرة النبلاء'' سے نقل کیے ہیں اور شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی اور مولانا حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی رحمہ اللہ کے ترجمہ میں بھی اس حوالے سے کچھ عبارتیں نقل کی گئی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے پیشِ نظر یہ کتاب تھی۔ مگر حیاۃ المحدث کے فاضل مرتب بھی لکھتے ہیں کہ مجھے اس کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔ نامعلوم کس ہنگامہ کی نذر ہوگئی۔

۲۳ تحفة المتهجدين الأبرار في أخبار صلاة الوتر وقيام رمضان عن النبي المختار:

سید عبدالحی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے کہ صلاۃ وتر اور قیامِ رمضان سے متعلقہ مسائل و روایات کو یکجا جمع کیا گیا تھا، جیسا کہ انھوں نے ''ركعتي الفجر'' کے متعلق مسائل و احادیث کو ''إعلام أهل العصر'' میں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب طبع نہیں ہوئی اور نہ ہی کہیں اس کا سراغ ملا ہے، البتہ یادگارِ دہری میں ہے کہ ۱۳۱۲ھ میں اس کا مسودہ تیار تھا، مگر اس کی تبییض ابھی باقی تھی۔[2]

۲۴ تعليقات على إسعاف المبطأ:

''إسعاف المبطأ برجال الموطأ'' نام سے علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے موطأ کے رجال کو جمع کیا ہے، جس پر محدث ڈیانوی نے تعلیقات لکھی ہیں اور ضبط اسما میں اور کنیٰ و القاب میں جہاں علامہ سیوطی سے تسامحات ہوئے ہیں حاشیہ میں ان کی تصحیح

---

[2] ''حياة المحدث'' (ص: ۸۷)

کی گئی ہے۔ یہ رسالہ مع تعلیقات انصاری دہلی سے ۱۳۲۰ھ میں طبع ہو چکا ہے جو بڑے سائز کے پچاس صفحات پر مشتمل ہے، جس کے آخر میں علامہ سیوطی کا رسالہ "أسماء أهل الصفة" بھی مطبوع ہے۔

㉕ تعليقات على سنن النسائي:

اس کا ذکر مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ نے "سيرة البخاري" میں سنن نسائی کے تحت کیا ہے اور لکھا ہے کہ "سنن نسائی میں اسانید پر کم کلام کیا گیا ہے، تاہم اس میں پیچیدہ مقامات بھی ہیں" اور حاشیہ میں لکھتے ہیں: "علامہ ابو الطیب نے ان مقامات کا حل کیا ہے اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔" مگر طبع ثانی کے وقت جب مولانا عبیداللہ رحمانی نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے مولانا ڈیانوی کے صاحبزادے مولانا محمد ادریس صاحب سے اس کے قلمی نسخہ کا حال دریافت کیا تو موصوف نے لکھا: "اس کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں۔"[1] مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے کہ مجھے اس کا کہیں نسخہ نہیں ملا، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۲۹ھ میں مولانا ڈیانوی کی وفات تک اس کا نسخہ ان کے مکتبہ میں موجود تھا جب کہ "سيرة البخاري" پہلی بار حضرت کی وفات کے کچھ ماہ بعد ۱۳۲۹ھ ہی میں طبع ہوئی تھی۔ والله أعلم

㉖ فريح المتذكرين في ذكر كتب المتأخرين:

"نزهة الخواطر" (۸/۱۸۰) اور مرحوم اخبار "اہلِ حدیث" (امرتسر) ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں اس کا ذکر موجود ہے، لیکن لکھا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکی، نیز تھی بھی یہ فارسی میں، لہٰذا مولانا امام خاں نوشہروی نے جو "ہندوستان میں اہلِ حدیث کی علمی خدمات" میں اسے لغتِ عربی میں لکھا ہوا قرار دیا ہے صحیح نہیں ہے۔ والله أعلم

---

[1] سيرة البخاري (ص: ٤٦٩)

٢٧ تنقیح المسائل:

یہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ تھا۔ مولانا سید عبدالحی نے لکھا ہے کہ یہ مجموعہ مکمل نہیں ہو سکا۔ مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے ہم نے خدا بخش لائبریری میں دو مجموعے ایسے دیکھے ہیں جو عربی، فارسی اور اردو میں ہیں۔ جن میں ایک کے سر ورق پر "رسائل شتی وأجوبتها" لکھا ہوا ہے اور دوسرے مجموعہ کا پہلا ورق ضائع ہو گیا ہے، ممکن ہے ان میں "تنقیح المسائل" کا بھی کچھ ہو۔[1] واللہ أعلم

٢٨ الرسالة في الفقة:

اس کا ذکر خدا بخش لائبریری کی فہرست میں موجود ہے اور لکھا ہے "مکتوبة بخط المؤلف" ۱۳۱۱ھ کہ یہ ۱۳۱۱ھ کا لکھا ہوا ہے جو مؤلف کے خط سے ہے۔ اور اس کے تین ورق ہیں اور ہر صفحہ میں ۲۸ سطریں ہیں۔ مولانا محمد عزیر ﷾ لکھتے ہیں کہ ہائے ناکامی کہ خدا بخش لائبریری کے باوجود ہمیں یہ رسالہ نہیں ملا۔[2] واللہ أعلم

٢٩ جوابات إلزامات الدار قطني على الصحيحين:

اس رسالے کا ذکر کسی ترجمہ نویس نے نہیں کیا، مگر مولانا ابو القاسم بنارسی ؒ نے اس کا ذکر "الريح العقيم لحسم بناء عمر كريم" اور "حل مشكلات بخاري" میں کیا ہے۔ امام دارقطنی ؒ نے صحیح بخاری و مسلم پر الزامات واستدراکات لکھے ہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے "هدي الساري" میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ہمارے محدث ڈیانوی نے بھی اس کے جواب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ چنانچہ مولانا ابو القاسم بنارسی "الريح العقيم" (ص: ٢١) میں لکھتے ہیں: مولانا

[1] حیاۃ المحدث (ص: ١١٤)

[2] حیاۃ المحدث (ص: ١١٥)

شمس الحق امام دارقطنی کے اعتراضات کا جواب لکھ رہے ہیں اور ''حل مشکلات البخاری''
(ص: ۵۴ طبع ثانی) میں لکھتے ہیں: علامہ زماں فاضل دوراں مولانا شمس الحق ابو الطیب
عظیم آبادی رحمہ اللہ مغفور نے دارقطنی کی کتاب ''التتبع والاستدراك'' پر مطولہ حاشیہ
قابل دید لکھا ہے۔ خدا وہ دن لائے کہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مقبول اہلِ جہاں
اور مولانا کی یادگارِ نفیسہ ہو۔ ''حل مشکلات البخاری'' پہلی بار مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ کی
وفات سے تقریباً دس سال بعد ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوئی تھی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ
جواب مکمل تھا۔ ''حیاۃ المحدث'' کے فاضل مرتب نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔
ان سے ملاقات کے وقت جب ہم نے اس کا ذکر کیا تو خوشی کے ساتھ انھوں نے اس
پر تعجب کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ میں نے اس کا سراغ تو کیا، کہیں ذکر بھی نہیں پایا۔

۳۰ الأقوال الصحيحة في أحكام النسيكة:

فارسی زبان میں یہ بڑے سائز کے ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۲۹۷ھ میں
مطبع فاروقی دہلی سے طبع ہوا۔ مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے خود تصریح کی ہے کہ میں نے ۵
رمضان ۱۲۹۴ھ میں اس کا آغاز کیا اور ۲۰/ شوال کو مکمل ہوا۔ جس میں عقیقہ کا مسئلہ پر
سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اسی ضمن میں اس سے متعلقہ دیگر مسائل کو بھی بڑے
سلیقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ رسالے کی جامعیت وافادیت کا اندازہ حضرت شیخ الکل
میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے بیان سے ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''هذه الرسالة ناطقة بالصدق والصواب ومحررها مصيب بلا ارتياب كما لا يخفي على أولي الألباب فمن كان مستنا فليستن بهذا الكتاب ليثاب عند رب الأرباب يوم الحساب''[1]

[1] الأقوال الصحيحة (ص: ٣٠)

اس کے علاوہ مولانا شہود الحق عظیم آبادی اور حکیم عبدالرحمان کے فارسی ترجمہ حسائد بھی اس کے ساتھ آخر میں مطبوع ہیں۔

⑳ رفع الالتباس عن بعض الناس:

امام بخاری رحمہ اللہ نے الجامع الصحیح میں بعض مقامات پر "وقال بعض الناس" کہہ کر عموماً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بعض فقہی مسائل پر تنقید کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دفاع میں کسی ہندی عالم نے "بعض الناس في دفع الوسواس" کے نام سے ایک رسالہ لکھا، جو مطبع نظامی کانپور سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا اور بعد میں صحیح بخاری مطبوعہ ہندو پاک کے ساتھ بھی شائع ہوا جو مولانا احمد علی سہارنپوری کے حواشی سے شائع ہوتی رہی ہے۔ اس رسالے کے جواب کی ضرورت محسوس ہوئی، تا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کی وضاحت کی جائے اور تحقیق کے پردہ میں جن بے اصولیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے اس کی نقاب کشائی کی جائے۔ چنانچہ اس کے جواب میں محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے "رفع الالتباس عن بعض الناس" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ یہ رسالہ پہلی بار ۱۳۱۰ھ میں مطبع مصطفائی دہلی سے طبع ہوا۔ مگر اس کے سرورق یا اختتام پر مؤلف کے نام کی تصریح نہیں کی گئی۔ غالباً اسی لیے مولانا امام خاں نوشہروی اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ محدث ڈیانوی کی نہیں، بلکہ مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی کی تصنیف ہے۔ "تراجم علمائے حدیث ہند" (ص: ۲۲۷) لیکن یہ صحیح نہیں، جب کہ مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے "سیرۃ البخاری" (ص: ۲۵۵) میں اسے محدث شمس الحق ڈیانوی ہی کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ ابو الطیب نے اس رسالے کا جواب بنام "رفع الالتباس" شائع فرمایا اور اخلاص سے اپنا نام ظاہر نہ فرمایا۔ اسی طرح مولانا ابو القاسم بناری رحمہ اللہ نے بھی "اہلِ حدیث" امرتسر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں سے مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ ہی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسری بار ۱۳۶۶ھ میں جب مولانا عبدالتواب محدث ملتانی نے اسے طبع کرایا تو سرورق پر اور آخر میں تصریح کر دی کہ یہ محدث ڈیانوی ہی کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اب تیسری بار ۱۳۹۶ھ میں جامعہ سلفیہ بنارس سے طبع ہو چکا ہے، جس میں تصحیح اور بعض غوامض کی بہترین توضیح کر دی گئی ہے اور متاخرین علما نے جو مزید ان مقامات کے متعلق لب کشائی کی ہے حاشیہ میں باحسن طریقہ ان کی بھی تردید کر دی گئی ہے۔ رسالے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ڈیانوی نے گو اس میں امام بناری رحمہ اللہ کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بعض مسائل پر نقد کیا ہے، لیکن ان کے ادب و احترام کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، بلکہ ان کے ان مناقشات کو باہم شیروں کی پنجہ زمائی سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"لا ننكر فضائل أبي حنيفة ولا نرجح الشافعي عليه، كيف وقد أقر الشافعي بنفسه أن الناس في الفقه عيال لأبي حنيفة، وأيضاً قد أقر بفضائله وكمالاته ومحاسنه ومحامده خلق كثير.... فهو إمام جليل نبيل عالم نبيه فقيه من أفقه الناس تفقه عليه خلق كثير ورع متعبد ذكي تقي زاهد من الدنيا راغب إلى الآخرة الخ"[1]

انھی الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدث ڈیانوی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو کس قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس کے باوجود ان کے متعلق یہ ہرزہ سرائی کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر بے جا طعن کیا ہے محض تقلید جامد اور حسد و بغض کا شاخسانہ

[1] رفع الالتباس (ص: ۱۳۶، ۱۳۷)

ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

۳۲ مجموعہ مقالات وفتاویٰ:

ناسپاسی ہوگی اگر یہاں مجموعہ مقالات وفتاویٰ کا ذکر نہ کروں۔ اس مجموعہ میں حضرت ڈیانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو جمع کیا گیا ہے، جنھیں معروف محقق اور نامور عالم فضیلۃ الشیخ مولانا محمد عزیر شمس حفظہ اللہ نے مرتب کیا ہے یہ فتاویٰ پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کے ساتھ محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کے بعض دستیاب ہونے والے رسائل کو بھی شامل کر کے ہمارے علم دوست بھائی مولانا حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ نے بڑے سلیقے سے دار ابی الطیب گوجرانوالہ سے شائع کیا ہے۔ جس کی سرپرستی مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ فرما رہے ہیں۔ جزاهما الله أحسن الجزاء عنا وعن المسلمين.

اس مجموعہ میں حسبِ ذیل آٹھ رسائل ہیں:

① فتویٰ ردتعزیہ داری۔

② شبِ برات کی فضیلت۔

③ الكلام المبين في الجهر بالتأمين.

④ التحقيقات العلىٰ بإثبات فريضة الجمعة في القرىٰ.

⑤ هداية النجدين في حكم المعانقة والمصافحة بعد العيدين.

⑥ الأقوال الصحيحة في أحكام النسيكة.

⑦ جانور کو خصی کرنے کے مسئلہ پر تحقیقی بحث۔

⑧ عقود الجمعان في جواز تعليم الكتابة للنسوان.

اس مجموعہ کے شروع میں محترم مولانا عزیر صاحب کا فتویٰ کی تاریخ اور دیگر متعلقات پر طویل مقدمہ ہے جو بیش بہا معلومات پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ حضرت

محدث ڈیانوی کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ جزاہ اللہ أحسن الجزاء

ان تصانیف کے علاوہ بعض کتابوں پر آپ کی مختصر تعلیقات ہیں۔ ہم نے انھیں مستقل تصانیف میں شمار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مثلاً "کتاب القراءة للبیھقي، خلق أفعال العباد للبخاري، مجموعة التاریخ الصغیر للبخاري" طبع ہند وغیرہ پر بھی بعض مقامات پر آپ کی تعلیقات دیکھی جا سکتی ہیں۔ مولانا محمد عزیر صاحب نے لکھا ہے کہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں "مجموعہ تسویدات" کے نام سے ایک مجموعہ ہے جس میں صحاح کی مختلف احادیث پر تشریحی نوٹس ہیں اور بعض مباحث خصوصی فوائد نادرہ پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ایسے رسائل ہیں جو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں، مثلاً: ''فتویٰ فوٹو گرافی''، ''مسائل ستین''، ''فیض ابتدائی'' کو مولانا امام خاں نوشہروی نے حضرت ڈیانوی کی تصنیف قرار دیا ہے، حالانکہ یہ درحقیقت مولانا ابو طاہر بہاری کی تصانیف ہیں۔ حضرت مولانا نے مکتوبات حضرت میاں صاحب جمع کرنے کی بھی کوشش کی تھی، چنانچہ اس کے لیے احباب سے کچھ خطوط حاصل بھی کر لیے، مگر زندگی مستعار نے وفا نہ کی اور یہ مبارک کام اسی طرح باقی رہ گیا۔[1] اور نا معلوم اسی طرح کے کتنے علمی مشاغل تھے، جن کی وہ تکمیل نہ کر سکے۔

اللّٰھم اغفرله وارحمه وأکرم نزله و وسع مدخله آمین یا رب العالمین.

(ترجمان الحدیث: ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء)

[1] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

حضرت العلام محدثِ عصر

مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ

(کچھ یادیں۔ کچھ تاثرات)

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ چند سال قبل ''الاعتصام'' نے محدثِ عصر حضرت حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ (متوفی رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ) پر ان کی وفات کے بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں ان کی شخصیت اور ان کی عظیم علمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔

زیرِ نظر مضمون بھی حضرت گوندلوی صاحب کے سلسلے میں ہے، جس میں جماعت کے ممتاز محقق اور اہلِ قلم جناب ارشاد الحق اثری صاحب حفظہ اللہ نے اپنے تاثرات رقم فرمائے ہیں اور اپنے یگانہ روزگار استاذِ محترم کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے ان کی فاضلانہ و عالمانہ شخصیت کے بعض پہلو اور ان کی سیرت و کردار کے تابندہ نقوش کو اجاگر کیا ہے۔

مضمون کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر پورا مضمون ایک ہی قسط میں شائع کیا جا رہا ہے، بلکہ حضرت صاحب کی ایک نہایت اہم کتاب ''بغیۃ الفحول'' پر تبصرہ بھی جو خصوصی اشاعت میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا، اس اشاعت میں شامل کر رہے ہیں، تاکہ یہ شمارہ مذکورہ محولہ اشاعتِ خصوصی کا تتمہ و تکملہ ہو جائے۔ (صلاح الدین یوسف)

اس دور میں اگر علم وعمل، فہم وفراست، شرافت ونجابت، صدق وصفا، زہد وتقویٰ، امانت و دیانت، ذہانت و فطانت، ذکاوت وعبقریت کا ایک آموختہ تیار کر کے اسے بشری جامہ پہنا کر نوعِ انسانی کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو اس مجسمہ کا نامِ نامی ہوگا حافظ محمد گوندلوی رحمة اللّٰہ علیہ رحمةً ظاھرةً وباطنةً جو چودہ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ بمطابق ۴ جون ۱۹۸۵ء بروز منگل ہمیشہ کے لیے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور اپنے پیچھے ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں سوگوار چھوڑ گئے۔

حضرت محترم کافی عرصہ بیمار رہے، اسی دوران گاہے گاہے عیادت کے لیے کئی بار حاضری کا موقع ملا۔ آخری مرتبہ شعبان کے آخری عشرہ میں جب مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا تو حالت نہایت تشویشناک تھی۔ اب تو پہچان تھی، نہ قوتِ سماعت رہی تھی، حزین وغمگین واپس لوٹا۔ احباب، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی صحت کے بارے میں سوال کرتے تو زبان پر بے ساختہ یہی آتا کہ اللہ تعالیٰ ہی خیر فرمائے، ورنہ حالت بڑی خراب اور پریشان کن ہے۔ بالآخر چار ماہ شدید علالت کے بعد ع

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی
وہ بر آئی کہ بزمِ زندگی تھرا گئی

روشنی جس کی حریمِ روح کو چمکا گئی
ظلمتِ مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے منور تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا حکمت کا دانش کا چراغ

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

راقم آثم کو حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ سے باقاعدہ استفادہ ۱۹۶۸ء میں ملا۔

یاقت پور، جو کہ میرا آبائی قصبہ ہے، میں دیوبندی مکتب فکر کے مدرسہ قاسم العلوم سے جب ۱۹۶۳ء میں ابتدائی علوم وفنون سے فارغ ہوا تو وہاں پر میرے اساتذہ کا اصرار تھا کہ تکمیل کے لیے جامعہ رشیدیہ ساہیوال یا خیر المدارس ملتان میں داخلہ لیا جائے۔ مگر حضرت مولانا مفتی عبدالرحمان صاحب آف کہروڑ پکا کا مشورہ تھا کہ الجامعۃ السلفیہ فیصل آباد میں داخلہ لینا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضرت مفتی صاحب اہل حدیث تھے، بلکہ صرف اسی بنا پر کہ وہاں ان دنوں الجامعہ میں ان کے رفیق حضرت مولانا شریف اللہ خاں صاحب رحمہ اللہ،[1] جو معقولات کے مسلم استاد تھے درس دیتے تھے۔ جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ ان کے بڑے مداح تھے۔ اسی بنا پر بڑے اصرار سے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ[2] کو الجامعہ میں داخلہ کا مشورہ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت والد مرحوم نے مفتی صاحب کے مشورے کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ اس کی تحسین بھی کی کہ ایک تو وہاں پڑوس ہی میں ہمارے عزیز رشتہ دار ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ مولانا شریف اللہ صاحب سے شناسائی نہیں، البتہ وہاں مجھے ایک اور فرشتہ سیرت بزرگ کی زیارت کا موقع ملا ہے، جس کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے۔ لہٰذا ان کی صحبت میں رہنا فائدے سے کسی صورت خالی نہیں۔ اس لیے الجامعہ ہی میں داخل ہونا چاہیے۔

اس فیصلے کے بعد بندہ ۶۴ء میں الجامعۃ السلفیہ حاضر ہوا، مگر شومیِ قسمت کہ جن کی بدولت میرے لیے الجامعہ کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ میری حاضری سے قبل ہی ۶۲ء

---

[1] مولانا کا انتقال اگست ۱۹۷۹ء میں لاہور میں ہوا۔ ان کے مختصر حالات ''الاعتصام'' کی دو قسطوں (۵ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء) میں مولانا محمد علی جانباز صاحب سیالکوٹ کے قلم سے شائع ہوئے۔ (ادارہ)

[2] وہ بھی ۲۳ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ بمطابق ۵ جنوری ۱۹۸۶ء اتوار، راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ بس رہے نام اللہ کا۔ اللهم اغفر له وارحمه وأدخله الجنة الفردوس.

میں الجامعہ سے تشریف لے جا چکے تھے۔[1] البتہ ان کے درس کی دھاک اور اس کا چرچا درجہ عالیہ کے طلبا اور تمام اساتذہ کرام کی نوکِ زبان تھا اور ان کی مسند پر انھی کے شاگرد رشید استاذ العلماء حضرت حافظ مولانا محمد عبداللہ صاحب بڈھیمالوی مدظلہ جلوہ افروز تھے۔[2] متوسطات کی تعلیم سے فارغ ہو کر آخری سال کے لیے کشاں کشاں گوجرانوالہ جامعہ اسلامیہ چاہ شاہاں میں حاضر ہوا اور یوں حضرت صاحب کے درس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مجلسِ درس:

اس مختصر زندگی میں بہت سے اساتذہ اور شیوخِ وقت سے استفادہ کا موقع ملا، مگر جو شان حضرت حافظ کے حلقۂ درس میں پائی وہ راقم آثم کو کہیں نظر نہیں آئی۔

---

[1] الجامعہ سے ان کی علاحدگی بجائے خود ایک المیہ تھا۔ کسے معلوم نہیں کہ حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی جامعہ سلفیہ کمیٹی کے صدر اور حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب چیمہ مدظلہ جامعہ کے مہتمم تھے، مگر پہلے ایک پروگرام کے تحت حضرت غزنوی مرحوم کو کمیٹی کی صدارت سے علاحدہ کر کے ایک صاحبِ ثروت کو ان کی جگہ صدر بنا دیا گیا۔ پھر ظلمات بعضہا فوق بعض کے مصداق انھوں نے مولانا چیمہ صاحب مدظلہ کی جگہ فیصل آباد کے ایک متمول آدمی کو الجامعہ کا مہتمم مقرر کر دیا، جس نے ایسا گھٹیا انداز اختیار کیا جو عموماً سرمایہ دار ذہن کا ہوتا ہے، جس کی بنا پر حضرت حافظ صاحب مرحوم کو بھی مجبوراً الجامعہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

[2] جماعت اہلِ حدیث کی بدنصیبی نہ کہوں تو کیا کہوں کہ استاذ العلما مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب جیسے صاحبِ علم اور صاحبِ ورع و تقویٰ بھی شہر بلکہ قصبات چھوڑ کر تاندلیانوالہ کے قریب ایک گاؤں ''کمیانہ'' میں ڈیرہ ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کسے معلوم نہیں کہ ان کا شمار حضرت حافظ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا، بلکہ بقول فضیلۃ الشیخ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب رحمہ اللہ، حضرت رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ آپ نے کسبِ فیض کیا اور خود حضرت ان پر اعتماد کا اظہار فرماتے اور دورانِ تلمذ سیبویہ کے لقب سے پکارتے تھے۔ آہ! حضرت بڈھیمالوی صاحب بھی ۸ مئی ۱۹۸۷ء کو بعمر ۸۰ سال انتقال فرما گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں پڑھا سنا تھا کہ ان کے ہاں درسِ حدیث کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ ''پہلے وضو کرتے، ریش مبارک میں کنگھی کرتے، سرمہ لگاتے، عطر ملتے اور عمدہ پوشاک زیبِ تن کرتے اور یوں پورے وقار سے مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوتے۔'' بالکل یہی شان حضرت رحمہ اللہ کے درس میں دیکھنے میں آئی۔ بڑے اہتمام سے سفید لباس میں ملبوس وقت کی پابندی کے ساتھ تشریف لاتے۔ مسجد میں آتے ہی سنت کے مطابق تحیۃ المسجد ادا کرتے پھر درسِ حدیث میں مشغول ہو جاتے۔ دورانِ تعلیم ایک مرتبہ یوں ہوا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ موسم بھی سخت سردی کا تھا ہم کچھ ساتھی بیٹھے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ آج اس حالت میں حضرت تشریف نہیں لا سکیں گے اور سبق کا ناغہ ہو جائے گا۔ مگر ایک ساتھی بھاگے بھاگے آئے اور یہ کہہ کر چونکا گئے کہ حضرت تشریف لے آئے ہیں۔ جلدی سے اٹھے کہ حضرت رحمہ اللہ حسبِ معمول تشریف لا کر تحیۃ المسجد ادا کر رہے تھے، بلکہ مجھ سے مولانا محمد علی صاحب مسلم چیمہ نے ذکر کیا کہ آبادی حاکم رائے میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے آپ روزانہ گوندلانوالہ سے سائیکل پر اسی اہتمام سے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن بھی ہم نے انھیں تاخیر سے آتے نہیں دیکھا، بلکہ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں فرمایا۔ پانچ سال ہو چکے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ مدرسہ میں ایک دن بھی تاخیر سے آنے کی نوبت نہیں آئی۔ مگر آہ! آج یہ احساسِ فرض شناسی کہاں!

تحیۃ المسجد پڑھ لینے کے بعد چار زانو ہو کر مسندِ درس پر نہایت وقار سے بیٹھ جاتے اور درس شروع ہو جاتا۔ حضرت کے ہاں عظمتِ حدیث کا یہ عالم تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی نشست میں ہمیشہ یونہی چار زانو بیٹھتے۔ بڑھاپے کی بنا پر تھکاوٹ ایک فطری عمل ہے، مگر اس کے باوجود اگر ضرورت محسوس کرتے تو صرف پاؤں اوپر نیچے کر

لیتے۔ تکیے کا سہارا لے کر دراز ہو جانے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ دورانِ سبق میں اگر کوئی کچھ کہہ آجاتا تو اس کی طرف التفات فرماتے اور نہ "قال: قال رسول اللہ ﷺ" کے پیارے بول چھوڑ کر اس سے محوِ گفتگو ہی ہوتے، البتہ حاضر ہونے والا سلام کہتا تو جواب میں سنت کے مطابق وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ فرماتے، فارغ ہونے کے بعد مسکراتے ہوئے آنے والوں سے ملتے، خیریت پوچھتے اور آمد کا سبب دریافت فرماتے۔

افاداتِ شیخ رحمہ اللہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بے پایاں رحمت کی بنا پر آپ بے پناہ حافظہ اور وسعتِ معلومات کے مالک تھے، جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی نے بجا طور پر صحیح لکھا تھا

"آپ کا دماغ اور حافظہ ضرب المثل ہے۔ وسعتِ معلومات کا یہ عالم ہے کہ جب کسی مسئلے پر زبان کو حرکت دیتے ہیں تو اس سے متعلق تمام پہلو اور تمام عنوان خود بخود نکھرتے چلے جاتے ہیں اور اس کا کوئی گوشہ تشنۂ تحقیق نہیں رہنے پاتا۔ قدرت نے آپ کی زبان کو گنگ وجمن کی روانی دی ہے۔ اٹکاؤ یا ٹھہراؤ کہیں نام کو نہیں۔ گفتگو کی کوئی کڑی کہیں ٹوٹنے نہیں پاتی۔"[1]

قوتِ حفظ کے متعلق ہفت روزہ "الاعتصام" کی "خصوصی اشاعت" (ج: ۲۸ شمارہ ۱۔۲) میں حضرت رحمہ اللہ کے تلامذہ کی شہادتیں اور دیگر اہلِ علم کی آرا نقل ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سندھو مرحوم کی شہادت بھی پڑھ لیجیے لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب رحمہ اللہ امرتسری روپڑی کی یادداشت اور

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء (ج ۱، شمارہ ۱۲۔ ص: ۴)

حافظہ کا یہ عالم تھا: تمام علوم و فقہ کی کتب پر احاطہ اور عبور رکھتے تھے، کئی مشکل اور ادق مسائل میں دیکھا گیا ہے کہ جس مسئلے کا حوالہ کسی کتاب سے نکالنے کو کتاب پکڑ کر کھولنے کا تصور کرتے تو فوراً مقام مطلوبہ ہی نکل آتا ہے۔ مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی کی بھی یہی حالت ہے کہ جس کتاب کو بنظرِ غائر پڑھ لیا۔ مضامین ذہن نشین و ضبط ہوئے ع

یہ مرتبہ کمال ملا جسے مل گیا[1]

اسی قوتِ حفظ کا نتیجہ تھا کہ آپ جب بولتے تو محسوس ہوتا کہ صفحۂ قرطاس الٹتے اور پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں تردد یا ٹھہراؤ کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ صحیح بخاری شریف کے ابتدائی دروس، حدیث اور قرآن پاک کا فرق، حدیث، خبر اور سنت میں فرق، حجیتِ حدیث، حفاظتِ حدیث، کتابتِ حدیث، طبقاتِ کتبِ حدیث، امام بخاری رحمہ اللہ کے حالات مگر مختصراً، صحیح بخاری اور اس کی اہمیت اور ارجحیت، اسی ضمن میں خبر واحد کی حجیت، خبر واحد سے تخصیص اور حکم التعارض وغیرہ جیسے مباحث پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ پندرہ بیس دن تک جاری رہتا۔ معارض روایات کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ شافعیہ کے نزدیک پہلے تطبیق ہے۔ دونوں میں تطبیق کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو ایک ان میں سے ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے گا اور اگر نسخ بھی ثابت نہ ہو تو دونوں میں سے اسبابِ ترجیح کی بنیاد پر جو راجح ہوگا اسے راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جائے گا، ورنہ دونوں کا حکم ساقط ہوگا اس کے برعکس احناف کے ہاں اول نسخ ہے، پھر ترجیح پھر تطبیق، پھر ساقط۔ اسی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے ایک طرف تو کہا ہے کہ تطبیق سے

[1] نتائج تقلید (ص: ۲۲) طبع دوم

ترجیح کا تقدم واضح ہے، کیوں کہ راجح پہلو کا لینا انسان کا فطرتی عمل ہے۔ مگر دوسری طرف وہ اس کے قائل ہیں کہ قرآن پاک کی تخصیص سنت سے جائز ہے، حالانکہ یہ بھی ان وجہ تطبیق ہے اور یہ بات تو بالکل بین اور ظاہر ہے کہ قرآن پاک راجح ہے۔ اسی طرح حنفیہ کے ہاں تخصیص السنہ بالسنۃ اور تخصیص الکتاب بالتواتر و بالعکس جائز ہے اور ان کے مابین قوتِ دلیل کا اہتمام نہیں کرتے۔ مزید فرمایا کہ تعجب ہے کشمیری صاحب اس اصولی بحث میں حنفیہ کے موقف کو صحیح سمجھتے ہوئے ترجیح کو تطبیق سے مقدم جانتے ہیں، مگر خود امام ابو حنیفہ کے مختلف اقوال میں حنفیہ کی رائے کے خلاف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ''کتاب الغسل'' میں کہا ہے کہ ہمارے مشائخ کا عموماً عمل یہ ہے کہ جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو ان میں ترجیح کا پہلو اختیار کرتے ہوئے ظاہر الروایت کو لیتے ہیں اور نوادر کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن یہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ بالخصوص جب کہ نوادر کی تائید حدیث سے ہو تو میں روایتِ نوادر کو لیتا ہوں اور میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ وہ قول نوادر سے ہے۔ البتہ مشائخ کے اقوال میں اگر اختلاف ہو تو پھر ترجیح مناسب ہے کیوں کہ یہ بات کہنے والے مختلف اور متعدد ہوں تو ان میں تضاد ظاہر ہے اور بسا اوقات ان کے اقوال میں تطبیق کی کوشش ان کے مقصود و منشا کے خلاف ہو گی۔ اس لیے یہاں تو ترجیح کے بغیر چارہ نہیں برعکس جب کہ اختلاف ایک ہی قائل کے قول میں ہو تو وہاں تطبیق اولیٰ ہے، کیوں کہ ایک متکلم کے کلام میں اصل یہ ہے کہ اس میں تضاد نہ ہو، لہٰذا یہاں پہلے تطبیق کی کوشش ہو گی۔ تعجب ہے کہ ہمارے حضرات جب مختلف احادیث دیکھتے ہیں تو ان کے مابین جمع و تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، مگر جب امام صاحب کے اقوال میں اختلاف پاتے ہیں تو ترجیح کے پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔ جمع و تطبیق کے راستے کو چھوڑ دیتے ہیں۔

میرے نزدیک ممکن حد تک تطبیق اولیٰ ہے اِلا یہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ثابت ہو۔"
راقم آثم قارئین کی تسلی کے لیے مناسب سمجھتا ہے کہ یہاں کشمیری صاحب کی وہ
مکمل عبارت نقل کر دی جائے جو"کتاب الغسل" میں ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

"واعلم أن الروايات إذا اختلفت عن إمامنا في مسألة فعامة مشايخنا يسلكون فيها مسلك الترجيح فيأخذون لظاهر الرواية ويتركون نادرها، وليس بسد يد. عندي، سيما إذا كانت الرواية النادرة تتأيد بالحديث، فإني أحمله على تلك الرواية ولا أعبأ بكونها نادرة، فإن الرواية إذا جاءت عن إمامنا رحمه الله تعالىٰ لا بد أن يكون لها عنده دليل من حديث أو غيره، فإذا وجدت حديثا يوافقها أحمله عليها، نعم الترجيح إنما يناسب بين الأقوال المختلفة عن المشايخ فإن التضاد عند اختلاف القائلين معقول، و ربما يكون التوفيق بينهما خلاف منشأهم وحينئذ لا سبيل إلا إلى الترجيح بخلاف ما إذا جاء الاختلاف عن قائل واحد فإن الأولىٰ فيها الجمع فإن الأصل في كلام متكلم واحد أن لا يكون بين كلاميه تضاد فينبغي بينهما الجمع أولًا إلا أن يترجح خلافه، والأسف أنهم إذا مروا بأحاديث مختلفة يبتغون الجمع بينها عامة، وإذا مروا بروايات عن الإمام إذا هم يرجحون ولا يسلكون سبيل الجمع فالأحب إلي الجمع بين الروايات عن الإمام مهما أمكن إلا أ[...]

يقوم الدليل على خلافه فاعلمه ولا تعجل"[1]

اس عبارت سے قارئین یقیناً حضرت الشیخ کے مواخذہ میں وزن محسوس کریں گے کہ ایک طرف تو مقدمہ (ص:۵۲) میں کشمیری صاحب ترجیح کو تطبیق سے مقدم قرار دیتے ہیں، مگر دوسری طرف شخصِ واحد کے قول میں اختلاف کی صورت میں تطبیق کو ترجیح سے مقدم جانتے ہیں اور اسے اولیت دیتے ہیں۔

قصہ مختصر کہ بخاری شریف کے درس سے پہلے تمہید کے طور پر کئی دن تک اصول اور کلامی مباحث پر مشتمل تقریر فرماتے۔ بخاری شریف کے درس میں ترجمۃ الباب سے حدیث کا تعلق، حدیث سے متعلقہ فقہی مسائل کی وضاحت اور اختلافی مسائل پر تبصرہ، مشکل الفاظ کی توضیح وتشریح پر اکتفا نہ فرماتے، بلکہ محدثین کرام کے طریقے کے مطابق سند کے راویوں کا تعارف اور ان کا مختصر تذکرہ بھی فرماتے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف کی پہلی حدیث کے سلسلے میں "حدثنا الحميدي" کے تحت فرمایا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلی حدیث اپنے مشہور استاد امام عبداللہ بن الزبیر الحمیدی القرشی المکی سے لی ہے، جو امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد اور قرشی النسب ہیں۔ امام حمیدی رحمہ اللہ نے اپنی مرویات کو "المسند" کی ترتیب پر جمع کیا ہے جو دو جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ امام حمیدی رحمہ اللہ سے پہلے حدیث ذکر کرنے میں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ وحی کا آغاز چونکہ مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ اسی لیے انھوں نے پہلے اپنے مکی شیخ کی حدیث نقل کی ہے، پھر چونکہ امام حمیدی قریشی ہیں۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: "قدموا قريشاً" کے مطابق ان کی حدیث کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ امام حمیدی رحمہ اللہ چونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، اس لیے استاد کی طرف فقہ اہل الرائے

[1] فيض الباري (۳۵۷/۱)

سے ان کی بیزاری بھی معروف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی چونکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر بڑی سخت جرح کی ہے، اسی تناظر میں دورِ حاضر کے بعض حنفی علما نے کہا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ جرح دراصل امام حمیدی رحمہ اللہ اور ان کے ایک دوسرے استاد نعیم بن حماد رحمہ اللہ سے متاثر ہونے کی بنا پر تھی، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر جرح تو امام مسلم اور امام نسائی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی کی ہے تو کیا ان کی جرح بھی امام حمیدی رحمہ اللہ اور نعیم بن حماد رحمہ اللہ ہی سے متاثر ہونے کی وجہ سے تھی؟ الحمیدی رحمہ اللہ کی نسبت سے امام ابو عبداللہ محمد بن ابی النصر بھی معروف تھے، جنھوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے رجال کو جمع کیا ہے اور وہ ابنِ حزم رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔

سند کا دوسرا راوی سفیان ہے۔ اس نام سے دو محدث مشہور ہیں: ایک سفیان ثوری رحمہ اللہ اور دوسرے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ ہیں۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کے معاصر اور اس دور میں مکہ مکرمہ کے ثقات محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "لو لا مالك و ابن عيينة لذهب علم الحجاز" "اگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز مقدس کا علم ختم ہو جاتا۔"

ابن عیینہ بھی امام مالک رحمہ اللہ ہی کی طرح تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ بات کہتے ہوئے انھوں نے صحیح بخاری کے حاشیہ (میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری مرحوم نے جو "المکی التابعی" لکھا ہے) کی عبارت "المکی التابعی" پڑھی اور فرمایا کہ یہ ان سے سہو ہوا ہے۔

الغرض یوں اختصاراً مگر نہایت جامعیت سے راویوں کا تعارف بھی کرائے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ کے اوصاف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے سے کم تر درجہ و مرتبہ کے اصحاب سے استفادہ کرنے اور ان سے روایات لینے میں قطعاً عار

محسن نہیں کرتے تھے۔ ان کے اسی وصف کی بنا پر اصولِ حدیث میں ایک مستقل نوع "روایۃ الأکابر عن الأصاغر" کا اضافہ ہوا۔ استاد خواہ کتنے اوصاف و کمالات کا حامل کیوں نہ ہو، ہوتا تو وہ آخر انسان ہے۔ سہو و نسیان سے آخر محفوظ کون رہا ہے؟ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا فرمان ہے: "من ذا سلم من الوهم؟" (لسان المیزان: ۱/ ۱) استاد سے اس فطری تقاضے کی بنا پر کہیں سہو ہو جاتا اور بھری مجلس میں بھی اگر شاگرد استادِ محترم کو ٹوکنے کی جسارت کر لیتا تو کوئی محدث نہ خفت محسوس کرتا اور نہ شاگرد سے اظہارِ ناراضی ہی کرتا، کیوں کہ ان کا بنیادی مقصد علم کی خدمت تھا، اپنی ناموری اور شہرت کا وہاں کوئی تصور نہ تھا۔ ہمارے حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کی زندگی اس اعتبار سے بھی محدثین کا نمونہ تھی۔ چنانچہ ایک بار صحیح بخاری کے درس کے دوران میں جب "کتاب المناقب" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیثِ معراج آئی، جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے شریک بن عبداللہ روایت کرتے ہیں تو اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

> "اس حدیث میں شریک بن عبداللہ کو وہم ہوا ہے۔ حافظے کی کمزوری کے باعث روایت کے الفاظ ضبط نہیں رکھ سکے۔ جب وہ کوفہ کے قاضی منتخب ہوئے تو ان کے حافظہ میں تغیر واقع ہو گیا تھا۔ اس میں تقدیم و تاخیر کے علاوہ "ثم دنا فتدلی" کی جو تفصیل و تعبیر کی ہے اس پر بھی محدثین نے کلام کیا ہے۔"

بات مکمل کر چکے تو راقم آثم نے جسارت کی، جناب! یہ شریک بن عبداللہ النخعی القاضی نہیں، بلکہ شریک بن عبداللہ ابن ابی نمر ہے۔ بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے تو شریک قاضی سے کوئی روایت ہی نہیں لی۔ (1) مگر حافظ صاحب نے فرمایا نہیں یہ

(1) یہ سہو مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو بھی ہوا۔ چنانچہ موصوف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اسی روایت ←

یک قاضی ہے۔ جواباً راقم نے پھر جسارت کرتے ہوئے پہلی بات دہرا دی تو
حضرت حافظ صاحب خاموش ہو گئے۔

اگلا دن آیا تو حسبِ معمول خطبہ مسنونہ پڑھنے کے فوراً بعد اس عاجز کو
مخاطب کر کے فرمایا:

''کل جو تم نے کہا تھا وہ صحیح تھا۔ یہ راوی شریک قاضی نہیں، بلکہ شریک
بن عبداللہ بن ابی نمر ہے۔ وہ گو صدوق ہے، مگر اس سے خطائیں بھی ہوئی
ہیں اور اس کی اس روایت کے کچھ الفاظ میں محدثین نے کلام کیا ہے۔''

اس سے آپ حضرت کی منکسر المزاجی اور وسعتِ ظرفی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

''باب حلاوة الإيمان'' کے تحت گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ''ایمان کی
مٹھاس حقیقتاً و حساً بھی ہوتی ہے اور اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب سیئات سے
نفرت اور حسنات پر رغبت ہو، اس سے روح میں تازگی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے
اور مومنِ صادق کے دل میں اعمالِ صالحہ کی بنا پر ایک نور پیدا ہو جاتا ہے اور سے
سیئات کی بدبو اور حسنات کی خوشبو کا بھی بسا اوقات احساس ہونے لگتا ہے ''ذلك
فضل الله يؤتيه من يشاء'' اس سلسلے میں حضرت مرحوم نے متعدد دلائل ذکر
فرمائے۔ من جملہ دلائل میں سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر بھی فرمایا کہ ہم
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ سخت بدبو اٹھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمھیں معلوم ہے کہ یہ کس چیز کی بدبو آ رہی ہے؟ یہ بدبو ان لوگوں کے
منہ سے آ رہی ہے جو مسلمانوں کی غیبت کر رہے ہیں۔''

← کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''هكذا في رواية شريك القاضي و شريك
سيء الحفظ'' (إنهاء السكن ص: ١١٨)

اس طرح حدیث ہے:

''جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ جھوٹ کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

حضرت یہ تفصیل بیان فرما رہے تھے کہ راقم آثم نے جسارت کرتے ہوئے عرض کیا: ''کیا حسی طور پر اب بھی اس کا احساس ہوسکتا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا:

''نبی اکرم ﷺ کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی بسا اوقات اس کا احساس ہوتا تھا اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی عنایت اور کرم نوازی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آج بھی اگر کوئی اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے صحیح طور پر استوار کرے تو اس کا احساس ہوسکتا ہے۔''

میں نے پھر عرض کیا: ''کیا گناہ کی کیفیت اور نوعیت کے اعتبار سے بدبو کی کیفیت میں بھی فرق ہوتا ہے یا نہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں، گناہ کی نوعیت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔'' اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ''زانی کے جسم سے ایسی بدبو آتی ہے جیسے حقہ پینے والے کے منہ سے آتی ہے۔'' جس سے قارئین کرام ہمارے حضرت مرحوم کی روحانی قوت اور تعلق باللہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یادش بخیر دورانِ سال ایک بار چھٹی لے کر گھر آیا۔ شہر میں مرحوم ڈاکٹر نذیر احمد کے کلینک پر ان کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو وہاں جناب محمد رفیق والا صاحب تشریف فرما تھے اور وہ ایک عرصہ پہلے حضرت والد صاحب کے ساتھ منڈی کی دکان پر شریکِ تجارت رہے تھے۔ الجامعۃ السلفیہ تعلیم کے دوران میں وہ فیصل آباد آتے تو مجھے ملے بغیر نہیں جاتے تھے۔ ملتے ہی انھوں نے پوچھا: مولوی صاحب آج کل کہاں ہوتے ہیں؟ عرض کیا کہ گوجرانوالہ میں۔ کہنے لگے: وہاں تو

کے پاس؟ بتلایا کہ حضرت حافظ گوندلوی صاحب کے ہاں پڑھتا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جھوم اٹھے، میں نے عرض کیا کہ آپ کو ان سے تعارف ہے؟ کہنے لگے: بہت زیادہ، چنانچہ انھوں نے بتلایا کہ ہمارا آبائی گاؤں شیخوپورہ میں تھا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ رات کے آخری حصے میں گھر کی چھت سے پرنالے کے ذریعے روڑے گرنے کی آوازیں آنے لگیں جو روز بروز بڑھتی گئیں، کئی عاملین کو بلوایا مگر یہ عارضہ ختم نہ ہوا۔ کسی نے حضرت حافظ صاحب کا بتلایا کہ ان سے دم کراؤ۔ چنانچہ میں ان کو لینے کے لیے گوجرانوالہ گیا، میری التماس پر آپ گھر تشریف لائے۔ ایک رات گھر میں قیام فرمایا اور صبح جاتے ہوئے پانی پر دم کر کے دیا کہ اسے میرے بعد گھر میں چھڑک دینا۔ چنانچہ اسی طرح کیا گیا، جس سے نہ صرف یہ پریشانی دور ہوگئی، بلکہ تین دن گھر سے گلاب کے پھولوں کی خوش بو آتی رہی۔ بلاشبہ وہ بہت بڑے عالم اور بہت پارسا بزرگ ہیں، ان کی صحبت غنیمت ہے۔

جن ایام میں آپ مدینہ طیبہ اسلامیہ یونیورسٹی تھے، ان دنوں کا ایک واقعہ حضرت مرحوم نے ذکر فرمایا: ایک صاحب کو (انھوں نے نام بھی بتایا مگر وہ لوحِ حفظ میں محفوظ نہیں رہا) ایک مخصوص وقت میں کمر پر شدید درد ہوتا، علاج معالجہ کروایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو میں نے کہا کہ درد کے وقت میرے پاس آنا۔ چنانچہ وہ تکلیف ہونے سے پہلے پاس آ گیا، جب درد شروع ہوا تو اس نے بتلایا کہ تکلیف شروع ہو گئی ہے، میں نے درد کی جگہ ہاتھ رکھا اور کہا: تم پر جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ چند ایام سے دم کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرمائی۔ اس ناکارہ نے جسارت کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کو کیسے محسوس ہوا کہ اس پر جادو کا اثر ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: جب میں نے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھا تھا تو مجھے گندگی کی بو آنے لگی تھی، تب میں جانا

کہ یہ جادو کا اثر ہے۔

کتاب العلم میں "باب التناوب في العلم" کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے، جس میں واقعۂ ایلاء کو اختصاراً بیان کیا ہے۔ حضرت الشیخ رحمہ اللہ نے اس بحث کے دوران میں فرمایا کہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مشہور ہوگیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی حالانکہ یہ محض افواہ تھی، بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اولاً جس نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔ اس سے شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس دور میں راوی کے قیاس پر حدیثیں بنالی جاتی تھیں۔ لہٰذا یہ دیکھ لینا چاہیے کہ روایت میں قیاسِ راوی کا کتنا حصہ ہے۔[1]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا، حالانکہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک تاریخی واقعہ ہے، افواہ خواہ جس نوعیت کی ہو، اس کی تحقیق ہوتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟﴾ [الحجرات: ٦]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواجِ مطہرات سے حسنِ سلوک اور ان سے مودت و محبت کے طریقے کے بالکل برعکس ایک ماہ تک علاحدگی نے یہ شبہ ڈالا کہ شاید آپ نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اولاً کسی منافق نے یہ افواہ اڑا دی ہو، لیکن اس کا تعلق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں، ایک واقعے سے ہے۔ اس واقعے کی تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تو حقیقتِ حال واضح ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواجِ مطہرات سے ایک ماہ تک علاحدہ رہنا مسلّم ہے۔ قیاس یا افواہ کا تعلق صرف

[1] علامہ شبلی کے کلام کی تفصیل کے لیے دیکھیے: "سیرت النبی" (۱/۱۶۴) مطبوع قرآن محل کراچی۔

راوی کے اس تصور سے ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے، لیکن اس سے یہ قاعدہ بنا لینا کہ ''احادیث'' میں راوی کے قیاسات شامل ہوتے ہیں، قطعاً صحیح نہیں۔

اسی ضمن میں انھوں نے علامہ شبلی رحمہ اللہ کے اصولِ درایت پر بھی بحث فرمائی[1] اور فرمایا کہ شبلی مرحوم حدیثِ قرطاس کے بھی منکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس واقعے کو تنہا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی بیان کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت چھوٹی عمر کے تھے۔[2] فرمایا کہ علامہ شبلی کا یہ تصور صحیح نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ واقعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور ہی میں بیان کرتے تھے اور ان کے متعدد شاگردوں نے اُن سے اسے روایت کیا ہے۔ کسی ایک سے انکار منقول نہ ہونا اس کی صحت کی دلیل ہے۔ کسی حدیث کو صرف ایک ہی صحابی کے روایت کرنے سے حدیث مشکوک نہیں ہو جاتی۔ حدیثِ طلاق کو بھی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حدیث: «إنما الأعمال بالنیات» کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں اور کسی صحیح سند سے دوسرے کسی صحابی سے یہ روایت نہیں۔ اس حدیث کی اہمیت کا اندازہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث علم کا تیسرا حصہ ہے۔ امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ نے اسے اصولِ ایمان قرار دیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے بھی تنہا علقمہ لیثی ہیں اور ان سے صرف محمد بن ابراہیم تیمی ہی روایت کرتے ہیں، لہٰذا کسی حدیث کو صرف ایک صحابی کا روایت کرنا باعثِ کلام

---

[1] علامہ شبلی کے اس اصول پر مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''سیرت بخاری'' اور مولانا عبدالرحیم رحیم آبادی مرحوم نے ''حسن البیان'' میں تفصیلاً نقد کیا ہے۔

[2] دیکھیے: الفاروق (ص: ۱۰۸۔۱۱۰) مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی۔

نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے د ہ و مرتبہ کو سمجھنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصد دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ حضرت صاحب رحمہ اللہ درس میں بخاری شریف اور دیگر کتبِ احادیث کی متداول شروحات پر ہی اکتفا نہیں فرما ۔ ، تھے، انھیں برصغیر میں انکارِ حدیث کے جرثوموں سے بخوبی واقفیت تھی۔ اس لیے حدیہ ۔ کے بارے میں شبہاتِ قدیمہ کے ساتھ ساتھ شبہاتِ جدیدہ کا بھی ازالہ فرماتے۔ منکر ں حدیث کے جواب میں انھوں نے دو مستقل رسالے بھی تحریر فرمائے تھے۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے مابین ایک حدیث کی علت کے سلسلے میں مشہو مذاکرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''بوسہ کی پانچ قسمیں ہیں:

① بوسۂ رحمت، جیسے والدین اولاد کا بوسہ لیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بلکہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا بوسہ لینا ثابت ہے۔

② بوسۂ تحیہ، جیسے مسلمان ایک دوسرے کو ملتے ہوئے کرتے ہیں اور عرب میں اس کا عام رواج ہے۔

③ بوسۂ شفقت، جیسے اولاد والدین کا بوسہ لے۔

④ بوسۂ شہوت، جیسے خاوند بیوی کا بوسہ لینا۔

⑤ بوسۂ محبت، جیسے بھائی، بھائی کا بوسہ لینا۔''

باب کتابت الحدیث کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلی حدیث وہ بیان کی ہے ۔س میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیفے کا ذکر ہے اور اس میں ''ولا یقتل مسلم

بکافر" کا حکم بھی ہے۔ اس حدیث پر بحث کے دوران میں فرمایا کہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہ اللہ کا فتویٰ اسی حدیث کے مطابق ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو مسلمان کو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے امام صاحب کی وکالت کی ہے اور اس پر طویل بحث کے بعد کہا ہے کہ خلاصہ یہ کہ اس کے چار جواب ہیں:

(۱) حدیث میں کافر سے حربی مراد ہے۔

(۲) یہ حدیث دمائے جاہلیت کے خاتمے کے متعلق ہے۔

(۳) ذمی کی جان کا حکم وہی ہے جو مسلمان کا ہے۔

(۴) فتح مکہ کے خطبے میں آنحضرت ﷺ نے مسلم اور ذمی کے قصاص کا اعلان فرمایا تھا۔

لیکن اس حدیث کے جواب میں یہ محض تکلف ہے اور چاروں باتیں صحیح نہیں۔

۱۔ حدیث میں کافر سے حربی مراد لینا نہایت سطحی بات ہے، جب کہ حربی کا خون بالاتفاق مباح ہے۔ نیز یہ تو مفہوم صفت ہے اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مفہوم علمائے احناف کے نزدیک بھی معتبر نہیں۔[1]

۲۔ حدیث کو دمائے جاہلیت ہی پر محمول کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے اور تخصیص بلا دلیل و برہان جائز نہیں۔

۳۔ ذمی حقِ نفس میں مسلمان کے قطعاً برابر نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ ﴾ [الحشر: ۲۰]

"آگ والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں۔"

نیز فرمایا:

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: نیل الاوطار (۷/۱۲)

﴿ وَلَن يَجۡعَلَ ٱللَّهُ لِلۡكَٰفِرِينَ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ سَبِيلًا ﴾ [النساء: ١٤١][1]

"اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے:

"اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَؤُ دِمَائُهُمْ"

"مسلمان آپس میں قصاص و دیت میں برابر ہیں۔"

لہٰذا ذمی کو حقِ نفس میں مسلمان کے برابر سمجھنا غلط ہے۔

۴۔ فتح مکہ کے خطبے میں مسلمان اور ذمی کو مخاطب سمجھنا ہی صحیح نہیں، جب کہ مکہ مکرمہ میں ذمی کا تصور ہی غلط ہے، جب کہ کفار کا وہاں داخلہ ہی ممنوع ہے اور خود کشمیری صاحب نے جس واقعے کو اس دعوے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ "مقتول ذمی نہ تھا، مگر وہ حکماً ذمی تھا، لہٰذا کہا جائے گا: "ثبت العرش ثم انقش"

الغرض صحیح بخاری شریف کے درس میں فتح الباری اور عمدۃ القاری اور دیگر شروحات کے ساتھ ساتھ علامہ کشمیری کی تقریر فیض الباری پر بھی نظر رکھتے اور ضرورت کے مطابق اپنی نپی تلی رائے کا اظہار فرماتے اور فرمایا کرتے کہ بسا اوقات کشمیری صاحب اور احناف شوافع کو جواب دیتے ہوئے اپنے اُصول کو نظر انداز کر کے جو کچھ فرماتے:

"اس کی مثال یوں ہے، جیسے کسی کسان کے گندم کے کھیت کو "کُنگی" (کیڑا) لگ گئی ہو، ادھر زور دار بارش اور ژالہ باری ہوئی، جس نے گندم کے کھیت کی رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ کسان صبح کھیت کی طرف گیا تو دیکھ کر بولا کہ گندم تو نہیں رہی مگر کیڑے کی بھی خوب مرمت ہو گئی ہے۔"

[1] ان آیات سے استدلال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیل (۱۳/۷) وغیرہ۔

ایک بار میں نے عرض کیا کہ کیا علامہ کشمیری سے آپ کی ملاقات ہے اور باہم کبھی گفتگو ہوئی ہے؟ تو فرمایا: نہیں، میری ان سے ملاقات نہیں، البتہ ایک بار وہ مولانا عبدالواحد صاحب کے ہاں جلسے پر آئے تھے، ان دنوں میرے پاس ایک عرب طالب علم پڑھتا تھا، وہ ان کے پاس جا کے عقیدہ کے بعض مسائل پر بحث کرتا، جو اشکال اسے پیش آتا وہ مجھ سے پوچھ لیتا، یوں دو دن وہ ان کے پاس آتا جاتا رہا، بالآخر وہ انھیں یہ کہہ کے آ گیا کہ "لو لا الشيخ محمد جوندلوي لأضلتني" کہ اگر شیخ محمد گوندلوی نہ ہوتے تو آپ مجھے گمراہ کر دیتے۔

ایک مفسر کی حیثیت سے:

صحیح بخاری کے ساتھ ساتھ آپ سے قرآن مجید کے ترجمہ اور اس کے مفہوم و مطالب کو سمجھنے کا بھی موقعہ ملا۔ صحیح بخاری کے بعد دوسرا سبق یہی ہوتا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں چند ایام قرآن پاک کے "کلام اللہ" ہونے پر تفصیلی بحث ہوتی۔ پھر قرآن اور حدیث میں فرق، علم تفسیر کی تعریف، طریقۂ تفسیر، تفسیر ماثور اور تفسیر بالرائے میں فرق، شرائطِ مفسر، مسئلہ نزولِ قرآن، معروف کتبِ تفاسیر کا تعارف ہوتا۔ راقم آثم کے استفسار پر کہ "کون سی تفسیر بہتر ہے؟" فرمایا: "مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو وہ بے نظیر ہوتی۔"

ہمارے حافظ صاحب جہاں ایک بلند پایہ محدث تھے، اس کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفسرِ قرآن بھی تھے۔ الجامعۃ السلفیہ کے دور میں اساتذہ کرام سے سنا تھا کہ حضرت نے الجامعہ میں صبح کی نماز کے بعد درسِ قرآن پاک کا آغاز فرمایا تو دس ماہ صرف سورت فاتحہ کی تفسیر و تعبیر میں گزر گئے۔

اور جب الجامعۃ الاسلامیہ گوجرانوالہ میں حضرت کی خدمتِ اقدس میں حاضر

ہوا تو وہاں الجامعہ کی مسجد میں جمعۃ المبارک کا خطبہ آپ ہی ارشاد فرماتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی صاحب رحمہ اللہ بھی بقیدِ حیات تھے اور جامع مسجد میں ان کے خطبہ جمعہ کا بیان ایک خصوصی شان لیے ہوتا تھا، جس میں علمی، فکری، ادبی شہ پاروں کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنمائی کی جھلک بھی ہوتی اور وہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر ''الاعتصام'' میں شائع بھی ہوتے تھے، مگر اس کے باوجود راقم جمعہ حضرت الشیخ رحمہ اللہ کی اقتدا میں ادا کرتا اور ہر خطبہ جمعہ کے بارے میں تجسس ہوتا کہ آج دیکھیں کس موضوع پر علم و تحقیق کے موتی بکھیرے جاتے ہیں۔ مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور یقیناً قارئین بھی حیران ہوں گے کہ تقریباً سال بھر کے خطباتِ جمعہ کا عنوان ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ [الأعلیٰ: ۱۴۔۱۳] کی الآیۃ ہی۔ جس سے اس بات کی تائید ہوگئی جو میں الجامعۃ السلفیہ میں سن چکا تھا۔ اس سے آپ قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں ان کی معلومات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

شرائطِ مفسر ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''مفسر کے لیے ان شرائط کا ہونا ضروری ہے: صحیح الاعتقاد ہو، نیت اور ارادہ نیک ہو، علم حدیث اور اصولِ حدیث، لغات القرآن، اس سلسلے میں امام راغب کی ''مفردات القرآن'' کا ذکر بھی فرمایا کہ کم از کم اس پر کامل دسترس ہو۔ صرف ونحو، علمِ معانی، بیان اور بدیع، علم الفقہ و اصول، علمِ کلام اور علمِ قراءت سے واقف ہو، اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ و طہارت اور تعلق باللہ بھی ضروری ہے، تاکہ مشکلات میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی فیضانِ قلب وفکر پر وارد ہو، جسے لوگ عموماً ''علمِ وہبی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ ان تمام شرائط کے حامل تھے۔ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾

[الفاتحہ: ٤] کی تفصیل ایسے پیارے انداز سے بیان فرماتے کہ سننے والا ششدر رہ جاتا۔ عبادت کے معنی، عبادت اور عادت میں فرق، اللہ تعالیٰ کی عبادت کیوں اور کیسے اور غیر اللہ کی عبادت کے اسباب پر بڑی طویل بحث فرماتے۔ اسی ضمن میں عبادت اور اطاعت میں فرق بیان کرتے ہوئے علامہ مشرقی اور مولانا مودودی مرحوم کی بھی تردید کرتے، جن کا کہنا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اصل عبادت ہے اور نماز روزہ، ذکر و تسبیح ٹریننگ کورس ہے۔ عبادت و اطاعت میں فرق اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے افکار و نظریات کی تردید کے لیے حضرت الشیخ رحمہ اللہ کا ایک مستقل رسالہ "تنقید المسائل" کے نام سے مطبوع ہے، مگر اس پر تاریخِ طباعت نہیں، البتہ اس کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریباً ۱۹۵۷ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔ جب مولانا مودودی رحمہ اللہ اپنی دعوت کے پہلے طریقہ کار سے یکسر منحرف ہو گئے تھے۔ جسے وہ پہلے طریقہ انبیائے کرام علیہم السلام قرار دیتے تھے۔ اس کے برعکس جب انھوں نے "سائنٹیفک" طریقہ اپنایا اور انتخاب و اقتدار کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کی، جسے پہلے وہ شجرِ ممنوعہ باور کراتے تھے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ان کے اسی اقدام کے پیشِ نظر ان سے ان کے ستر قریبی ساتھی علیحدہ ہو گئے اور ان میں بعض تو ایسے تھے جو جماعت اسلامی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ عبادت کا جو مفہوم مولانا مودودی رحمہ اللہ نے پیش کیا۔ ابھی چند سال ہوئے کہ ان کے سابقہ رفقا میں سے مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے "عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" اور مولانا منظور احمد نعمانی صاحب نے "مولانا مودودی رحمہ اللہ کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" میں اس وقت اس پر بھرپور تنقید کی جب مولانا مودودی رحمہ اللہ کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نے اپنے بال و پر نکالنے

شروع کر دیے تھے، مگر ہمارے حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ نے اس خطرے کو بہت پہلے محسوس کرتے ہوئے ''تنقید المسائل'' میں اس پر مدلل تنقید کی اور مولانا مودودی مرحوم کے اکتشافات سے قوم کو متنبہ فرمایا۔ جزاه الله أحسن الجزاء

دل تو چاہتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی حضرت مرحوم کے ارشادات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے، مگر یہ عجالہ اس تفصیل کا متحمل نہیں۔ شائقین حضرات ''تنقید المسائل'' کی طرف مراجعت فرمائیں۔ البتہ تفسیری نوعیت کی بعض باتوں کا تذکرہ قارئین کی دلچسپی کے لیے ضروری اور مفید سمجھتا ہوں۔

سورۃ النساء میں ﴿ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ ﴾ [النساء: ۱۷۱] الآیۃ کے ضمن میں غلو کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امورِ دینیہ کی حدود مقرر فرما دی ہیں۔ ان سے تجاوز ثواب نہیں، بلکہ عتاب کا موجب ہے اور حدودِ مقررہ سے تجاوز کا نام غلو اور افراط ہے۔ یہ افراط اگر عقائد، معاملات، مقامات اور درجات میں ہو تو اسے غلو کہتے ہیں، علم میں ہو تو اسے تعمق کہتے ہیں، اگر اخلاق اور عبادات میں ہو تو اسے رہبانیت کہتے ہیں، اگر عادات میں ہو تو اسے تکلف کہتے ہیں۔ اگر طہارت و نجاست کے دور کرنے میں ہو تو اسے وساوس کہتے ہیں اور اگر اصول و فروع کے عدم تحفظ میں ہو تو اسے ظلم و سفاہت کہتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ کی آیت: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ [البقرۃ: ۲۰۸] کے تحت فرمایا کہ اس آیت میں مکمل اسلام کی تابعداری کا حکم ہے اور شیطان کی تابعداری میں جیسے پہلی گمراہ قومیں ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [البقرۃ: ۸۵] کا طریقہ اختیار کر چکی تھیں۔ اس سے مجتنب رہنے کی تاکید ہے۔ اسلام کے ایک حصے کو اختیار کرنا اور دوسرے کو ترک کر دینا

درست نہیں۔ اس سے اجتناب تبھی ہو سکتا ہے جب تحقیق کی راہ اختیار کی جائے۔ تقلید نے تو اسلام میں تفرقہ بازی کو ہوا دی ہے۔ حنفی، شافعی نزاع اس شدت سے رہا ہے کہ ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنا تو کجا رشتۂ مناکحت میں بھی کہا گیا کہ شافعی عورت سے نکاح تو ہو سکتا ہے، مگر شافعیوں کو رشتہ نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ بعض نے تو فریقین کے مابین مناظرہ کو ''معرکۂ جہاد'' سمجھ کر یہ فتویٰ بھی دیا کہ روزہ افطار کرنا جائز ہے، تاکہ پوری قوت سے فریقِ مخالف کا ابطال کیا جا سکے۔ ان مذہبی فرقوں کے مابین لڑائیوں کی داستان بھی طویل ہے۔ اسی تقلید کی بنا پر اسلام کی تقسیم بھی ہوئی۔ صراطِ مستقیم جو ہمیشہ ایک رہا، اسے چوتھائی میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ مذہبِ واحد کی تقلید کر کے کوئی آدمی مکمل شریعت پر عمل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس آیت میں اس کی بھی تردید ہے اور مکمل دین کی تابعداری اور باہم صلح و اتفاق سے رہنے کا حکم ہے، کیوں کہ ''في السلم'' میں سلم کے معنی صلح کے بھی آئے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَإِنۡ جَنَحُوا۟ لِلسَّلۡمِ ﴾ [الأنفال: ٦١] الآیۃ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ایماندارو! آپس میں مکمل اتفاق و اتحاد سے رہو اور شیطان کے پیچھے چل کر اختلاف کا شکار نہ ہو جاؤ۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت سے تحقیق کی تائید اور تقلید و جمود کی تردید بھی ہوتی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت: ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ﴾ [البقرۃ: ٦٢] الآیۃ پر بحث کرتے ہوئے صابیہ کا تعارف اور عملِ صالح کی شروط ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت کو سمجھنے میں مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ کو غلطی لگی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج بھی یہودی یا عیسائی رہ کر اگر کوئی ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرتا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہے، یہ صحیح نہیں۔ ایمان باللہ کے

تحت اس کے تمام لوازم داخل ہیں اور انہی لوازم میں سے ایک ایمان بالرسل بھی ہے، جب کہ بندوں کو ان کے مالک کا راستہ بتلانے والی ہستی رسول ہی کی ہوتی ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کو مانا جائے، مگر اس کے بھیجے ہوئے رسول کو نہ مانا جائے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے مترادف ہے، گویا رسول اللہ ﷺ کا انکار اللہ تعالیٰ کا انکار ہے۔ بلکہ تمام انبیا و رسل کو ماننا ایمان کے لیے شرط ہے اور کسی ایک نبی کا انکار کرنا ... ہے۔ یہود و نصاریٰ تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول ہی نہیں مانتے۔ اس لیے انہیں ایمان دار کہنا درست نہیں۔ پھر اس آیت میں ﴿عَمِلَ صٰلِحًا﴾ کے لفظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جب کہ عملِ صالح نبی کی اتباع و اطاعت پر موقوف ہے اور نبی کرم ﷺ کی بعثت کے بعد تو اب عملِ صالح اور محبتِ الٰہی کا ذریعہ صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ [آل عمران: ٣١] ''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔'' سے واضح ہوتا ہے۔ قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ میں اس پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دوبارہ تشریف لائیں گے تو وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اطاعت گزار بن کر آئیں گے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کوئی یہودی یا عیسائی رہ کر بھی ایمان دار ہے، قطعاً صحیح نہیں۔ اور مولانا ابو الکلام کی یہ بات کسی صورت درست قرار نہیں دی جا سکتی۔

پاکستان اور حضرت حافظ صاحب:

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ جہاں ایک بہترین مدرس، محقق، محدث، مفسر، مناظر اور مصنف تھے۔ وہاں میدانِ سیاست کے بھی شاہسوار تھے۔ آپ دو قومی نظریے کے زبردست حامی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا، بلکہ گوجرانوالہ شہر میں مسلم لیگ کے عہدۂ صدارت پر بھی فائز رہے۔

یکِ پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ (روز نامہ جنگ ۶ / جون ۱۹۸۵ء)

کسے معلوم نہیں کہ پاکستان کے حصول کا مقصدِ وحید یہاں اسلامی معاشرہ کا قیام اور کتاب وسنت کی روشنی میں دکھی دنیا کو پیغامِ حیات دینا اور عملاً اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنا تھا، مگر یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے کہ مسلسل کوششوں سے اس مقدس نظریہ کی بیخ کنی اس حد تک کر دی گئی کہ اس مقصد کی تکمیل تو کجا نئی نسل الٹی اسلام ہی سے بیگانہ ہو رہی ہے اور اس میں زیادہ عمل دخل ہمارے اربابِ اختیار دا قتدار کا ہے، جنھوں نے یہاں سب کچھ کیا اگر نہیں کیا تو اسلام کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ان حضرات کا یہ عمل و کردار اسلام اور اللہ و رسول ﷺ سے غداری کے مترادف ہے۔ اس کی کچھ سزا تو مشرقی پاکستان کے کٹ جانے سے مل چکی اور باقی ماندہ حصہ کے متعلق جو خبریں آئے دن سننے پڑھنے میں آ رہی ہیں ہوا کا رخ معلوم کرنے اور یک مند کو جھنجھوڑنے کے لیے اپنے اندر کوئی کم حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان باتوں کا احساس حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کو بڑی شدت سے تھا، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک مدت پہلے لسانِ غیب نے یہ بات صاف صاف لکھنے پر مجبور کر دیا:

''اگر اسلامی آئین پاکستان میں نافذ نہ کیا جائے تو پاکستان کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جغرافیائی، لسانی، نسلی تعصب کی بنا پر اس کے پارہ پارہ ہونے کا خطرہ ہر وقت دامن گیر رہے گا۔ پرہیز گاری کی بنا پر نہیں، بلکہ عقلی طور پر یہاں اسلامی آئین کے نفاذ کی اشد ضرورت ہے۔ پس جو شخص پاکستان میں اسلامی آئین کے سوا کسی اور آئین کے جاری ہونے کا متمنی اور اس کے متعلق جدوجہد کرتا ہے وہ حقیقت میں ملک کا غدار ہے۔ پاکستان کو کمزور کرنے اس کے پارہ پارہ کرنے یا اس کو پھر نئے

سرے سے ہندوستان میں مدغم کرنے کا متمنی ہے۔''[1]

بات بالکل ظاہر اور صاف ہے کہ پاکستان کی حفاظت اور اسے نسلی اور لسانی فسادات سے بچانے کا فقط ایک ہی طریقہ تھا کہ یہاں فوراً اسلامی آئین نافذ کر دیا جاتا۔ مگر سوءِ اتفاق کہ ایسا نہ ہو سکا۔ جس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا اظہار حافظ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

اس وقت ہمارا ملک پاکستان ہی نہیں، بلکہ پورا عالمِ اسلام تفریق و تشتت کا شکار ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر متفق ہیں، مگر افسوس کہ مسلمان باہم دست بہ گریباں ہیں۔ ان حالات میں اسلام کا درد رکھنے والوں کو کیا کرنا چاہیے اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلک میں کیسے پرونا چاہیے۔ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں بھی اپنے قیمتی خیالات کا اظہار یوں فرمایا ہے:

''اس وقت سیاسی طور پر دنیا تین حصوں میں منقسم ہے: اشتراکی بلاک، مغربی بلاک، اسلامی بلاک۔ ان حالات میں تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلامی بلاک کا ساتھ دیں۔ تمام ممالک اسلامیہ کو بمنزلہ ایک ملک بنا دیا جائے اور انھیں ایک مشترک مفاد پر جمع کیا جائے۔ تمام ممالک اسلامیہ کے امرا کی ایک جمعیت قائم کی جائے، جن کے مشورے سے تمام امور طے کیے جائیں۔ تمام ممالک کے لیے ایک ہی آئینِ اسلام ہو۔ نصابِ تعلیم ایک ہو اور حتی الامکان تمام ممالک سے امتیازی قانون کی پابندیاں کم کی جائیں۔ وطنی، لسانی بنیاد پر اتحاد المسلمین میں جو رکاوٹیں پیدا ہوں، ان کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔''[2]

[1] ''تنقید المسائل'' (ص: ۶۵)

[2] ''تنقید المسائل'' (ص: ۱۲۲)

حضرت کے ان افکار سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتحاد بین المسلمین کے
بے وہ اپنے اندر کتنا درد رکھتے تھے، انھیں نہ ملکی سطح پر افتراق و انتشار گوارا تھا او نہ
م اسلام میں تفریق و تشتت کو وہ پسند کرتے تھے، بلکہ وہ تو نبی اکرم ﷺ کے فر ن:
ثل المؤمنين كمثل الجسد الواحد" کے مطابق عالمِ اسلام کو جسدِ واحد کی
ح دیکھنے کے خواہاں تھے۔ غفر الله له و رحم عليه

بحرِ علم و عمل:

حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ علم کے نہیں، بلکہ زبانِ سنت کے مطابق علم
" کے امین تھے اور اہلِ اللہ کی اصطلاح کے مطابق صحیح معنوں میں عالم باللہ
اللہ اور عارف باللہ تھے۔ زہد و تقویٰ میں زاہد مرتاض اور شب زندہ دار تھے،
۔ میرے حضرت تو صحیح معنوں میں اس کا مصداق تھے ع

یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انھیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی!

شبِ خیزی اور آہ سحر گاہی کا معمول تو آپ کے ہاں عنفوانِ شباب ہی سے
۔ اللہ والوں کے اوصاف میں شب بیداری تو صفتِ اول ہے۔ کیوں نہ ہو کہ

جو ہو فرقت کی بے تابی تو یہ خوابِ گراں کیوں ہو

بلکہ طالب علمی کے دور ہی سے شبِ بیداری کا معمول تھا۔ حضرت الاستاد
مولانا محمد عبدہ صاحب مدظلہ نے حضرت مولانا محمد یونس دہلوی رحمہ اللہ کے واسطے سے
فرمایا کہ حضرت حافظ صاحب جب دہلی پڑھتے تھے تو نمازِ تہجد چاندنی چوک سے ذرا
آگے مسجد میں جا کر ادا کرتے تھے۔

ایک شب یوں ہوا کہ آپ تشریف لے جا رہے تھے کہ پہرے دار نے ل

بجے اور آواز دی کہ کون ہے؟ آپ اپنی سادگی پر بھاگ کھڑے ہوئے، مسجد سے قریب پہنچے تھے کہ ایک ٹھوکر سے گر گئے۔ اوپر سے پہرے دار نے آلیا اور معاذ اللہ چور سمجھ کر حوالہ زنداں کروا دیا۔ اس کی اطلاع مدرسہ کی انتظامیہ کو ہوئی تو حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے آپ کو چھڑا لائے۔ نمازِ تہجد میں لمبا قیام فرماتے اور قرآن پاک نہایت ''ترتیل'' سے پڑھتے۔ نماز میں آیاتِ بشارت پڑھتے تو یوں محسوس ہوتا کہ یہ پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے اور آپ اس پر سراپا عجز و نیاز ہو گئے ہیں اور آیاتِ تخویف کی تلاوت فرماتے تو خوف و خطر کا اظہار آواز سے نمایاں ہوتا۔ آواز میں ایسی حلاوت ہوتی اور آیات کی تفہیم کے مطابق ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا دل چاہتا کہ آپ پڑھتے ہی چلے جائیں اور رات کی نماز میں تو بالکل کیفیت وہی ہوتی جس کا ذکر نبی اکرم ﷺ کی نماز کے بارے میں احادیث پاک میں آیا ہے کہ جیسے ہنڈیا اُبل رہی ہے۔ نماز میں یہ استغراق دراصل فیضان تھا خاندانِ غزنویہ سے شرفِ تلمذ کا۔ رحمهم الله تعالىٰ أجمعين

نماز کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ انہی کی شاگرد رشید حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ کم و بیش پچاس سال تک حضرت کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ (الاعتصام ۲۱ جون ۱۹۸۵ء) فرائض و سنن کے علاوہ مستحبات کا بھی بڑا اہتمام فرماتے۔ جب بھی مسجد میں تشریف لاتے فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق دو رکعت پڑھنے سے پہلے قطعاً نہیں بیٹھتے تھے۔ نمازِ تہجد گھر پر ادا کرنے کے بعد مسجد میں تشریف لے جاتے اور موذن کو بروقت اذان کہنے کا حکم فرماتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد چار زانو ہو کر نہایت اطمینان سے جم کر بیٹھ جاتے اور اَوراد و وظائفِ مسنونہ میں مشغول رہتے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد چاشت کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لے جاتے۔

اسی طرح مغرب کی نماز کے بعد بھی نوافل کا اہتمام تھا۔

اخی فی اللہ مولانا شہباز احمد سلفی صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار نماز سے پہلے ایک سائل آیا اور عرض گزار ہوا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ شہر کے بہت بڑے عالم ہیں۔ آپ میری اعانت فرمایئے۔ آپ نے اس کی امداد کرنے کے بعد فرمایا: سائل آپ کو کسی نے غلط کہا ہے بڑے عالم تو مولانا محمد اسماعیل سلفی ہیں، جو بڑی مسجد کے خطیب ہیں، میں تو ایک طالب علم ہوں، چھوٹی سی مسجد کا امام ہوں۔ وہ صاحب تو چلے گئے۔ مگر اس کے بعد حضرت حافظ صاحب کا یہ عالم تھا کہ سراپا عجز و نیاز رہے۔ نماز کا وقت ہوا تو پوری نماز روتے ہوئے پڑھائی۔ اللہ اللہ! کیا شان تھی عجز وانکساری اور تواضع کی۔

حضرت حافظ صاحب کو قرآن پاک سے جو لگاؤ اور محبت تھی اس کا اندازہ آپ اس ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں جس کا اظہار مجھ سے محترم مولانا صوفی محمد اکبر صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۸۴ء میں حضرت کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تو گوجرانوالہ ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ رمضان المبارک کا مہینا تھا، ڈاکٹر نے روزے رکھنے سے روک دیا۔ شدید بیماری کے ایام میں آپ ذکر و اذکار اور تلاوتِ قرآنِ پاک میں مصروف رہتے۔ رمضان المبارک کے بعد بڑی حسرت اور افسوس سے فرمایا کہ امسال روزے چھوٹ گئے، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تیس مرتبہ قرآن پاک پڑھنے کی توفیق عطا فرما دی۔ گویا روزانہ ایک قرآن پاک ختم کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلقِ خاطر ہی کا نتیجہ تھا کہ مرض الموت میں جن دنوں آپ لاہور میو ہسپتال میں داخل تھے۔ زبان اور دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتے۔ ملنے والوں میں اگر کوئی صحت کا حال دریافت کرتا تو مختصر جواب دے کر پھر ذکر و اذکار میں مصروف ہو جاتے۔ حضرت

کے انتقال کے بعد ایک روز حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ حضرت مولانا صاحب نے ریسور اٹھایا تو باتوں باتوں میں اندازہ ہوا کہ فیصل آباد سے مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہیں۔ انھوں نے جب حضرت صاحب کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے تعزیت کا اظہار کیا تو حضرت مولانا صاحب کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ گلوگیر لہجے میں فرمایا: حکیم صاحب! علم کی مسند ہی سونی نہیں ہوئی، ذکر وفکر کی مجلسیں بھی ختم ہو گئیں۔ آہ ع

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی زمانہ میں

آپ عموماً حلقۂ درس میں علم کے ساتھ ساتھ عمل کی رغبت دلاتے اور ذکر واذکار کی تلقین فرمایا کرتے۔ اس کم سواد کو حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ سے علم کے ساتھ ساتھ روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ آپ کی مجلس میں حاضری سے پہلے طبیعت میں تکدر کے جو آثار نمایاں تھے۔ آپ کی صحبت سے کافی حد تک اس کا مداوا ہوگیا۔ والحمد للہ علی ذلك

زندگی کے اوائل سے چونکہ طبیعت لاابالی سی تھی، اس لیے کماحقہ استفادہ تو نہ کر سکا، البتہ آپ کی صحبت سے علم اور اہلِ علم وعمل سے تعلق قائم ہوگیا۔ حضرت رحمہ اللہ کی ہی یہ خصوصی عنایت تھی کہ اگر کبھی درس میں حاضری کا ناغہ ہو جاتا تو آپ درس کے بعد ساتھیوں سے اس کم سواد کا نام لے کر پوچھتے کہ وہ کہاں گیا ہے۔

تعلیم سے فارغ ہوکر ادارۃ العلوم الاثریہ سے وابستہ ہوگیا اور یہاں سے ہر دو چار ماہ بعد حضرت کی زیارت اور مشکلات میں راہنمائی کے لیے حاضر ہوتا۔ حضرت کے ساتھ دیر تک مجلس رہتی۔ آپ سے اجازت لے کر درِدولت سے نکلتا تو یوں محسوس ہوتا

کہ بہت بڑی دولت ہاتھ آ گئی ہے، اسی تاثر میں یہ کہتا ہوا وہاں سے لوٹتا کہ ع

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ ام

ایک بار یوں بھی ہوا کہ اطمینان وسکون جاتا رہا، نہ نماز میں سکون، نہ ذکر و تسبیح پر توجہ، اور نہ مطالعہ میں دلچسپی۔ میں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار فوراً خط کے ذریعے سے آپ سے کر دیا اور عرض کی حضرت:

اگر باشد نصیبِ من عطا کن
تو ایں دردِ مرا بارے دوا کن

حضرت نے فوراً اس کا جواب مرحمت فرمایا اور چند اوراد و وظائف کی تلقین فرما دی، جس کی پابندی سے چند ہی ایام میں یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ والحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذلك

مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں اس خط کو من وعن نقل کر دوں، شاید وادیٔ احسان کے کسی مسافر کو اس سے راہنمائی حاصل ہو سکے اور وہ مبارک خط بھی دست برد زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ جسے آج تک میں نے حرزِ جاں بنائے رکھا ہے:

"عزیز محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ذکر اللہ اور نمازِ تہجد یہ دو چیزیں ایسی ہیں، جن پر مداومت کرنے سے ان شاء اللہ مقصد حاصل ہو گا۔ تہجد کا تو آپ کو علم ہے ذکر سے بھی اگرچہ آپ واقف ہیں، مگر برائے تنبیہ کچھ عرض کرتا ہوں۔

صبح کی نماز کے بعد سو بار درود "صلی اللہ علیٰ حبیبہ محمد وآلہ وبارك وسلم" پڑھیں اس کے بعد پانچ صد مرتبہ "بسم اللہ الرحمان الرحیم" اس کے بعد درود مذکور سو بار پڑھ لیا کریں۔

نمازِ عصر کے بعد درود مذکور سو بار پھر ”لا حول ولا قوۃ إلا باللہ“ پانچ صد بار، جب سو ختم کرنا ہو تو ”لا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلي العظیم“ پڑھ لیا کریں۔ اس کے بعد درود مذکور سو بار پڑھیں۔ سوتے وقت آیۃ الکرسی اور البقرۃ کی آخری آیتیں ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ﴾ سے آخر سورت تک پڑھ لیا کریں اور سورۃ آل عمران کی آیت: ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ داہنی جانب لیٹ کر ۲۱ بار پڑھ کر یہ نیت کر کے دل میں کہہ کر سو جائیں کہ یا اللہ جس طرح تو زندہ ہے، اسی طرح میرا دل زندہ کر۔ والباقي عند التلاقي“

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ فرائض وسنن تو کجا آپ کے ہاں تو مستحبات کا بھی اہتمام تھا۔ نماز میں دو سجدوں کے بعد جلسۂ استراحت سے اٹھتے وقت ہاتھوں کے سہارے اٹھنا محدثین کے ہاں معمول ہے، مگر اٹھتے ہوئے ہاتھوں کی کیفیت کیا ہو۔ اس کا عموماً کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ مگر حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ مٹھی بند کر کے زمین پر رکھتے جیسے آٹا گوندھنے والے کی کیفیت ہوتی ہے، اس پر عمل ہی کا نتیجہ تھا کہ پاؤں کے ٹخنوں کی طرح ہاتھ کی انگلیوں کی پشت پر بھی نشانات پڑ گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صحیح بخاری کے سبق کے دوران میں جب اس مسئلے کی وضاحت فرمائی تو بخاری شریف (۱/۱۱۴) کے حاشیے سے یہ عبارت بھی پڑھ کر سنائی: ”قال الفقهاء: یعتمد کما یعتمد العاجن للخمیر کذا في الکرماني“ فرمایا کہ حاشیہ میں لفظ ”العاجز“ ہے مگر صحیح العاجن ہے، جیسا کہ کرمانی شرح بخاری (۵/۱۷۶) میں ہے۔[1]

[1] علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ”وکان یعجن في الصلاۃ یعتمد علی یدیه إذا قام“ اور کہا ہے: ”رواہ أبو إسحاق الحربي بسند صالح“ (صفة صلاة النبي ﷺ ص: ۱۳۷ طبع ۱۱)

حضرت مولانا ابو البرکات احمد صاحب کا بیان ہے کہ ایامِ بیض کے روزوں کا بھی آپ بڑا اہتمام فرماتے، مگر جب طبیعت کمزور ہو گئی تو یہ روزے چھوڑ دیے۔ مگر اتفاق دیکھیے کہ اس کے بعد آپ بواسیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ روزے رکھنے سے بیماری رکی ہوئی تھی۔ روزے چھوڑنے سے بیماری نے اپنا اثر ظاہر کر دیا ہے۔'' الغرض حضرت حافظ صاحب علم و عمل میں بھی خیر القرون کی یاد اور سلف کا صحیح نمونہ تھے مگر آہ!

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

اللّٰهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه و أدخله الجنة الفردوس.

صلى الله علىٰ حبيبه محمد وآله وبارك وسلم، آمين يا رب العالمين.

بشکریہ ''الاعتصام''

شوال: ۱۴۱۱ھ۔ اپریل: ۱۹۹۱

مولانا محمد عبداللہ محدث فیصل آبادی رحمہ اللہ

اس دنیائے فانی میں کون ہے جس نے اپنی بساط بسائی ہو، جو یہاں آیا، بس جانے ہی کے لیے آیا، مگر حقیقت یہ ہے ان جانے والوں میں بعض حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو چلے جانے کے باوجود نہیں جاتے، ان کا نام، ان کا کام ہمیشہ زندہ جاوید رہتا ہے اور ان کی جلائی ہوئی شمع سے ہمیشہ اللہ کی مخلوق مستنیر ہوتی ہے۔ انھی پاکباز ہستیوں میں ایک میرے شیخ میرے مربی استاذ العلماء حضرت مولانا محمد عبداللہ محدث فیصل آبادی مرحوم تھے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے شناسائی ۱۹۶۶ء میں ہوئی، میں ابھی الجامعۃ السلفیہ میں زیر تعلیم تھا، پہلی بار اپنے ہم سبق ساتھی مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب، جو اب ماشاء اللہ بہاولپور یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور انھوں نے دکتورہ بھی کر لیا ہے، کے ہمراہ ان کی خدمتِ اقدس میں جامع مسجد کریمیہ جھال خانوآنہ حاضر ہوا، مگر سوئے اتفاق کہ زیارت نہ ہو سکی۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ نثار حفظہ اللہ جو ان ایام میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ہاں زیرِ تعلیم و تربیت تھے، سے ملاقات ہوئی۔ ان سے اپنی حاضری کا سبب ذکر کر کے واپس لوٹ آیا، البتہ چند ایام بعد دوبارہ حاضر ہوا تو مولانا صاحب کی زیارت سے مشرف ہوا۔ غالباً جمعۃ المبارک کا دن تھا، آپ اس کی تیاری میں مصروف تھے۔ پہلی ملاقات میں انھوں نے اس نامہ سیاہ کی تعلیمی پوزیشن کا جائزہ لے

کر یہ شفقت فرمائی کہ اپنے کتب خانے میں لے جا کر فرمایا: یہ میرا سارا اندوختہ ہے، اسے دیکھ لیجیے۔ اس میں سے جس کتاب کی بھی ضرورت ہو، مطالعہ کے لیے لے جا سکتے ہو۔ ایک اجنبی طالب علم کے ساتھ پہلی مجلس میں ان کی اس کشادہ دلی اور محبت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اسی دوران میں میں نے ''الكفاية في معرفة الرواية'' خطیب بغدادی کی اور ''صيانة الإنسان عن وسوسة الشيخ دحلان'' حضرت مولانا بشیر احمد سہسوانی کی اپنی بے مائیگی کے باوصف پڑھیں۔ ۱۹۶۸ء میں گوجرانوالہ میں جب حضرت الاستاذ محدث گوندلوی رحمہ اللہ سے سندِ فضیلت حاصل کر کے گھر پہنچا تو رمضان المبارک میں ان کی اور حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب رحمہ اللہ کی جانب سے ''ادارۃ العلوم الاثریہ'' کے اجرا کا اشتہار لیاقت پور ہی لگا ہوا نظر آیا۔ حضرت والد صاحب سے اجازت لے کر میں نے داخلے کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں عریضہ لکھا تو چند دنوں بعد اس کی منظوری کا خط ان کی جانب سے موصول ہوا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق شوال کے اوائل ہی میں میں کشاں کشاں ''ادارۃ العلوم الاثریہ'' میں حاضر ہو گیا۔

یہ ادارے کا پہلا سال تھا۔ ادارے کا آغاز بھی حضرت مولانا رحمہ اللہ ہی کی مسجد کریمیہ اہلِ حدیث میں ہوا، نہ کوئی علاحدہ کمرہ، نہ باورچی خانہ، نہ معروف معنوں میں مدرسہ کا ماحول، مسجد اور کتب خانے کا کمرہ، بس یہی سب کچھ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نمازِ مغرب کے قریب میں مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے کتب خانے کی چابی میرے حوالے کر دی، سردیوں کے ایام تھے، عشاء کی نماز کے بعد میں کتب خانے میں داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے طلوعِ فجر تک سب کتابیں دیکھ لیں۔ ایک ایک کو دیکھا اور رکھی ہوئی جگہ پر دوبارہ رکھ دیا، جس کا فائدہ

یہ ہوا کہ اس کے بعد مجھے کسی کتاب کی تلاش میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

نام ونسب اور ابتدائی ماحول:

آپ کا نام عبداللہ، کنیت ابومحمد، والد مرحوم کا نام عنایت اللہ تھا اور سلسلۂ نسب یوں ہے: عبداللہ بن عنایت اللہ بن نتھو بن حسین۔ آپ دھوبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ برادری ان دنوں ''حقانی'' نسبت سے معروف ہے۔ آپ سمندری ضلع فیصل آباد کے گاؤں لشارن میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ آبائی گاؤں رانی والا، تحصیل ترن تارن، ضلع امرتسر تھا۔ وہاں سے ترکِ سکونت کر کے مولانا مرحوم کے والد لشارن آئے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد اس کے قریب ہی ۴۵۱ گ ب روپڑیاں میں منتقل ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی عالم نہیں، البتہ علم شناس تھے۔ امیر المجاہدین حضرت مولانا صوفی محمد عبداللہ سے خاص عقیدت و تعلق تھا۔ ان کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ حضرت صوفی صاحب مرحوم نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں فرزند عطا فرمایا، عبداللہ نام رکھا، جسے پھر اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث بنا دیا، جو انہتر سال تک مردہ دلوں کو منور اور علم و ادب کی شمع کو روشن کرتا رہا۔

ابتدائی مکتبی تعلیم سے فارغ ہوئے تو والدِ مرحوم نے دہلی میں وقت کے امام الموحدین حضرت مولانا عبدالوہاب صدری نور اللہ مرقدہ کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ مولانا عبدالوہاب، حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ احیائے سنت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا۔ بہت سی سنتوں کو انھوں نے زندہ کیا۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر دہلی شہر میں گائے کی قربانی کا آغاز کر کے استقامت کا جو مظاہرہ انھوں نے کیا، یہ ان کے اخلاص و للہیت کی بیّن دلیل ہے۔ انھی کے فرزندِ ارجمند حضرت الامام مولانا عبدالستار رحمہ اللہ سے اکثر و بیشتر

کتابیں پڑھیں اور بعض منتہی کتبِ احادیث کا درس حضرت مولانا عبدالوہاب رحمہ اللہ سے لیا۔ اسی نسبت سے جماعت غرباء اہلِ حدیث کے اکابرین کی نگاہ میں وہ بے حد محترم تھے اور وہ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا بڑے امام جی کے شاگرد ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم کے والد درزی تھے اور بحمد اللہ آسودہ حال تھے۔ آٹھ دس روپے ماہانہ خرچہ و اخراجات کے لیے دیتے اور ہونہار فرزند سے ملنے کے لیے جب بھی دہلی جاتے تو گھی کے علاوہ نقدی بھی دے کر آتے اور مولانا اپنی ضرورت اور پیٹ کاٹ کر اس سے اکثر و بیشتر کتابیں خرید لیتے۔ آج بھی ان کی بہت سی کتابوں پر ''عبدالرحمان نومسلم تاجرِ کتب صدر بازار دہلی'' کی مہر اس کا زندہ ثبوت ہے۔ خود مولانا مرحوم نے ایک بار فرمایا: ''جب میں فارغ ہو کر واپس لوٹا تو پیشگی والد صاحب کو آمد کی اطلاع دی اور ساتھ ہی لکھا کہ میرے پاس کتابیں ہیں، اس لیے بیل گاڑی کا انتظام ہو جائے تو آسانی رہے گی۔ چنانچہ جب میں گاؤں پہنچا تو وہاں کے لوگ کتابیں دیکھ کر ششدر رہ گئے اور میرے والد صاحب تھے کہ پھولے نہ سماتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد حضرت مولانا مرحوم کچھ عرصہ عربی ادب سیکھنے کے لیے حضرت مولانا مسعود عالم ندوی کے ہاں گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔ مولانا مسعود عالم برصغیر میں عربی ادب کے بہت بڑے ادیب تھے۔ اسی دوران میں وہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں بھی شریک ہوتے رہے۔

تعلیم و تعلم سے فارغ ہوئے تو اوکاڑہ کے قریب چک نمبر 12-R L میں حضرت میاں محمد باقر رحمہ اللہ کے حکم سے تشریف لے گئے۔ یہ گاؤں بلوچ برادری پر مشتمل ہے۔ حضرت میاں باقر صاحب رحمہ اللہ کے ان سے دیرینہ تعلقات تھے، ادھر حضرت مولانا مرحوم کے والدِ محترم کا بھی ان سے رشتۂ عقیدت تھا۔ اس بنا پر

انھوں نے اپنے تعلق داروں کی رشد و ہدایت کے لیے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا۔ آپ نے بھی وہاں بڑی تندہی سے تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ ایک ہلکا پھلکا مدرسہ بنایا اور قرب و جوار کے تشنگانِ علم و ادب کی علمی پیاس کا مداوا کیا اور یوں بیس پچیس سال اسی گاؤں میں بڑی خاموشی سے دین کی خدمت سرانجام دی۔ اسی دوران میں انھیں احادیث، رجال، تاریخ، اصولِ حدیث اور متداول کتبِ فقہ کے مطالعے کا موقع میسر آیا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ گاؤں میں زندگی کا قیمتی دور گزرا، تاہم وہاں مجھے مطالعے کا خوب موقع ملا۔

فیصل آباد میں تشریف آوری:

فیصل آباد، سابقہ لائل پور کے علاقے جھال خانوآنہ اوڈین سٹریٹ میں جناب میاں محمد یوسف مرحوم اور محترم میاں عبدالواحد ایک دین دار گھرانے سے تعلق رکھنے والے بزرگ ہیں اور ان کی دینی خدمات سے بھی احبابِ فیصل آباد خوب واقف ہیں۔ جب یہ علاقہ آباد ہوا تو اس پورے علاقے میں اہلِ توحید کی کہیں کوئی مسجد نہیں تھی۔ ۱۳۸۲ھ بمطابق ۱۹۶۲ء میں ان بھائیوں نے محلّہ جیلانی پور میں مسجد کے لیے جگہ خریدی اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ مسجد کی تعمیر کے اوائل ہی میں دونوں بھائی اس کی آبادی کے بڑے فکر مند ہوئے کہ کہیں بقولِ علامہ اقبال مرحوم ع

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ایسا نہ ہو کہ مسجد بن جانے کے باوجود اس کے نتائج و ثمرات ہم حاصل نہ کر پائیں۔ چنانچہ انھیں کسی ایسے خطیب اور عالم کی تلاش ہوئی جو یہ کام بحسن و خوبی

سر انجام دے سکے اور توحید اور کتاب و سنت کی آواز لوگوں تک پہنچا سکے۔ حضرت مولانا مرحوم کے ماموں جناب علم دین صاحب کی میاں صاحبان سے شناسائی تھی۔ انھوں نے فرمایا: فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، آپ میرے عزیز کو دیکھ سن لیں وہ ان شاء اللہ آپ کی امنگوں پر پورا اتریں گے۔ چنانچہ یوں ہی ہوا، آپ چک نمبر ۱۲ سے فیصل آباد تشریف لائے۔ میاں صاحبان آپ کی سادگی، للّٰہیت اور علم و فضل کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور انھوں نے آپ سے یہیں قیام کرنے کی پیش کش کر دی، جسے آپ نے قبول فرمایا اور یوں آپ نے یہاں خطابت اور رشد و ہدایت کے فرائض سر انجام دینے شروع کر دیے۔

ادارہ علوم اثریہ کا قیام:

محلّہ جیلانی پور کی یہی مسجد، مسجد کریمیہ اہلِ حدیث کو جہاں یہ شرف حاصل رہا ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کی وجہ سے یہاں وقتاً فوقتاً صاحبِ علم و عرفان حضرات تشریف لاتے اور لوگوں کے دلوں کو منور کرتے۔ چنانچہ حضرت میاں محمد باقر، حضرت صوفی محمد عبداللہ صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالستار محدث دہلوی، حضرت مولانا پروفیسر ابوبکر غزنوی، حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہم اللہ جیسے اعیان وہاں تشریف لاتے اور خوب مجلسیں جمتیں۔ وہاں اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ادارۃ العلوم الاثریہ کا آغاز بھی ۱۹۶۹ء میں اسی مسجد میں ہوا، جو آج بحمداللہ جماعت کا جانا پہچانا ادارہ ہے اور ”أصلها ثابت و فرعها في السماء“ کا مصداق ہے۔

اس ادارے کو اگر فکری اعتبار سے حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب اور مولانا محمد رفیق مدنپوری کی راہنمائی حاصل رہی تو علمی اور عملی طور پر حضرت مولانا محمد

عبد اللہ ﷫ نے اسے پروان چڑھایا۔ اپنا قیمتی کتب خانہ ادارے کے لیے وقف کر دیا، بلکہ تن من دھن سبھی کچھ ادارے کی بھلائی اور بہبود کے لیے لگا دیا۔ اس کے لیے بالاحجاب آپ اہلِ ثروت کے ہاں تشریف لے جاتے۔ ادارے کی اہمیت بتلاتے اور انھیں ادارے سے تعاون پر آمادہ کرتے، بلکہ ایک مرتبہ میں نے ان سے بطورِ شکوہ عرض کیا کہ آپ ان کے ہاں تشریف کیوں لے جاتے ہیں، ان کے ہاں جانے کے بجائے زیادہ وقت ہمیں دیا کریں تو بطورِ تفنن فرمایا:

آ ان جاواں تیرے بدلے میرا گلی وچ کم نہ کوئی

یعنی اہلِ ثروت کے یہاں جانا محض ادارے کے لیے ہے، ورنہ مجھے تو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ابتدا میں تو علمی طور پر ادارے کو آپ ہی کی سرپرستی رہی اور سب کچھ آپ کی نگرانی میں ہوتا تھا، مگر کچھ عرصے بعد آپ نے لغتِ حدیث کا موضوع لے لیا اور النہایۃ لابن الاثیر کا باقاعدہ درس دیا۔ یہ درس روایتی سبق نہیں ہوتا تھا، بلکہ پہلے حدیث کی مکمل تخریج ہوتی، پھر اس کی صحت وضعف پر بحث ہوتی، پھر اس کے معانی اور الفاظ کے اشتقاق پر دیگر کتبِ لغت کی روشنی میں بحث ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ''منبر'' پر گفتگو چل نکلی تو اس کے معنی کے ضمن میں ''منبر'' کی پوری تاریخ بیان کر دی۔ جانور کی عمر کے مطابق علاحدہ علاحدہ جو نام احادیث اور کتبِ لغت میں ہیں، ان کی تحقیق وتفتیش کے لیے تو ہمیں میلہ منڈی مویشیاں میں لے گئے اور عیاں را چہ بیاں کے مصداق فقہ اللغۃ پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ دکھایا کہ یہ حِقہ ہے۔ یہ بنت لبون، یہ بنت مخاض، یہ جذعہ اور یہ مسنّہ وغیرہ ہے۔ واپسی پر مسجد میں پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ نمازی ترچھی نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگے تو انھوں نے فرمایا: ہم سیر اور جانور دیکھنے کے لیے نہیں، بلکہ عملی طور پر کچھ

سیکھنے کے لیے وہاں گئے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کا عملی ذوق کیا تھا اور طریقۂ تعلیم کیسا تھا۔

تخریجِ حدیث ان کا خاص موضوع تھا اور احادیث کو تلاش کرنے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ دورانِ تعلیم میں نے دیکھا کہ مشکاۃ المصابیح سے حدیث نکالنے میں انھوں نے اس کی فہرستِ ابواب کی شاذ و نادر ہی ضرورت محسوس کی، جب بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی بسم اللہ پڑھ کر مشکاۃ شریف کو اٹھایا، ایک انداز سے کھولا، ایک دو ورق اِدھر سے اُدھر کیے اور فرمایا: لیجیے حدیث یہ ہے، بلکہ اکثر و بیشتر صحاح ستہ سے روایت نکالنے کا بھی یہی انداز تھا، البتہ مسند امام احمد اور موطا وغیرہ کی احادیث کے لیے آپ ''مفتاح کنوز السنۃ'' سے مدد لیتے۔

حدیث میں ان کی معلومات ہی کا نتیجہ تھا کہ مختلف علمائے کرام اس سلسلے میں آپ سے رجوع کرتے۔ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کو آپ سے دیرینہ تعلق تھا، وہ بھی کئی بار روایات کی تلاش میں آپ کو لکھتے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک مکتوب میں انھوں نے ''إن أهل نجد أخبروا رسول الله ﷺ أن رؤيتهم تقدم رؤية أهل المدينة بيوم فقال لأهل كل بلد رؤيتهم'' نیز ''كان يكره التصنع كله'' اور ''كان صوت رسول الله ﷺ يبلغ ما لا يبلغ صوت غيره'' کے بارے میں استفسار کیا، اس کا انھوں نے کیا جواب دیا، اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

یادش بخیر: فیصل آباد کے مولانا محمد انور کلیم صاحب دیوبندی علما میں اپنی سنجیدگی، متانت و شرافت میں جانے پہچانے عالمِ دین ہیں، وہ اکثر و بیشتر حضرت مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ''مفتاح کنوز السنۃ'' کی مدد سے احادیث

تلاش کرنے کا طریقہ انھوں نے مولانا مرحوم سے سیکھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ذکر کیا کہ مولانا ضیاء القاسمی صاحب حج سے واپسی پر یہی کتاب لائے، میں ان کے ہاں حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا: یہ عجیب کتاب ہے، احادیث کا انڈیکس ہے۔ علمائے کرام کی ترتیب سے میں یہ کتاب لے تو آیا ہوں، مگر اس کے رموز و اشارات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ مولانا کلیم صاحب نے فرمایا: اس کو خود میں نے حضرت مولانا عبداللہ صاحب سے سمجھا ہے۔ میں یہ عقدہ حل کر دیتا ہوں، چنانچہ انھوں نے مولانا قاسمی صاحب کی اس مشکل کو سہل بنا دیا۔

اہلِ علم بخوبی واقف ہیں کہ ''مفتاح کنوز السنۃ'' دراصل ''المعجم المفہرس'' کا اختصار ہے۔ جب یہ کتاب بازار میں نئی نئی آئی تو بڑی گراں تھی، مگر مولانا مرحوم نے قیمت کی پروا کیے بغیر فی الفور اسے ادارے کے لیے خرید لیا۔ جن دنوں اس ناکارہ نے ''العلل المتناهية'' کی تخریج و تصحیح کی، علامہ ابن جوزی نے اس میں جو روایات تاریخ بغداد اور حلیۃ الاولیاء کی ذکر کی ہیں، ان کو تلاش کرنے میں سند کے ایک ایک راوی کا ترجمہ تاریخِ بغداد اور حلیۃ الاولیاء میں دیکھنا پڑتا۔ یہ کام جب تکمیل کے آخری مراحل کو پہنچا تو مولانا مرحوم نے حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف۔ مرحوم سے ان دونوں کتابوں کی فہرست لا کر مجھے دی اور فرمایا: لیجیے تمھارا کام بھی آسان ہو گیا۔ میں نے عرض کیا: کاش یہ ابتدا ہی میں مل جاتی تو یہ کام کب کا مکمل ہو چکا ہوتا۔ اب تو ان دونوں کتابوں کی مکمل فہارس دستیاب ہیں، ان سے اب نہ راوی تلاش کرنا کوئی مسئلہ ہے نہ ہی کوئی حدیث۔ والحمد للہ علی ذلك.

مولانا مرحوم عمرہ یا حجِ بیت اللہ کے لیے دو تین بار تشریف لے گئے تو وہاں بھی سب سے بڑی کوشش ادارے کے لیے کتابوں کے حصول کی رہی۔ آخری بار

جب آپ تشریف لے گئے، تب بھی آپ نے ادارے کے لیے گیارہ کارٹونوں میں کتابیں بذریعہ بحری جہاز بھجوائیں۔ ''جامعہ ام القریٰ'' کے منتظمین سے مل کر ادارے کی اہمیت انھیں باور کرائی تو ان سے بھی کتابیں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ الغرض آپ جہاں بھی ہوتے، ادارہ علوم اثریہ ہی آپ کا موضوع ہوتا۔

علم و فضل اور علمی خدمات:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ علم اور قوتِ حفظ سے نوازا تھا۔ ہزاروں احادیث آپ کی نوکِ زبان پر تھیں۔ تاریخ و رجال آپ کا خاص موضوع تھا، دورانِ درس جب کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ چل نکلتا تو یوں محسوس ہوتا کہ آپ ''جمہرۃ انساب العرب'' اور ''نسب قریش'' کے حافظ ہیں، عربی اشعار ہی نہیں، اردو، فارسی، بلکہ پنجابی کے بے شمار اشعار آپ کو حفظ تھے۔ ہیر وارث شاہ کے اشعار بڑے سوز سے پڑھتے، چاہتے تو آدھا آدھا گھنٹہ زبانی پڑھتے چلے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فقہی بصیرت بھی عطا فرمائی تھی۔ مشکل مسائل کا حل چٹکیوں میں پیش کرتے۔ پاکستان بن جانے کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے چاہا کہ مشکاۃ کی شرح لکھی جائے تو اس کے لیے ان کی نظرِ انتخاب نے دو حضرات کو منتخب کیا: ایک انھی کے تلمیذِ رشید حضرت مولانا محمد صدیق سرگودھوی اور دوسرے ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ۔ حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ نے مولانا مرحوم سے فرمایا کہ شرح کے لیے مراجع کی فہرست آپ بنا کر لائیں۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں وہ فہرست بنا کر دو دن بعد جب لاہور ان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کتابوں کے بغیر شرح لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر بڑے ہی تاسف سے فرمایا کہ میں اور مولانا محمد صدیق صاحب اسی غرض کے لیے پروگرام کے

مطابق دو مرتبہ حافظ صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر سارا دن ان کے اپنے مشاغل میں بیت جاتا۔ جس کام کے لیے ہم جاتے، اس کی طرف توجہ ہی نہ دے سکے۔ جس کے بعد میں نے جانا موقوف کر دیا اور یوں یہ بنا بنایا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

آپ کے علم و فضل ہی کا نتیجہ تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے آپ کو اپنے منبر پر خطبہ جمعہ دینے کا فرمایا۔ مولانا مرحوم نے بتلایا کہ پاکستان بننے سے پہلے ایک مرتبہ جمعہ کے روز مجھے امرتسر جانے کا اتفاق ہوا، میں نے چاہا کہ آج جمعہ حضرت مولانا امرتسری کے ہاں پڑھوں گا، چنانچہ میں بروقت ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے فرمایا: مولوی عبداللہ آج جمعہ آپ پڑھائیں گے۔ میں نے انکار کیا، مگر میرے انکار پر ان کا اصرار غالب آیا تو مجھے جمعہ پڑھانا پڑا۔ جب میں خطبے کے لیے منبر پر بیٹھا تو چپکے سے حضرت مولانا امرتسری بھی منبر کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے توحید کے عنوان پر خطبہ دیا، دورانِ خطبہ میں نے ذکر کیا کہ حجِ بیت اللہ کے لیے میں جب حاضر ہوا تو وہاں امامِ حرم شیخ حمید سے بھی ملاقات ہوئی، اسی مجلس میں حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی بھی تشریف فرما تھے۔ محدث روپڑی کا نام سن کر مولانا امرتسری نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں نے ذکر کیا کہ اسی مجلس میں شیخ حمید نے مولانا روپڑی سے پوچھا کہ آپ غارِ حرا میں بھی تشریف لے گئے ہیں؟ تو انھوں نے اثبات میں جواب دیا، جس پر شیخ حمید نے فرمایا: ''فأین التوحید؟'' یہ جملہ سن کر مولانا امرتسری بھی مسکرا پڑے۔

بہت کم حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم نے

مشہور کتاب ''سیرۃ المصطفیٰ'' پہلے حضرت مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ کے اخبار ''اہلِ حدیث'' امرتسر میں طبع ہوئی، پھر اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اسی کتاب میں مولانا سیالکوٹی رحمہ اللہ نے ایک بڑے نازک مسئلے پر بحث کی اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے موقف کی خوب ترجمانی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین بھی دینِ حنیف پر تھے، موحد اور ''مسلمان'' تھے۔ مگر جمہور علمائے امت کی رائے اس کے برعکس ہے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ نے اسی مضمون کے بارے میں لکھا تھا کہ سیرت کے مضمون کے لیے اس بحث کی ضرورت نہیں۔ تاہم مولانا سیالکوٹی نے اس بحث کو جاری رکھا اور یہ مضمون ۱۹۴۱ء میں بدستور ''اہلِ حدیث'' میں طبع ہوتا رہا۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ نے لکھا جو ''اہلِ حدیث'' (امرتسر) میں ۲۹/ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹/ دسمبر ۱۹۴۱ء کے (ص: ۱۶۔۱۸) میں طبع ہوا۔ جس میں انھوں نے ثابت کیا کہ یہ عقیدہ متقدمین اہلِ سنت کا قطعاً نہیں، بلکہ رفض و شیعیت سے درآمد شدہ ہے اور صحیح وصریح احادیث کے مخالف و معارض ہے۔ اس مضمون میں مولانا مرحوم نے حسبِ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا: صحیح مسلم، نسائی، ابو داود، مسند طیالسی، ابن ماجہ، مسند امام احمد، کتاب التوحید لابن خزیمہ، کتاب السنہ لعبداللہ بن احمد، زاد المعاد، منہج السنہ، ذکر النار للنواب، شرح فقہ اکبر، دلائل النبوۃ للبیہقی، الاسماء والصفات للبیہقی، موضوعات کبیر، تذکرۃ الموضوعات، تفسیر جامع البیان، جلالین، البدایہ لابن کثیر۔ نیز انھوں نے اس میں ذکر کیا کہ علامہ علی قاری نے علامہ سیوطی کے برعکس ایک مستقل رسالہ اس پر لکھا ہے۔ مولانا مرحوم نے ذکر کیا کہ مولانا امرتسری نے بعد میں خود اس مضمون کی تحسین کی اور اس کو شائع کرتے وقت یہ الفاظ بھی لکھے:

''میں اس مسئلہ کو زیرِ بحث لانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے میں نے اشارتاً

بلکہ صراحتاً لکھا تھا کہ سیرت کے مضمون کے لیے اس بحث کی ضرورت نہیں، لیکن مولانا سیالکوٹی نے کسی مصلحت سے اس کو طول دینا ہی مناسب سمجھا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا کہ بعض احباب نے مجھ پر آوازے کسے اور بعض نے مداہن کہنا شروع کیا۔ اس لیے فریقِ ثانی کے خیالات بھی درج کرنے لازم ہو گئے۔ تاہم میں اس بحث کو طول نہیں دوں گا۔ پس فریقین کے خیالات اور مقالات کا شائع ہو جانا کافی ہے۔''

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی اس بات کے غماز ہیں کہ مولانا مرحوم نے اپنے مضمون میں جمہور کی ترجمانی باحسن انداز کر دی اور اسی کو انھوں نے کافی وشافی سمجھا۔ وللہ درھم!

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نور اللہ مرقدہ نے مئی ۱۹۴۹ء میں لاہور کے ایک ماہنامے ''اسلامی زندگی'' میں منکرینِ حدیث کی تردید میں ''ظن کے اصطلاحی معنی'' کے عنوان پر ایک مضمون لکھا تو علامہ تمنا عمادی نے لاہور کے ایک اور ماہنامے ''لبیان'' میں اس کو ہدف بحث بنایا اور اس کے بعض مباحث پر تنقید کی، جس کا جواب حضرت سلفی مرحوم نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے چھے شماروں میں دیا، جس کا عنوان تھا: ''مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ'' جو مارچ ۱۹۵۰ء کے شمارں میں شائع ہوا۔ ہمارے شیخ مولانا محمد عبداللہ مرحوم نے بھی علامہ تمنا عمادی کے مضمون پر گرفت کی اور علمی انداز میں تمنا صاحب کے افکار کا تجزیہ کیا جو ''الاعتصام'' کی ۲۱ اور ۱۸ر اپریل ۱۹۵۰ء کی دو اشاعتوں میں ''مولانا تمنا کے مضمون پر ایک اور تعاقب، رجالِ حدیث سے متعلق ایک مفید بحث'' کے عنوان پر شائع ہوا۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیری صاحب سے سبھی اہلِ علم واقف ہیں۔ ''فیض الباری''

کے نام سے ان کی شرح بخاری بھی معروف ہے۔ مولانا محمد عبداللہ مرحوم نے ایک بار "فیض الباری کے دو مقام" کے عنوان پر مضمون لکھا، جو ۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کے "الاعتصام" میں شائع ہوا۔ ان دونوں مضامین کا تذکرہ حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم نے تفصیل سے حضرت مولانا مرحوم کے حالات سے بھی کیا جو "کاروانِ سلف" میں شائع ہوا ہے۔

مولانا مرحوم نے علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی "الدرر البهية" کی تخریج کی اور اس پر مختصر مفید حاشیہ لکھا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فقہی انداز میں اسے مرتب کیا اور کسی بھی حدیث کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ مولانا مرحوم نے پہلے اسے اپنے قلم سے نقل کیا، پھر فقہی ترتیب پر مرتبہ اسی مجموعہ کو قرآن پاک کی متعلقہ آیت یا حدیث سے مدلل کیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اسے طبع کر کے اہلِ حدیث مدارس میں بطورِ نصاب پڑھایا جائے، مگر ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

افسوس کہ اس کا ایک حصہ ان کے کتب خانہ کو ایک دوبار اِدھر اُدھر منتقل کرنے میں ضائع ہوگیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

"العلل المتناهية" اور مسند امام ابی یعلی الموصلی کی تصحیح اور تخریج میں بھی مولانا مرحوم نے راقم سے بھرپور تعاون فرمایا۔ جہاں کہیں روایت کی تلاش میں مشکل پیش آتی۔ مولانا اسے باتوں باتوں میں حل کر دیتے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ مسند ابی یعلی کے قلمی نسخوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مسند غائب ہے۔ مولانا نے چاہا کہ حتی الامکان اس خلا کو پورا کیا جائے اور مسند ابی یعلی کے حوالے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات کو جمع کیا جائے۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں المسند الکبیر

لابی یعلی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات نقل کی ہیں اور کنز العمال میں بھی ان کی روایات مسند ابی یعلی کے حوالے سے منقول ہیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے کنز العمال کی چند جلدوں میں دیکھ ڈالی۔ البتہ مجمع الزوائد کے نصف سے انھوں نے اور نصف حصے سے راقم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات جمع کیں۔ دیگر کتب کو بھی کھنگالا اور یوں ۴۹ احادیث کے مجموعہ کا اس میں مفید اضافہ ہوا، جسے تمام اربابِ علم و فضل نے پسند کیا۔

کتب خانہ:

مولانا کی عظیم یادگار ان کا علمی کتب خانہ ہے، جو تفسیر، حدیث، رجال، تاریخ، سیرت اور ادب کی نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں امام سیبویہ کی ''الکتاب'' ہے تو وہ اسے دیکھنے اور اس سے استفادہ کے لیے مولانا کے ہاں چک نمبر ۱۲ میں تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ بھی گاہے بگاہے اسی سلسلے کے لیے مولانا کے پاس تشریف لے جاتے اور آپ کے کتب خانہ سے استفادہ کرتے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم بھی آپ سے کتابیں طلب کرتے تھے۔ جب مولانا ملتان جیل میں تھے تو علامہ خطابی کی ''معالم السنن'' آپ سے منگوائی۔ اس کے بعض مقامات پر سرخ پنسل سے نشان بھی لگائے، انھیں دیکھ کر خود مولانا مرحوم خوش ہوتے تھے۔ ''تفہیم القرآن'' کی آخری جلد جب مولانا مودودی مرحوم لکھ رہے تھے، تب بھی انھوں نے آپ سے کتابیں طلب کیں۔ چنانچہ آپ کے ہمراہ راقم اور مولانا محمد خالد سیف حفظہ اللہ بھی تھے اور انھیں تفسیر عزیزی کا آخری حصہ، فتح القدیر للامام الشوکانی، تفسیر معوذتین للامام ابن قیم رحمہ اللہ، تفسیر سورۂ اخلاص لشیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ دے کر آئے۔ مولانا مودودی مرحوم سے بالمشافہ یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ مولانا نہایت خوبصورت اور وضعدار

شخص تھے۔ ان کے دفتر سے باہر واپسی پر جب میں نے اس کا ذکر مولانا مرحوم سے کیا تو چلتے ہوئے ان کے قدم رک گئے۔ میری طرف رخ کر کے فرمایا: ''چھڈ وئے، جے تو شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ نوں ویکھ لیندا تے تیریاں پکھاں اتر جاندیاں''

اسی مجلس میں مولانا مودودی مرحوم نے ''معالم السنن'' کا ذکر بھی کیا اور فرمایا کہ ''تفہیم القرآن'' کی طرز پر میں نے ''سنن ابی داود'' کا انڈیکس تیار کیا ہے کاش! کوئی صاحب ابو داود کا ترجمہ اور اس کی روایات کی ترقیم کر دے تو اس کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا جائے۔

کچھ اور تذکرے:

حضرت مولانا مرحوم کو علم و فضل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حلم اور صبر و تحمل سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا، بہت کم غصے میں آتے۔ جو شخص نالائقی کرتا تو آپ خاموشی اختیار کرتے، بلکہ مسکرا کر فرماتے بھائی میں تو ''نقشبندی'' ہوں۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ انھیں رفیقۂ حیات ایسی ملی، جن کی طبیعت بڑی جلالی تھی اور بیماری اس پر مستزاد تھی، جس نے طبیعت میں چڑچڑا پن بھی پیدا کر دیا تھا، مگر مولانا نے زندگی بھر وفا کی اور گھر کے ماحول میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔ احباب کے کہنے کے باوجود دوسری شادی کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں ایک بار اسی کا تذکرہ اس ناکارہ نے بھی کیا تو فرمانے لگے: کیا تم نے حدیث نہیں پڑھی: «خیرکم خیرکم لأھلہ» تو میں خاموش ہو گیا اور اسی کے ساتھ ایک حکایت بھی سنائی کہ ایک شخص نے کسی کی بزرگی کے بارے میں سنا تو ان کی ملاقات کے لیے چل نکلا۔ ان کے گھر پہنچا، دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ان کی اہلیہ نے بڑی ترشی سے کہا: کون ہے؟ اس نے اپنی آمد کا ذکر کیا تو خاتونِ خانہ نے اپنے خاوند کے بارے میں جلی کٹی باتیں کہیں اور

کہا: وہ صبح سے لکڑیاں لینے گیا ہے، ابھی تک واپس نہیں آیا، میں اس کے انتظار میں ہوں۔ وہ صاحب باہر ان کی تلاش میں نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شیر پر سوار لکڑیوں کا گٹھا رکھے آ رہے ہیں۔ دیکھ کر حیران رہ گیا، ایک طرف یہ حالت ہے، ادھر گھر والوں کا حال یہ تھا دل کی بات اس بزرگ سے کہہ دی تو وہ فرمانے لگے: بھائی میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں، شاید اسی بنا پر جانوروں کو بھی اللہ تعالیٰ نے میرا مطیع بنا دیا ہے۔

بلاشبہ مولانا اسی واقعہ کی ایک تصویر تھے، انھوں نے عمر بھر اپنی اہلیہ کی خدمت کی۔ حج بیت اللہ کے لیے ساتھ لے گئے اور ہر اہم مقام پر ساتھ ہو کر مناسکِ حج ادا کیے۔ اہلیہ کا انتقال ہوا تو مولانا کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے دو فرزند عبیداللہ اور شکیب انتقال کر گئے۔ مولانا نے اس صدمے کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ بازار میں راہ چلتے ایک سکوٹر والا آپ سے ٹکرا گیا۔ پاؤں کی پچھلی جانب ٹخنے کے قریب زخم آیا، شوگر کے مریض تھے۔ تکلیف تقریباً چھے ماہ تک رہی، مگر مجال ہے کبھی حرفِ شکایت بھی زبان سے نکلا ہو۔ میں نے عرض کی: آپ نے اس سکوٹر والے کو پکڑا نہیں؟ فرمانے لگے: ''بھائی میں ''نقشبندی'' ہوں، میں نے اسے معاف کر دیا۔''

حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ مرحوم کا مولانا مرحوم سے بڑا پیار تھا اور وہ ان کے انتہائی قدر دان تھے۔ تاہم بشری تقاضے کے مطابق کبھی مولانا چیمہ مرحوم پر اپنے علم و فضل کے علی الرغم چیمہ پن غالب آ جاتا تو وہ مولانا مرحوم سے بھی الجھ پڑتے۔ ایک بار اسی نوعیت کے ایک واقعہ پر مولانا مرحوم سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور مولانا چیمہ مرحوم کے رویے کی بنا پر ادارے میں آنا جانا موقوف کر دیا، جس کا اس ناکارہ کو بڑا افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ منت سماجت کی، مگر مولانا مرحوم نہ مانے۔ فرمایا: ''مجھے چیمہ

صاحب نے بڑا ستایا ہے۔'' میں نے اس کا ذکر مولانا چیمہ مرحوم سے کیا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اسی دوران میں ادارے کا ایک اجلاس ہونا طے پایا۔ لاہور سے مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم اور مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی تشریف لائے، ماموں کانجن سے قاضی محمد اسلم سیف صاحب اور مولانا عبدالقادر ندوی بھی پہنچ گئے، مگر نہیں پہنچے تو اجلاس کے میرِ مجلس نہیں پہنچے۔ جس کا خلا سبھی حضرات نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اچانک مولانا چیمہ صاحب اٹھے اور بغیر کچھ کہے اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ دس، پندرہ منٹ ہی بڑی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ ہم نے دیکھا کہ مولانا چیمہ صاحب، حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ سب حضرات میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اجلاس ختم ہوا۔ مولانا کی کبیدہ خاطری دور ہو چکی تھی۔ ادارے میں آنا جانا شروع کر دیا۔ میں نے ایک روز باتوں باتوں میں پوچھ ہی لیا کہ حضرت آپ تو گویا اجلاس میں آنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے! فرمایا: میرا آنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اپنی مسجد میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا کہ چیمہ صاحب آ گئے اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے: ''لڑائی کر لی، اس لڑائی میں میرا اور آپ کا نہیں، ادارے کا نقصان ہے۔ حضرات آئے بیٹھے ہیں وہ کیا کہیں گے۔'' یہ سن کر میرے لیے مجالِ انکار نہ رہی اور اجلاس میں شرکت کے لیے چلا آیا۔

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے لحنِ داودی عطا فرمایا تھا۔ آپ بڑی عمدگی سے قرآن مجید پڑھتے۔ بسا اوقات نماز میں قرآن مجید پڑھتے تو دل چاہتا کہ آپ پڑھتے ہی چلے جائیں۔ اسی خوبی نے حضرت مولانا محمد داود غزنوی کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا تعلق مولانا غزنوی کے فرزند مولانا ابوبکر غزنوی سے تھا۔ ایک مرتبہ لاہور گیا تو رات مدرسہ غزنویہ میں گزاری۔ صبح ہوئی تو نمازِ فجر کے بعد مولانا

غزنوی رحمہ اللہ کی آمد میں تاخیر محسوس کر کے مولانا ابوبکر نے مجھے نماز پڑھانے کا کہا چنانچہ میں نے نماز پڑھائی۔ نماز کے دوران میں حضرت غزنوی رحمہ اللہ بھی تشریف لے آئے۔ نماز سے فراغت کے بعد مولانا ابوبکر رحمہ اللہ سے فرمایا: یہ نماز پڑھانے والے کون ہیں؟ تو انھوں نے جواباً عرض کی کہ یہ میرے دوست ہیں۔ حضرت غزنوی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس عمدگی سے قرآن مجید پڑھنے والے آپ کے دوست ہیں تو یہ آج سے میرے بھی دوست ہیں۔

گولڑہ شریف کے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب سے ایک زمانہ واقف ہے۔ حضرت مولانا مرحوم حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو بحری جہاز میں ایک مرتبہ پیر صاحب کے فرزند اور جانشین پیر غلام محی الدین، جنھیں عقیدت مند محبت سے باؤجی کہتے تھے، کو حضرت مولانا کے پیچھے نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے پیچھے نماز پڑھی اور نقد دل ہی ہار بیٹھے۔ مولانا مرحوم سے تعارف ہوا تو انھوں نے فرمایا: آج سے میرے آپ مہمان ہیں اور سفر میں میری نمازوں کے امام ہیں۔ چنانچہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں مولانا ان کے مہمان اور امام بنے رہے اور انھوں نے اپنے باورچی کو ہدایت کر دی کہ کھانا مولانا کی پسند کے مطابق تیار کیا کریں۔

حضرت مولانا صحیح معنوں میں عالم ربانی تھے۔ باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام فرماتے۔ ادارے کی میٹنگ ہو یا کوئی بھی اہم اجلاس نماز کا وقت ہوتا تو مولانا بلا تاخیر چپکے سے نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔ مرحوم مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب بسا اوقات اجلاس کی اہمیت کی بنا پر کہہ دیتے کہ جماعت میں تاخیر کر لیتے ہیں تو وہ اسے ناپسند کرتے اور فرماتے نماز سب کاموں سے مقدم ہے۔ اسی طرح شب خیزی بھی ان کی ہمیشہ سے عادت تھی۔ سفر ہو کہ حضر، رات کے جس حصے میں

ہوتے صبح بروقت بیدار ہوتے۔ تہجد ادا کرتے اور اپنے رب سے مناجات کرتے۔ "یاحي یا قیوم لا إلٰه إلا أنت برحمتك أستغیث" ان کا خاص وظیفہ تھا۔ درود شریف بھی باکثرت پڑھتے۔ ایک بار تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا کہ میری صبح کی سنتیں کبھی قضا نہیں ہوئیں۔ ہمیشہ انھیں بروقت ہی ادا کیا۔ دعا کرنے میں ان کا خاص ڈھب تھا۔ اس سلسلے میں وہ حضرت صوفی محمد عبداللہ رحمہ اللہ کے طریقے کے مطابق بڑی لمبی دعا کرتے۔ آدھا آدھا گھنٹہ دعا کرنے میں لگ جاتا۔ آج کتنے حضرات ہیں جو ان کی دعاؤں کو ترستے ہیں۔

مولانا بڑے وضعدار بزرگ تھے، ان کے پڑوس میں ایک جلد ساز تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ جلد ساز نہیں، بلکہ "کتاب مار" تھا۔ جلد سازی کا پورا سامان بھی اس کے پاس نہ تھا۔ مولانا مرحوم کو اس کی بنائی ہوئی جلد بھی اتنی پسند نہیں تھی، مگر مولانا جب خود جلد بنوانے کے لیے کتاب لے کر گھر سے نکلتے تو اسی جلد ساز کو کتاب دے آتے۔ یہ ناکارہ اس سلسلے میں ان سے احتجاج کرتا تو فرماتے: بھائی خود لے جایا کرو اور جس سے چاہو جلد بنوالو۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ جلد ساز غریب آدمی ہے، میرے پڑوس میں ہے، اس کے پاس سے گزر کر جلد بندی کے لیے کتاب اٹھا کر لے جانا میرے بس میں نہیں۔

مولانا کے پاس معلوم نہیں کیا عمل تھا۔ حج کے لیے تشریف لے جاتے تو واپسی پر آپ کے بعض احباب اپنا "بارگراں" ان کے سپرد کر دیتے۔ مولانا مرحوم تھے کہ اپنی وضعداری میں خاموش رہتے۔ کراچی پہنچتے تو بڑے وقار و احترام سے کسٹم کے ملازم آپ کا سامان باہر لا کر رکھ دیتے۔ آفیسر حضرات تو گویا انھیں دیکھتے ہی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ چائے پلاتے اور آپ کے سامان کو باہر بھجوانے کا انتظام کر

د ہے۔ بہت کم حضرات کو علم ہے کہ دار الاحسان اور پھر دالو وال کے جناب صوفی برکت علی صاحب نے ''ترتیب شریف'' اور ''اسماء النبی ﷺ'' کا جو مجموعہ شائع کیا اس کا خاکہ بنانے والے پھر اس میں رنگ بھرنے والے ہمارے مولانا مرحوم ہی تھے۔ محترم صوفی صاحب کو ان سے خاص انس تھا اور وہ آپ کے بڑے قدر دان تھے۔ مولانا جب بھی ان کے ہاں تشریف لے جاتے وہ بڑے تپاک سے ملتے۔ نماز کا وقت ہو جاتا تو آپ ہی کی اقتدا میں نماز پڑھتے اور واپسی دور تک الوداع کرنے کے لیے نکلتے۔ مولانا کی اہلیہ اور فرزندوں کا انتقال ہوا تو جناب صوفی صاحب تعزیت کے لیے مولانا کے ہاں تشریف لائے اور دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے۔ مولانا بڑے وسیع الظرف اور اپنے پہلو میں کشادہ دل رکھتے تھے۔ اہلِ حدیث ہی نہیں، بلکہ اہلِ حدیث گر تھے، مگر دوسرے مسلک کے اکابر و علما کا برابر احترام کرتے۔ مولانا ارشد القادری صاحب جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ نے ''بریلوی مذہب اور اسلام'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، وہ مولانا کی خدمت میں کتاب لے کر گئے۔ کتاب پیش کی تو فرمایا: یہ آپ نے کیا لکھ مارا ہے۔ انھیں دراصل کتاب اور اس کے موضوع سے نہیں، بلکہ اس کے نام سے اختلاف تھا۔ وہ دلائل سے اختلاف کرنے کے قائل تھے، لٹھ مارنے کے نہیں۔ مسجد کریمیہ اہلِ حدیث کی تعمیر مکمل ہوئی۔ تو اس کے سامنے کی دیوار پر بعض احادیث لکھوائیں۔ مثلاً: « لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب »، « إذا أمن الإمام فأمنوا »، « رفع اليدين من زينة الصلاة »، « وضع اليمنىٰ على يده اليسرىٰ على صدره ».

ایک بار مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل آپ سے ملنے کے لیے مسجد کریمیہ میں تشریف لائے تو احناف اور اہلِ حدیث کے مابین اختلافی مسائل پر بھی

روایات کو مسجد کی سامنے کے دیوار پر لکھا ہوا دیکھ کر کہنے لگے: مولانا! یہ آپ نے کیا کیا؟ تو آپ نے فرمایا: مفتی صاحب یہ احادیث دراصل ہم نے اپنی مسجد حنفی بریلوی حضرات کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے لکھی ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ اہل توحید کی مسجدوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ ہم نے امتیاز اور نمایاں اختلاف پر ان احادیث کو لکھ کر اپنی مسجد کا تحفظ کرنا چاہا ہے کہ اگر کوئی ایسی نالائقی کرے تو بوقت "عیاں راچہ بیاں" کے مطابق بتلا سکیں کہ یہ مسجد اہلِ حدیث کی ہے۔ یہ سن کر مفتی صاحب خاموش ہو گئے۔

مولانا مرحوم نے ایک بار بڑی رازداری سے فرمایا کہ جھال پر ایک بریلوی میری بڑی مخالفت کرتا تھا، مولانا نے اس کا نام بھی لیا، مگر افسوس کہ لوحِ حفظ سے وہ نام بھول گیا۔ ایک بار وہ میرے پاس آیا، معذرت کی اور میری مخالفت ترک کر دی۔ میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے بتلایا کہ چند دن ہوئے مجھے خواب آیا کہ جھال پر نبی کریم ﷺ تشریف لائے ہیں۔ ایک انبوہِ کثیر آپ کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے اور آپ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چلے جا رہے ہیں۔ مگر جب میں زیارت کے لیے آگے بڑھتا ہوں تو مجھے کہا جاتا ہے کہ تو بڑا گستاخ ہے، تم زیارت نہیں کر سکتے۔ اسی کسمپرسی میں میری آنکھ کھل گئی تو میں غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ حقیقت دیکھ لینے کے بعد اب مجھے آپ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ جناب برق التوحیدی صاحب نے ذکر کیا کہ وہ شخص مولانا مرحوم نے مجھے دکھایا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کا مقتدی اور ہمیشہ کے لیے قدر دان بن گیا۔

۱۹۸۳ء میں جب آپ حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو جاتے ہوئے اپنی بہو سے فرمایا: بیٹا دیکھو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ

آپ کو چاند سا بیٹا عطا فرمائیں گے، اس کا نام عبدالرحمان رکھنا، لیکن میں نے واپس نہیں آنا، مولانا کو دراصل اپنے چھوٹے بیٹے سے کبیدگی تھی۔ وہ اسی عزم سے گئے تھے۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا، میرا اللہ نگہبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بشرطِ واپسی حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب امام جماعت غربائے اہلِ حدیث سے وعدہ کرلیا تھا کہ آیندہ چھے ماہ فیصل آباد ادارہ علومِ اثریہ میں اور چھے ماہ جامعہ ستاریہ کراچی میں درسِ حدیث دوں گا۔ مگر کسے معلوم تھا کہ آیندہ تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ہی آپ اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ جائیں گے۔

ادارہ علومِ اثریہ کا آغاز ہوا تو اس کا پہلا سال بڑا کسمپرسی کے عالم میں گزرا۔ یاد رہے ہے تو پکانے کے لیے تمام ضروریات موجود نہیں۔ ان ایام میں مولانا خود کبھی کبھی آتے جاتے بعض اہلِ محلہ سے خور ونوش کی اشیا اٹھا کر لے آتے۔ کھانے کا وقت ہوتا تو تنور سے روٹی لے آتے اور ہمارے ہمراہ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے اور اس میں کسی قسم کی عار محسوس نہ کرتے اور کبھی نام ونمود کی خواہش نہ کی۔ ساری زندگی فقیرانہ اور درویشی میں گزری۔ تصنع اور تکلف سے ان کی زندگی یکسر خالی تھی۔ وہ بعض جلسوں میں میرِ مجلس ہوتے۔ مدارس میں سال کے اختتام پر مختلف مقامات پر بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیتے۔ ماموں کانجن کانفرنس کی صدارت ہو یا صبح کا درس یا مرحوم صدرِ پاکستان ضیاء الحق کی مشائخ کانفرنس ہو، ہر جگہ اپنی فقیرانہ سج دھج قائم رکھتے اور کسی بھی جگہ کرّ وفر کا مظاہرہ نہ کرتے۔ تصنع اور بناوٹ نام کا لفظ ان کی لغت سے خارج تھا۔ ہمیں ایک بار فرمایا کہ تم سعودیہ عربیہ میں خط لکھتے ہو، مگر واپسی پتہ میں ''جھال خانوآنہ'' نہ لکھنا، بلکہ اس کے بجائے ستیانہ روڈ لکھنا، کیوں کہ عربی لوگ جھال کو ''جہّال'' پڑھیں گے۔ انھیں کیا معلوم کہ جھال کیا ہوتی ہے۔

حضرت مولانا مرحوم قرآن مجید بڑے سوز وگداز سے پڑھتے۔ اچھی آواز اور تجوید سے پڑھنے والوں سے قرآن مجید وقتاً فوقتاً سنا کرتے۔ قاری عبدالباسط کی تلاوتِ قرآن پاک کی کیسٹ بڑے شوق و ذوق سے سنتے، بلکہ ایک بار مولانا برق توحیدی صاحب سے فرمایا: میری وصیت یاد رکھنا جب میرا آخری وقت قریب آجائے، تمھیں پتا چلے تو فوراً قاری عبدالباسط کی تلاوت کی کیسٹ لگا دینا۔ تاکہ مرتے دم تک کلامِ الٰہی کی آواز کانوں تک پہنچتی رہے اور یہ بخشش و مغفرت کا باعث بن جائے۔

مولانا مرحوم کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ایک بار چند افراد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہمراہ ایک نوجوان لڑکا تھا، ان میں سے ایک نے عرض کی: مولانا اس لڑکے کو پہچانا؟ انھوں نے لمحہ بھر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ یہ وہی ہے، جس کی پیدائش گولی کے ذریعے ہوئی تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔ صاحبزادہ برق التوحیدی صاحب کا بیان ہے کہ میں نے پوچھا کہ یہ گولی کے ذریعے پیدائش والا معاملہ کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: چک نمبر ۱۲ میں ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ تکلیف بڑھی تو ایک حکیم صاحب نے بتلایا کہ غالباً بچے کا والدہ کی کسی نازک جگہ پر منہ پڑ گیا ہے۔ آپ اس عورت کے پیٹ کے قریب بندوق رکھ کر فائر کریں۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا تھا تو معاً بعد یہ لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے بچپن ہی میں اسے دیکھا تھا، اس کے بعد آج دیکھا تو پہچان لیا۔

تلامذہ:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا نے زندگی کے ابتدائی ایام چک نمبر ۱۲ میں گزارے۔ تشنگانِ علم وہاں گاؤں میں بھی ان سے استفادہ کے لیے پہنچتے رہتے۔ چنانچہ آپ سے گاؤں میں اور اس کے بعد ادارہ میں جن حضرات نے کسبِ فیض کیا

ا ا ، میں سے بعض حضرات کے اسما حسبِ ذیل ہیں:

حضرت مولانا محمد صدیق کرپالوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبدالرحمان سلفی صا ب

ا ر جماعت غربائے اہلِ حدیث پاکستان، مولانا محمد سلفی صاحب مدیر الجامعۃ الستا یہ

ا پی، مولانا محمد ادریس صاحب نائب مفتی الجامعۃ الستاریہ کراچی، مولانا ح ظ

ع االرزاق ڈھلیانہ اور ان کے بھائی مولانا عبداللہ صاحب، مولانا محمد حنیف م وم

د پال پوری، مولانا محمد انس آف کراچی، مولانا محمود احمد حسن آف کراچی، مولا محمد

خ د سیف صاحب، مولانا عبدالحمید اثری بھکر، مولانا صاحبزادہ برق التوحیدی صاحب،

مو انا محمد مدنی صاحب مدیر الجامعۃ الاثریہ جہلم، مولانا محمد اکرم رحمانی صاحب، مو انا

محمد عبداللہ نثار صاحب، مولانا محمد اکرم اثری رینالہ خورد، مولانا عبداللہ مردانی، مو انا

ح ظ احمد اللہ صاحب لاہور، مولانا عطاء الرحمان شیخوپوری، مولانا عبدالعلیم یزدا ن،

مو انا نور اللہ صاحب چک: IR-15، مولانا محمد سلمان سلفی امیر قوم اوڈ، مولانا محمد شیخ

آ ـ جہلم، مولانا عبدالرحمان بلتی، مولانا محمد یحییٰ گوندلوی رحمہ اللہ وغیرہم۔

علمِ طب سے شغف:

حضرت مولانا کو علمِ طب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ جامع مسجد کریمیہ م ں

تشریف لائے تو اس سے ملحقہ کمرے میں ایک چھوٹا سا مطب بنا لیا۔ تا کہ معاش ی

فکر سے بے نیاز ہو کر دینِ حنیف کی خدمت کی جا سکے۔ مگر افسوس ان کا یہ تجر بہ

کا یاب نہ ہو سکا۔ مقتدی حضرات اور دوست و احباب دوا لیتے اور خاموشی سے

تشریف لے جاتے۔ مولانا بھی اپنی وضع داری قائم رکھتے ہوئے کوئی مطالبہ نہ کر ے،

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد اس مشغلہ کو چھوڑنا پڑا۔ دوا سازی بالخصوص کشتہ ساز ی

میں تو مولانا بلاشبہ امام تھے۔ شنگرف، ورقیہ، پارہ کو قائم النار کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا

تیل تھا۔ بلکہ وہ مشہور ''مہوسیوں'' میں شمار ہوتے تھے۔ اس سلسلے کے لیے بڑے بڑے کج کلاہوں کو آپ کے درِ دولت پر چکر لگاتے دیکھا گیا، مگر انھیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یادش بخیر ایک بار مولانا مرحوم ادارۃ العلوم الاثریہ میں عصر کی نماز کے بعد درس سے فارغ ہوئے تو ایک ادھیڑ عمر بزرگ نے مولانا کی خدمت میں ایک خوبصورت مالٹا پیش کیا تو انھوں نے مالٹا دور پھینک دیا۔ چہرے پر خفگی اور ناراضی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ یہ بے رخی بلکہ بدسلوکی دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ کہاں ان کی حلیمی اور شفیق طبیعت اور کہاں یہ بدسلوکی اور وہ بھی ایک بزرگ کے ساتھ۔ بعد میں یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ کچھ وقت بعد انہی سے بڑے خوشگوار ماحول میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے ہیں۔ آئے مہمان چلے گئے، دن بیت گیا، دوسرے روز تشریف لائے تو میں نے ان کی آنے والے مہمان سے بے رخی کا شکوہ کیا کہ یہ آپ کی شان کے منافی تھا تو ہنس کر فرمانے لگے: یہ سب غلط فہمی میں ہوا، میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ صاحب مجھے کیمیا گر سمجھ کر آئے ہیں۔ سونے کی رنگت کی مناسبت سے مالٹا لائے ہیں اور اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے بعد ان سے گفتگو میں میری غلط فہمی دور ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ تو انھوں نے فرمایا: یہ بہت بڑے صاحبِ علم ہیں، چنیوٹ میں رہائش ہے اور ان کا نام مولانا محمد جعفر قاسمی ہے۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ کترووال کے معروف حکیم جناب مستقیم صاحب سے پیش آیا۔

حضرت صوفی محمد عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ اسی ناکارہ کی موجودگی میں مولانا محمد اسحاق چیمہ مرحوم سے فرمایا کہ میرا پیغام ''مولوی عبداللہ'' کو دینا کہ سونے کی دو تین اینٹیں بنا دے، جامعہ تعلیم الاسلام کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ آپ بنا بناتے تھے یا نہیں، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ میں نے یہ ان کے ہاتھوں سے سنتے

نہیں دیکھا، البتہ فرماتے تھے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق دیکھ کر کہ سو سال بعد بنا ہوا سونا اپنی حالت بدل دیتا ہے۔ میں نے یہ شغل چھوڑ دیا۔ اس بارے میں ان کے استاد جوگا ہے بگا ہے ان سے ملنے آتے، جن کا نام غالباً راؤ فرزند علی تھا۔ مولانا ان کی خدمت پیر و مرشد سے بڑھ کر کرتے تھے، جسے دیکھ کر ہمیں بھی حیرت ہوتی اور وہ بڑی بے تکلفی سے آپ کو عبداللہ کہہ کر پکارتے۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ سے محبت کرتے۔ مولانا کے ہاں وہ آتے، مولانا سے ملاقات نہ ہوتی تو آبدیدہ ہو جاتے اور واپس لوٹ جاتے۔ مولانا صاحب کو ان کی آمد کا علم ہوتا تو بلاتوقف ان کے پیچھے ان کے گھر پہنچ جاتے۔ دو تین دن وہاں قیام کرتے، جب اجازت ملتی، تب واپس تشریف لاتے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولانا کی نگاہ میں اس فن میں ان کے استاد کی قدر و منزلت کیا تھی۔

کیمیا گری کے بارے میں ایک دو مرتبہ ان سے بڑی بے تکلفی سے بات ہوئی، مگر وہ فرمایا کرتے کہ یہ قدرت الٰہی کا راز ہے جس کو راز ہی رہنے دینا چاہیے۔ ان کے مجربات کی بیاض ان کے صاحبزادہ بلال صاحب کے پاس محفوظ ہے، جسے وہ حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔

سفرِ آخرت:

حضرت مولانا مرحوم عموماً ہر سال جامعہ ستاریہ کراچی میں طلبا کے سالانہ امتحان اور تقریب بخاری شریف کے لیے تشریف لے جاتے۔ حسبِ معمول ۱۴۰۳ھ بمطابق ۱۹۸۳ء میں شعبان کے اوائل ہی میں کراچی تشریف لے گئے۔ جامعہ ستاریہ کے علاوہ جامعہ ابوبکر میں بھی بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا اور شعبان کے آخر ہی میں عمرہ کے لیے رختِ سفر باندھا اور حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ انہی ایام میں

مسند الامام ابی یعلیٰ کی تحقیق کا کام مکمل ہوا تھا۔ تاہم اس کی نظر ثانی کا کام ابھی باقی تھا۔ مولانا مرحوم چاہتے تھے کہ نظر ثانی کے بعد اس کی طباعت کا مرحلہ جلد طے پا جائے۔ اسی غرض کے لیے وہ مسند ابی یعلیٰ کا فوٹو بھی ہمراہ لے گئے، تاکہ کسی تاجر یا ادارے کے ساتھ اس کی طباعت کے لیے بات کر سکیں۔ اس سلسلے میں امام حرم فضیلۃ الشیخ ابن سبیّل رحمہ اللہ سے بھی بات ہوئی، انھوں نے مسودہ دیکھ کر آئندہ بات کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، جون کے مہینے میں رمضان المبارک تھا۔ مکہ مکرمہ اور سخت گرمی کے دنوں میں ادارے کے لیے گراں قدر کتابیں مختلف مکتبات سے خریدتے رہے۔ پہلے ۶ رمضان المبارک کو گیارہ کارٹون میں بذریعہ سفینہ عابد کتابیں ارسال کیں۔ ۸ رمضان المبارک کو اپنے ایک دوست کے ہاں وادئ عسفان تشریف لے گئے اور وہیں مؤسسہ عبدالحمید میں بیٹھ کر ان کتابوں کی ترسیل اور ادارے کے بارے میں اپنے مشاغل کی اطلاع اس ناکارہ کو بذریعہ خط دی اور آخر میں لکھا: آپ کے ادارے کا خادم: محمد عبداللہ۔

دوسرے ملک سے کتابوں کے آنے جانے کا مسئلہ اور اس کی مشکلات سے وہی انسان باخبر ہے جسے براہِ راست اس سے واسطہ پڑا ہو۔ کتابیں شپ میں پہنچا دیں، انھوں نے ۲۶ جون کو بذریعہ جہاز روانہ کرنے کا وعدہ کیا، مگر مولانا مرحوم کی ذمے داری کا اندازہ کیجیے کہ اس کے لیے دوبارہ جدہ تشریف لے گئے اور بڑی تگ و دو کے بعد ۲۸ جون کو کتابیں اپنی زیرِ نگرانی روانہ کروا دیں اور معاً اس کی اطلاع بھی اسی ناکارہ کو دی اور لکھا:

''بروز منگل ۲۸ جون کتابیں سفینہ عابد سے بھیج دیں۔ الحمد للہ علی ذلك حمداً کثیراً، الحمد للہ ثم الحمد للہ. میری سال کی کوشش

کامیاب ہوگئی، یہ کام اتنا دشوار تھا کہ اس کو میرے سوا کوئی کر نہ سکتا تھا۔"

اس کے بعد بھی مولانا مرحوم مسلسل ادارے کے لیے کتابیں خریدتے رہے۔ مرحوم حافظ فتحی نے دو ہزار ریال کی کتابیں مزید لے کر دیں، اسی اثنا میں مسند الامام ابی علی کی فکر بھی برابر رہی کہ کسی نہ کسی صورت اس کی طباعت کا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ حافظ فتحی مرحوم کی وساطت سے ایک ادارے سے بات ہوئی۔ معاملہ آخری مرحلے میں تھا کہ حافظ فتحی کی ایما پر ۳/شوال بروز بدھ مولانا مرحوم کتاب کا مسودہ جدہ سے لینے کے لیے تشریف لے گئے، کیوں کہ یہ مسودہ جدہ ہی میں اپنے ایک معتمد کے ہاں انھوں نے رکھا ہوا تھا۔

چار شوال کو مولانا مرحوم نے عمرہ کی نیت سے احرام باندھا، مسودہ سنبھالا، مگر اچانک طبیعت ناساز ہوگئی اور سفر کا ارادہ کل تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ رات جدہ ہی میں ٹھہرے، جمعہ کے وقت تک طبیعت میں بے چینی ہی رہی۔ عصر کی نماز کے بعد پیٹ میں تکلیف محسوس کی، حمام میں جانے کے ارادے سے اٹھتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑے۔ وہاں موجود دوستوں نے جلدی سے اٹھایا تو آپ کو بے ہوش پایا۔ اسی دوران میں دو تین گہرے سانس لیے اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی اور یوں یہ آفتابِ علم وعمل ۵ شوال بروز جمعہ بعد نمازِ عصر ہمیشہ کے لیے سرزمینِ حجاز میں غروب ہوگیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون.

آپ کی وفات کی خبر نمازِ مغرب کے بعد مکہ مکرمہ میں احباب کے پاس پہنچی تو سب پر سکتہ طاری ہوگیا، حافظ فتحی مرحوم کی جانب سے اس سلسلے میں جو مکتوب ملا، اس میں لکھا تھا:

"جب یہ خبر بعد نمازِ مغرب مسجد الحرام بیت اللہ میں بذریعہ فون دی گئی تو

احبابِ جماعت پر ایک دم سکتہ طاری ہو گیا، خاص کر حافظ فتحی صاحب کی حالت یہ خبر سنتے ہی قابلِ دید، آنکھوں سے آنسو اور زبان پر إنا للہ وإنا إلیه راجعون! احبابِ جماعت کو صبر کی تلقین کر رہے تھے، نمازِ عشاء سے فارغ ہوتے ہی الشیخ فتحی صاحب، مولانا محمد حنیف، الشیخ عبدالرب الشیخ محمد عبداللہ مفتی محمد شفیع کی معیت میں جدہ روانہ ہو گئے، ان کے بعد پروفیسر ظفر اللہ ان کے بھائی نور اللہ، مولوی محمد اسحاق اور میاں ارشد محمود بن میاں محمد یوسف فیصل آبادی (جو اس سال عمرہ کے لیے وہاں گئے تھے) بھی پہنچ گئے۔ ان کے بعد دیگر احباب بھی جدہ پہنچنے شروع ہو گئے ....الخ۔''

فوتگی کی اطلاع گورنمنٹ سعودی کو دی گئی، ان کے انتقال کی اطلاع متعلقہ افسر کو جدہ میں دی گئی، وہ معاملے کا جائزہ لینے کے لیے پہنچا، حضرت مولانا مرحوم کے جسدِ خاکی کو دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا، کہنے لگا: ''یہ تو ایک اللہ کا ولی معلوم ہوتا ہے، آپ ان کے دفن کا جلد انتظام کریں۔ کوئی قانونی رکاوٹ ہو تو مجھے اطلاع دینا۔'' چنانچہ تمام قانونی پیچیدگیوں کے بعد بالآخر ۸/ شوال بمطابق ۱۸/ جولائی سوموار بعد نمازِ مغرب المسجد الحرام میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور مکہ مکرمہ کے قدیم قبرستان جنت المعلیٰ میں سپردِ خاک کر دیا گیا، مولانا مرحوم کو سرزمینِ حجاز سے خاص انس و پیار تھا، بلکہ وہ تو عرب کے باشندوں سے بھی پیار کرتے تھے، اس سلسلے میں وہ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کا مقولہ بھی سناتے تھے کہ ''عجم نے عرب کو رشتہ دیا ہے۔'' جس میں اشارہ حبشہ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی طرف تھا، فرماتے: ''اس اعتبار سے بھی عجم کو اہلِ عرب کی عزت کرنی چاہیے۔'' یہی محبت دراصل انھیں کھینچ کر سرزمینِ حجاز لے گئی، جس پر یہ کہنا بجا طور پر صحیح ہو گا

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی خبرِ وفات فیصل آباد میں پہنچی تو دھوبی گھاٹ کے وسیع میدان میں ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور نمازِ جنازہ انھی کے ہم نام حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث ویرووالوی نے پڑھائی۔

یہ ناکارہ شوال المکرّم کی چھٹیوں میں گھر لیاقت پور گیا ہوا تھا، واپس لوٹا تو یہ وحشت ناک خبر سن کر مبہوت ہو کر رہ گیا، مگر بجز صبر و تحمل کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

مولانا مرحوم چل بسے، مگر ان کا لگایا ہوا شجر ادارۃ العلوم الاثریہ بحمد اللہ اب تن آور درخت بن چکا ہے، اس ادارہ کے لیے مولانا مرحوم نے تن من دھن سب کچھ قربان کیا، رفقائے ادارہ بھی عزم کیے ہوئے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے اور ان شاء اللہ ان کی جلائی ہوئی اس شمع کو کبھی مدھم نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے انتقال کے بعد ادارہ کو بڑے ناگفتہ بہ حالات سے گزرنا پڑا، انتقال کے بعد حافظ فتحی مرحوم نے ادارہ کے لیے خرید کی ہوئی کتابوں کی جستجو کی، مگر افسوس کہ بڑی کوشش کے باوجود وہ کتابیں نہ مل سکیں، مسند ابی یعلی کے اس عکسی نسخہ سے جو بنا اور اس کے بعد مختلف جہتوں سے جن پریشانیوں سے ہم دوچار ہوئے، اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں: ﴿ إِنَّمَآ أَشْكُواْ بَثِّى وَحُزْنِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ﴾ [یوسف: ۸٦]

حضرت مولانا مرحوم کے انتقال پر مختلف تعزیتی خطوط بھی موصول ہوئے، اسی سلسلے میں شارحِ سنن النسائی حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا مکتوب بھی ملاحظہ فرمائیے جو خود ان دنوں علیل تھے، چنانچہ موصوف احبابِ ادارہ کو لکھتے ہیں

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مولانا عبداللہ صاحب کے انتقال سے بہت صدمہ پہنچا، آپ کو مجھ سے زیادہ پہنچا، إنا لله وإنا إليه راجعون، خاکسار کو مرحوم سے کئی سال سے تعلقِ خاطر رہا، چک نمبر ۱۲ میں ان کی زیارت کو گیا تھا، تعلقِ خاطر ہی نہیں عقیدت تھی، زیادہ کیا عرض کروں، البلد الحرام میں ان کی وفات قابلِ رشک ہے، اللہ تعالیٰ ان کو زمرۂ صالحین، فقہا و محدثین میں داخل فرمائے اور جنتِ بریں میں درجاتِ علیا سے نوازے۔ آمین

اور ایسے مخلص اور قابل رفیق کی جدائی کے صدمے پر آپ حضرات کو صبرِ جمیل بخشے۔ جماعت کے نمازیوں کو سلام کے بعد میری تعزیت پہنچا دیں اور میری طرف سے مرحوم و مغفور کے لڑکوں سے تعزیت کر دیں۔ شدتِ جذبات کے باعث اس سے زیادہ لکھنے کی سکت نہیں رہی۔

اللهم اغفر له وارحمه وأدخله في المهديين.

غم آگین: محمد عطاء اللہ حنیف

یہ ناکارہ بھی حضرت مولانا مرحوم کی اسی دعا پر آمین کہتا ہوا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اس کی توفیق و مرضیات کا اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کا طلب گار ہے۔

بشکریہ "الاعتصام"

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ تا ۲۰ شوال ۱۴۱۷ھ

۲۴ جنوری ۱۹۹۷ء تا ۲۸ فروری ۱۹۹۷ء

مولانا محمد اسحاق چیمہ رحمہ اللہ

(حالات و تاثرات)

جب کوئی مؤرخ فیصل آباد کی سیاسی، سماجی یا مذہبی تاریخ مدون کرے گا تو حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب کے تذکرہ کے بغیر تاریخ کا یہ باب یقیناً تشنۂ تکمیل رہے گا۔ اسی طرح مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کی تاریخ بھی آپ کے تذکرہ کے بغیر ادھوری رہے گی۔ آپ جمعیت کے بانی ارکان میں سے تھے اور ہمیشہ اس کی شوریٰ، بلکہ عاملہ کے رکن رہے اور آخری دور میں کابینہ کے نائب امیر کی حیثیت سے کام کیا۔ مرکزی اور ضلعی سطح پر جو خدمات آپ نے سرانجام دیں۔ کوئی فرد ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ ہمیشہ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ضلع فیصل آباد کے امیر رہے اور مرکزی جمعیت پر جب بھی کوئی افتاد پڑی تو اسے بھنور سے نکال لانے میں ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی بصیرت، پالیسی سازی اور معاملہ فہمی کی بنا پر بعض حضرات انھیں جمعیت کا دماغ کہا کرتے تھے۔ مسلک اہلِ حدیث کے قدیم اور معروف ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں حضرت مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر حافظ احمد شاکر صاحب نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا اور لکھا: ''ایک دماغ تھا نہ رہا۔''

حضرت مولانا مئی ۱۹۲۱ء میں ملکھانوالہ ضلع فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ملکھانوالہ، فیصل آباد سے مشرق کی جانب چھے سات کلو میٹر پر ایک گاؤں ہے، جو

اکثر و بیشتر چیمہ، باجوہ برادری پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم کا تعلق بھی چیمہ برادری سے تھا۔ باپ کا نام چوہدری حاکم دین تھا، جو یہاں ایک متوسط زمیندار تھے۔ دینی تعلیم سے گونا آشنا تھے، مگر اہلِ علم سے عقیدت تھی اور صوم و صلاۃ کے پابند تھے۔ مسلکاً حنفی تھے، البتہ متعصب نہ تھے، تمام اہلِ علم کے قدر دان تھے۔

ابتدائی تعلیم:

پہلے آپ نے ابتدائی رسمی تعلیم گاؤں کے سکول میں حاصل کی۔ پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کے والد موضع میر پور نزد شاہ کوٹ ضلع شیخوپورہ کے ایک مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ آئے۔ یہ بریلوی مکتبِ فکر کا مدرسہ تھا۔ جس میں آپ نے کریما وغیرہ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ انھی ایام میں آپ کے چچا مولوی محمد دین صاحب صوبہ بہار سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو وہ آپ کو وہاں سے اٹھا کر علی آباد نزد سانگلہ ہل میں حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب کے پاس چھوڑ آئے۔ آپ نے صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد عبداللہ صاحب سے پڑھیں۔ گاؤں کے ماحول میں مولانا محمد عبداللہ صاحب نے ایک بھینس پال رکھی تھی۔ فارغ اوقات میں مولانا چیمہ اس بھینس کے چارے کا انتظام کرتے اور کھیتوں سے گھاس لا کر یہ ذمے داری پوری کرتے۔

انھی دنوں کا قصہ خود مولانا مرحوم نے یوں بیان کیا کہ ایک روز گھاس لانے کے لیے حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب کے صاحبزادے میرے ہمراہ چل نکلے۔ میں نے انھیں کہا کہ آپ کو ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم وہ ساتھ ہو لیے، مگر سوئے اتفاق کہ جب میں ایک زمیندار کے کھیت سے گھاس کھود کر فارغ ہوا تو اس زمیندار نے ہمیں آ گھیرا، سخت سست کہا کہ اجازت کے بغیر تم نے گھاس کیوں کاٹی

ہے؟ بں نے منت سماجت کی، مگر نہ مانا اور کہنے لگا: تمھاری سزا یہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے سر پر دس دس جوتیاں مارو، تب چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ پہلے استاذ زادے نے میرے سر پر جوتیاں رسید کیں۔ میری باری آئی تو میں نے صاحبزادے کے سر پر جوتیاں مارنے سے انکار کر دیا کہ گھاس میں نے کاٹی ہے اور یہ میرے استاذ صاحب کے فرزند ہیں، میں یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ انھیں جوتیاں ماروں۔ میری اس بات سے وہ زمیندار بڑا متاثر ہوا، بلکہ اس پر میری اس ادا کا اثر اس قدر ہوا کہ اس کے بعد گاؤں میں جب بھی ملتا ہمیشہ آنکھیں نیچی کر کے ملتا۔

وزیر آباد میں:

صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا محمد عبداللہ صاحب کے مشورے سے آپ نے وزیر آباد کا رخ کیا اور استادِ پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان محدثِ پنجاب مرحوم کے دار العلوم میں پہنچے۔ جہاں حضرت مولانا عمر دین صاحب کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ آپ محدث وزیر آبادی کے جانشین تھے اور شکھر نیر نزد میترانوالی تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ یہاں چیمہ مرحوم نے سنن ابی داود تک کی کتب کا درس لیا۔ وہ حضرت مولانا عمر دین رحمہ اللہ سے اتنے متاثر تھے، جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے۔ حضرت موصوف دونوں ٹانگوں سے معذور تھے، اپنے کپڑے خود دھوتے۔ اگر کوئی طالب علم آگے بڑھ کر کپڑے دھونے کے لیے لے جانے کی کوشش کرتا تو اچھل کر اس کی گردن سے لٹک جاتے اور فرماتے: کپڑے میرے ہیں تم کیوں لے جا رہے ہو؟ یوں بڑے اصرار سے کپڑے واپس لے لیتے۔ تہجد کی نماز میں ان کی کیفیت بالکل حدیث کی مصداق تھی۔ «أزيز كأزير الرحى»

مولانا چیمہ مرحوم کا بیان ہے کہ وزیر آباد میں تعلیم کے دوران میں علم طب

پڑھنے کا شوق پیدا ہوا کہ دین کے ساتھ ساتھ کسب بھی سیکھ لیا جائے۔ حضرت مولانا نمر دین صاحب کو میرے اس ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا: ''تم صرف علم دین حاصل کرو۔ معاش کی فکر مت کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھیں بھوکا نہیں رکھے گا۔'' چنانچہ ان کے فرمان پر میں نے علمِ طب کا خیال دل سے نکال دیا۔

مدرسہ غزنویہ امرتسر:

وزیر آباد سے حضرت مولانا چیمہ مرحوم نے مدرسہ غزنویہ امرتسر کا رخ کیا۔ جہاں انھوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا نیک محمد رحمہ اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد عبداللہ شہید بھوجیانی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد حسین ہزاروی رحمہ اللہ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ حضرت مولانا نیک محمد رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی اسم با مسمیٰ تھی اور امام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے سچے جانشین تھے۔ حضرت مولانا چیمہ صاحب نے ایک مرتبہ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ کو بعض سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر گورنمنٹ برطانیہ نے تین سال کے لیے جیل بھیج دیا اور مدرسہ غزنویہ مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ اس دوران میں مولانا محمد یوسف کلکتوی نے جو خدمات سرانجام دیں وہ ان کی زندگی کا ایک روشن باب ہے۔ انھی دنوں مولانا نیک محمد صاحب کو جامعہ رحمانیہ دہلی کی طرف سے پیغام ملا کہ آپ اگر ان مشکل حالات میں جامعہ رحمانیہ کی سرپرستی قبول فرما لیں، تو ہمارے لیے باعثِ صد افتخار ہو گا اور انھیں ۸۰ روپے ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی گئی۔ مولانا نیک محمد رحمہ اللہ پریشان تو پہلے سے تھے اس پیش کش نے پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ ایک روز پڑھانے کے لیے تشریف لائے تو بڑی دیر تک مسند پر بیٹھے روتے رہے۔ تلامذہ نے اس دلگیری کا سبب دریافت کیا تو فرمایا:

"آج رات مجھے حضرت سید امام عبدالجبار صاحب رحمہ اللہ خواب میں ملے ہیں فرما رہے تھے کہ جو مسند میں نے تمھارے سپرد کی اس کی آبرو رکھنا۔[1] حالات سے متاثر ہو کر کہیں چلے نہ جانا اللہ تعالیٰ تمھاری مدد فرمائیں گے۔"

مدرسہ غزنویہ چھوڑنے کا ارادہ تو پہلے بھی نہ تھا اس خواب نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ پوری دل جمعی سے اس مسند کی آبرو رکھی اور سیکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں تلامذہ نے ان سے کسبِ فیض کیا۔ حضرت چیمہ صاحب یہ واقعہ بڑی دل سوزی سے بیان کرتے اور محض تنخواہ کی خاطر اِدھر اُدھر جانے کو طریقۂ سلف کے منافی سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا نیک محمد رحمہ اللہ سے حدیث کے علاوہ مولانا چیمہ صاحب نے علم وراثت کی مشہور درسی کتاب سراجی بھی پڑھی۔ اسی ناطے خود مولانا مرحوم وارثت سے متعلقہ مسائل چٹکیوں میں حل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر اس بات کا بھی اظہار فرمایا کہ حضرت مولانا نیک محمد فرمایا کرتے تھے کہ محمد اسحاق سراجی تم نے مجھ سے پڑھی ہے، مگر اب یہ تم کو مجھ سے بہتر طور پر آتی ہے۔

حضرت مولانا چیمہ مرحوم تبخیرِ معدہ کے مریض تھے، مگر بہت کم حضرات کو علم ہے کہ اس کا سبب دراصل یہی امرتسر میں مدرسہ غزنویہ کا قیام تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے ذکر کیا کہ میرے کھانے کا انتظام ایک ایسے گھر میں ہوا، جہاں سے صرف مجھے سوکھی روٹی ملتی اور میں پانی کی مدد سے اسے کھاتا تھا، بلکہ کئی بار مجھے بھوکا رہنا

[1] مولانا حافظ عبدالحق صدیقی مرحوم نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت صاحب کا پیر خالی آ گیا۔ حضرت مولانا نیک محمد نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر تپائی پر رکھا اور انھیں اونگھ آ گئی، اسی دوران میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ انھیں خواب میں ملے۔ اگلی روایت یکساں ہے۔ (الف۔سین)

پڑھتا، مولانا محمد عبداللہ آف گوبند پورہ فیصل آباد بھی انھی دنوں مدرسہ غزنویہ میں پڑھتے تھے، ایک روز انھوں نے کہا کہ میرے ساتھ آئیں، آج میں تمھیں کھانا کھلاتا ہوں۔ چنانچہ دروازہ سلطان ونڈ کی جانب جو محلّہ تھا، وہاں سے وہ روٹیاں لے کر آئے، ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور انھوں نے کہا: تم دوست ہو، میرے ساتھ آجایا کرو، روٹی کا انتظام ہو جایا کرے گا، مگر میں نے انکار کر دیا کہ یوں روٹی تو اچھی مل جائے گی، مگر سبق ضائع ہو جائے گا۔

تقریباً ۱۹۴۲ء میں مدرسہ غزنویہ سے فراغت کے بعد مولوی فاضل کے امتحان کا شوق پیدا ہوا، ان دنوں باقاعدہ قادیان ہی میں مولوی فاضل کا کورس پڑھایا جاتا تھا اور مرزا بشیر الدین محمود کے ماموں میر محمد قادیانی اس کلاس کے نگران تھے۔ قادیان پہنچنے پر قادیانیوں کے روایتی رویے کے مطابق مولانا چیمہ صاحب کو قادیان کے تمام شعبہ جات سے متعارف کرایا گیا اور قبولِ مرزائیت کی ترغیب دی گئی اور قادیانیت کے بارے میں آزادانہ رائے کے اظہار پر مجبور کیا گیا۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں صرف مولوی فاضل کے امتحان کے لیے آیا ہوں، آپ یہ بتلائیں کہ مجھے اس کی تیاری کے لیے کلاس میں داخلہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ مگر انھوں نے قادیانیت کے بارے میں اظہارِ رائے پر اصرار کیا تو انھوں نے فرمایا: یہاں آنے سے پہلے مجھے تمھاری فریب کاریوں کے بارے میں شبہ تھا، مگر یہاں آکر اس کا بھی ازالہ ہو گیا ہے اور تمھارے اس سلسلے کو کفر و ضلالت کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ بس اسی بنا پر مولوی فاضل کی کلاس میں داخلہ نہ مل سکا۔ قادیان سے واپس آکر ۱۹۴۳ء میں پرائیویٹ طور پر مولوی فاضل کا امتحان اول نمبروں میں پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ گھر پر رہے، پھر مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈانوالہ تشریف لے گئے۔

اوڈانوالہ میں تعلیم و تعلم:

اوڈانوالہ میں تقریباً ڈیڑھ دو سال کے قیام میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اسی اثنا میں استاذ الاساتذہ حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ اوڈانوالہ میں تشریف لائے تو ان سے بخاری شریف کا درس لیا۔ مولانا محمد یعقوب ملہوی، مولانا پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا عبدالقادر ندوی وغیرہ ان کے ہم سبق تھے، بخاری شریف کی قراءت آپ ہی کے ذمہ تھی اور اصول وفنون کی بعض دیگر کتابیں بھی آپ سے پڑھیں۔ حضرت حافظ صاحب سے خصوصی تعلق اور انس تھا۔ حضرت حافظ صاحب گوجرانوالہ سے بذریعہ ریل گاڑی ماموں کانجن اسٹیشن پر تشریف لاتے۔ شام کے قریب وہاں سے سائیکل پر حضرت چیمہ مرحوم محدث گوندلوی کو اوڈانوالہ لے جاتے۔ مولانا مرحوم نے بتلایا کہ ایک بار سائیکل پر آتے ہوئے جب ایک کھال عبور کرنے لگے تو توازن برقرار نہ رہ سکا اور ہم دونوں استاد شاگرد گر پڑے۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ حضرت حافظ صاحب کیا کہیں گے، مگر انھوں نے اٹھتے ہی فرمایا: تمھیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ مجھے ذرا حوصلہ ہوا تو یہی سوال میں نے ان سے کیا کہ آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں لگی تو انھوں نے فرمایا: نہیں، میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور سائیکل سنبھال کر باقی سفر پورا کیا۔

اسی دوران میں ۱۹۴۳ء میں امیر المجاہدین حضرت صوفی محمد عبداللہ رحمہ اللہ نے آپ پر تدریس کی ذمے داری سونپ دی اور بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اپنے اقران پر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا لوہا منوایا۔ صرف ونحو، منطق وفلسفہ، معانی و بلاغت کی آخری کتابوں کا درس دیا، بلکہ حضرت صوفی صاحب نے حضرت محدث گوندلوی کے بعد پہلے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانوی کو اس منصبِ جلیل پر فائز کیا۔ ۱۹۴۷ء

ئیں برصغیر کی تقسیم کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف تشریف نہ لا سکے تو حضرت موفی صاحب نے شیخ الحدیث کے بلند منصب [1] کی ذمے داریاں بھی آپ کے سپرد کر دیں اور یوں آپ وہاں بخاری شریف کا بھی درس دیتے رہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو تدریس و تفہیم کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ مشکل ترین مسائل اور عبارتوں کو آسان لفظوں میں ایسے حل کرتے کہ طلبا اش اش کر اٹھتے۔ میں نے ان کے بعض شاگردوں سے تو یہاں تک سنا کہ روزِ قیامت امید ہے اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے نظرِ عفو فرمائیں گے مگر ڈر ہے کہ ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ میں نے جیں درس و تدریس اور تبلیغ و تفہیم کا جو ملکہ دیا تھا، اسے کیوں چھوڑ دیا تھا تو ان کے پاس اس کا معقول جواب نہ ہوگا۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں حضرت مولانا چیمہ مرحوم بجھے بجھے سے رہتے اور بعض گھریلو الجھنوں کی بنا پر افسردہ رہتے تھے، ایک بار انھوں نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اس پریشانی کا سبب میرا تدریس و تعلیم سے انقطاع ہے، یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کرنے لگتے اور فرطِ غم سے آنکھیں چھلکنے لگتیں۔ اللھم اغفر له وارحمه

ملتان کے دار الحدیث میں:

پاکستان بنا تو آپ اوڈانوالہ میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے، ایک دو سال بعد بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر آپ کو ۴۹ یا ۱۹۵۰ء میں اوڈانوالہ کو خیرباد کہنا پڑا، جس کی تفصیل یہاں مناسب نہیں۔ دل برداشتہ ہو کر کاروبار کا آغاز کیا، مگر آپ کے علم و فضل کی شہرت کی بنا پر حضرت مولانا ملک عبدالعزیز اور شیخ عبدالرشید صدیقی ﷫ آپ کو باصرار ملتان لے گئے۔ انھوں نے یہ کوشش حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے

[1] اس وقت آپ کی عمر ابھی اٹھائیس/تیس سال تھی۔

ایما ز کی تھی جو کامیاب رہی۔ مدرسہ دارالحدیث محمدیہ ان دنوں محلّہ قدیر آباد میں تھا۔ لائل پور سے ہفتے کی رات بذریعہ وزیر آباد پسنجر پر خانیوال، وہاں سے صبح کی نماز کے وقت ملتان مدرسہ میں پہنچ جاتے۔ ہفتہ بھر وہاں قیام فرماتے اور جمعرات کے روز واپس گھر فیصل آباد تشریف لے آتے۔ ملتان میں قیام کے دوران میں ان کی ملاقات حضرت علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی المراکشی رحمہ اللہ سے ہوئی، مولانا مرحوم نے بتلایا کہ میں پڑھا رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں، ایک بزرگ صفت انسان پاجامہ پہنے ہوئے تشریف لائے اور خاموشی سے میرے حلقۂ درس میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں سبق سے فارغ ہوا تو آگے بڑھ کر خود انھوں نے اپنا تعارف کرایا، میں نے اُن کا نام اور ان کے علم و فضل کا غلغلہ سن رکھا تھا، نام سنتے ہی میں حیران رہ گیا، انھوں نے میرے اندازِ تدریس کی تعریف کی تو مجھے بڑی مسرت ہوئی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر ہلالی رحمہ اللہ نے فرمایا: میں پاکستان میں اپنے سلفی بھائیوں سے ملنے آیا ہوں، ملتان میں مدرسے کا سنا تو یہاں کے بھائیوں کی محبت مجھے یہاں لے آئی۔

ملتان میں گو زیادہ عرصہ آپ نے قیام نہیں فرمایا، مگر اپنی حسنِ کارکردگی اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ان کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں جب ملتان میں اہلِ حدیث کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تو حضرت غزنوی مرحوم نے اس کی مجلسِ استقبالیہ کا صدر مولانا چیمہ مرحوم کو نامزد فرمایا، آپ نے معذرت کی کہ یہ حق اہلِ ملتان کا ہے، مگر مولانا غزنوی مرحوم باصرار اپنے موقف کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

ملتان سے واپسی:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا مرحوم اپنا کاروبار چھوڑ کر ملتان گئے

تھے۔ وہاں جانے کے بعد دکان کا کاروبار گھاٹے کا سودا دکھائی دینے لگا تو بامر مجبوری ملتان سے واپس تشریف لے آئے۔ چند ماہ بعد حضرت ملک صاحب اور شیخ عبدالرشید صدیقی دوبارہ مولانا چیمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ملتان چلنے پر مجبور کرنے لگے، مگر مولانا چیمہ مرحوم نے معذرت کی اور کاروباری مجبوریوں کی بنا پر گھر سے باہر رہنا مناسب نہ سمجھا اور یوں آپ دوبارہ ملتان تشریف نہ لے جا سکے۔

الجامعۃ السلفیہ کا قیام اور دیگر تدریسی خدمات:

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے زیرِ اہتمام ''لائل پور'' میں الجامعۃ السلفیہ کا قیام ہوا تو اس کا انتظام و انصرام عرصہ تک حضرت مولانا چیمہ مرحوم کے ذمے رہا۔ اربابِ جماعت سے یہ بات مخفی نہیں کہ الجامعۃ السلفیہ کی زمین کے حصول میں مرکزی کردار حضرت مولانا عبدالواحد صاحب امام جامع مسجد اہلِ حدیث امین پور بازار، حضرت مولانا عبیداللہ احرار اور حضرت مولانا چیمہ مرحوم کا تھا، پھر الجامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے جو کوششیں مؤخر الذکر دونوں حضرات نے کیں، انھیں کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، آج کے الجامعہ اور اس کے اطراف و اکناف سے آنکھیں بند کر کے ۱۹۵۶/۵ء کے دور میں جایئے اور سوچیے کہ ریت کے ٹیلے پر جہاں نہ چار دیواری تھی، نہ کوئی آبادی، اس عالم میں اللہ والوں کی بستی بسانے والے اور جنگل میں چراغ جلانے والے کون حضرات تھے؟ جماعت کے حالیہ سرمائے کو نہ دیکھیں بلکہ سابقہ بے سروسامانی کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ فرمائیں کہ قریہ قریہ بستی بستی جا کر جامعہ کو متعارف کرانے والے کون تھے؟

آج روشنیوں کے شہر کو نہ دیکھیں، چراغوں کی مدہم سی لو کو پیشِ نگاہ رکھ کر کہیں، اندھیروں میں اس کی نگہبانی کس نے کی؟ آج کی پختہ سڑکیں سب کو نظر آتی

ہیں مگر ۳۷ / ۳۸ سال قبل کی ویرانی کسے یاد ہے، جب ادھر جاتے ہوئے لوگ راستہ بھول جاتے تھے؟ ان حالات میں الجامعہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والوں میں چیمہ مرحوم بھی شامل تھے۔

الجامعہ کے تعارف میں ان کی کوششوں کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگائیے۔

جب یک مرتبہ خود مولانا مرحوم نے بیان فرمایا کہ جامعہ جانا ہوتا تو تانگوں کے اڈے پر تانگے والے سے پوچھتا کہ جامعہ چلنا ہے؟ اس دور میں رکشوں کا تصور بھی نہ تھا۔ وہ ناواقف ہوتا، میں اس کا محلِ وقوع بتلاتا، پھر وہ چار آنے کرایہ طلب کرتا، میں آگے سے دو آنے دینے کا اظہار کرتا، پھر ۲ ½ آنے، بالآخر تین آنے تک بات ہوتی۔ تانگہ بان نہ مانتا تو دوسرے تانگے والے سے بات کرتا، یوں تین، چار تانگے والوں سے بات ہوتی اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ سواری اٹھانے والوں کو جامعہ متعارف کرایا جائے، تاکہ باہر سے آنے والا کوئی اگر جامعہ کا نام لے تو تانگے والے جامعہ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر کے آنے والے کے لیے پریشانی کا موجب نہ بنیں۔

یہ راقم ۱۹۶۴ء میں الجامعۃ السلفیہ حاضر ہوا، مولانا چیمہ مرحوم جامعہ کے انتظام و انصرام سے لاتعلق ہو چکے تھے، مگر پھر بھی میں نے یہاں اساتذہ کرام اور طلبا سے دو باتوں کا تذکرہ بتکرار سنا، ایک استاذ الاساتذہ حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ کا طرز درس بالخصوص یہ کہ دس گیارہ ماہ تک مسلسل حضرت موصوف نے سورۂ فاتحہ کا درس دیا، جس سے طلبا کے بجائے اساتذہ زیادہ مستفید ہوتے اور دوسری بات حضرت چیمہ مرحوم کے انتظام و انصرام اور جامعہ کی خدمات کا، یہاں تک کہ باہر سے گندم آتی تو خود مولانا مرحوم ایک کے بجائے دو دو بوریاں اپنی کمر پر رکھوا کر سٹور میں رکھتے۔

سچی بات ہے کہ ایک قائد اور منتظم کا اس قسم کے کام میں خود پہل کرنا اس کے

اخلاص کی دلیل ہوتا ہے اور یوں رفقائے کار بھی اس میں کسی قسم کی پس و پیش کا شکار نہیں ہوتے۔ خود آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی یہی ہے، غزوۂ احزاب میں آپ کا عمل قائدین حضرات کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ قائدین اگر مٹی کے مادھو نہ بنیں تو خدام خون و پسینہ نچھاور کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ حضرت چیمہ مرحوم انھی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے، دین و مسلک کے لیے اور جامعہ و جماعت کے لیے کسی کام کو بدستِ خود کرنے میں کبھی کوئی حجاب یا عار محسوس نہیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ آمین

الجامعۃ السلفیہ کی تعمیر سے پہلے جون ۱۹۵۶ء میں اس کا آغاز جامع مسجد اہلِ حدیث امین پور بازار میں ہوا تو اس کے ابتدائی تین اساتذۂ کرام میں ایک مولانا چیمہ مرحوم بھی تھے۔ الجامعہ تعمیر ہوا تو اس کے پہلے مہتمم یا مدیرِ تعلیم مولانا چیمہ مقرر ہوئے اور انھیں اس خدمت کے لیے مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی مجلسِ عاملہ نے منتخب کیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے حضرت مولانا محمد صدیق رحمہ اللہ خطیب جامع مسجد امین پور بازار کو بھی الجامعہ کا ناظم مقرر کیا گیا، مگر ۱۹۵۸ء میں مولانا چیمہ مرحوم کو دوبارہ الجامعہ کا نظم ونسق سونپ دیا گیا۔ نظامت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جز وقتی تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ انھی کے دورِ نظامت کے حوالے سے اس ناکارہ کو مولانا مفتی عبیداللہ خان عفیف حفظہ اللہ نے بتلایا کہ ایک رات بارش ہوئی، رات کا کافی حصہ بیت چکا تھا، تقریباً ڈیڑھ، دو بجے کا وقت ہوگا، میں لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کر رہا تھا، اسی دوران میں مولانا چیمہ شہر سے اپنی سائیکل پر تشریف لائے اور مجھے فرمایا: تم ابھی تک مطالعہ کر رہے ہو؟

اندازہ کیجیے جس دور میں دن کے وقت الجامعہ میں آمد و رفت مشکل تھی، اس

دور میں رات کو الجامعہ جانا اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری نبھانا مولانا چیمہ کے اخلاص اور جامعہ سے محبت کی انتہا ہے۔

الجامعۃ السلفیہ کے حوالے سے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ الجامعہ کے قیام سے ایک عرصہ پہلے حاجی آباد کے قریب امین کوٹ گاؤں میں دو نیک سیرت بھائی مقیم تھے: ایک کا نام امام الدین اور دوسرے کا نام رحیم بخش تھا۔ رحیم بخش صاحب کے چار بیٹے تھے، جن میں سے ایک کا نام محمد اسماعیل اور دوسرے کا نام محمد یوسف تھا۔ محمد یوسف کے بیٹے چوہدری محمد سلیم مرحوم تھے اور محمد اسماعیل کے بیٹے چوہدری محمد رفیق صاحب ہیں جو کچھ عرصہ فیصل آباد کے میئر رہے ہیں۔ اور امام الدین کے ایک بیٹے کا نام محمد ابراہیم تھا، ان کے بھی چار بیٹے تھے، ان میں ایک محترم حکیم محمد صدیق صاحب فضل حق والہ نزد ڈجکوٹ کے رہایشی ہیں۔ مرحوم امام الدین نے ہی اس خواہش کا اظہار مولانا عبدالواحد امام مسجد امین پور بازار سے کیا کہ میں کچھ زمین وقف کرنا چاہتا ہوں، ان کی خواہش تھی کہ یہاں مدرسہ قائم کیا جائے، تاکہ صدقہ جاریہ کی صورت میں انھیں اجر و ثواب ملتا رہے۔ چنانچہ انھوں نے سوا دو ایکڑ زمین ''انجمن اہل حدیث لائل پور'' کے نام وقف کر دی۔ امام الدین ۱۹۴۲ء میں فوت ہو گئے اور وقف زمین کی آمدنی بدستور جامع مسجد اہلِ حدیث کی ضروریات کے لیے خرچ ہوتی رہی۔

۲، ۳، ۴ اپریل ۱۹۵۴ء کو ملتان میں اہلِ حدیث کانفرنس کے موقع پر مجلسِ شوریٰ نے مرکزی دار العلوم کے قیام کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے مختلف شہروں میں قطعۂ زمین حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مولانا عبدالواحد نے تب اس وقف شدہ زمین کے بارے میں احبابِ جماعت کو آگاہ کیا تو یوں امام الدین مرحوم کی امید بر آئی اور اس زمین پر الجامعۃ السلفیہ قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔

مگر اس میں ایک قانونی رکاوٹ یہ تھی کہ ابھی تک امام دین کے ورثا کی طرف سے زمین کا جامعہ کے نام انتقال کا مرحلہ باقی تھا۔ چنانچہ ہمارے ممدوح مولانا چیمہ مرحوم فضل حق والہ میں حکیم محمد صدیق صاحب سے ملے، بعض رشتہ داروں نے بدظنی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر حکیم صاحب نے ذمہ داری قبول کی کہ ہم چار بھائی، چار بہنیں اور والدہ اس کے انتقال پر متفق ہیں۔ ۳،۴ اپریل اتوار، سوموار ۱۹۵۵ء میں لائل پور میں مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کانفرنس منعقد ہوئی، مولانا چیمہ مرحوم نے حکیم محمد صدیق صاحب نے کہا کہ ۴ اپریل کو ہم اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ہمراہ کچہریوں میں آکے یہ قضیہ نپٹا دیں گے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے پہلے تمام کی طرف سے اپنے نام مختار نامہ عام حاصل کیا اور دوسرے لمحے میں اس زمین کو الجامعۃ السلفیہ کے نام منتقل کر دیا گیا۔ ادھر اسی روز عصر کی نماز کے بعد الجامعۃ السلفیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ حکیم صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ یہ ساری تفصیلات انھوں نے بیان فرمائیں۔

''برصغیر میں اہلِ حدیث کی سرگزشت'' (ص: ۱۹۴) میں مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم نے جو لکھا ہے کہ دو بھائیوں نے ۱۹۵۴ء میں پونے دو ایکڑ زمین وقف کی، حکیم صاحب کے اس بیان کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ زمین امام الدین مرحوم نے وقف کی تھی اور دوسرے بھائی کا نام کریم بخش نہیں بلکہ رحیم بخش تھا۔ امام الدین تو ۱۹۴۲ء میں انتقال فرما گئے تھے۔

جامعہ کے انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ آپ نے سلسلۂ تعلیم و تعلم بھی ایک حد تک جاری رکھا، جب کبھی کوئی استاذ صاحب رخصت پر ہوتے تو اس کی کلاس کو لے کر بیٹھ جاتے، تاکہ طلبا کا نقصان نہ ہو۔

جامعہ سلفیہ کے علاوہ ایک عرصے تک آپ نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں

بھی ا ِداود، صحیح مسلم اور صحیح بخاری شریف کا درس دیا۔ جامعہ تعلیمات ان دنوں جناح کالونی میں تھا اور مولانا مرحوم کا گھر بھی وہیں چند قدم پر تھا، بلکہ حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جامعہ طبیہ اسلامیہ کا انتظام بھی مولانا چیمہ مرحوم کے سپرد کر رکھا تھا، جامعہ طبیہ میں طلبا کا مزاج خالصتاً کالجز کے طلبا کا سا تھا، ان کے بے جا مطالبوں اور ہنگاموں کے سامنے بند باندھنے والے حضرت مولانا مرحوم ہی تھے۔
جامعہ تعلیمات میں ایک بار ہنگامہ ہوا، ظالم چوکیدار کے ہاتھوں ایک استاد شہید ہو گئے، شہید ہونے والے جامعہ تعلیمات کے انگلش کے استاد تھے۔ ان کا نام نیک محمد صاحب تھا اور حافظ جمیل الرحمٰن آف غلام محمد آباد، فیصل آباد کے والد گرامی تھے ۔رحمهم الله أجمعين۔ حضرت مولانا محمد بشیر سیالکوٹی رحمہ اللہ مدیر دار العلم اسلام آباد اور حضرت مولانا محمود احمد غضنفر رحمہ اللہ شدید زخمی ہوئے، اس مشکل ترین وقت میں بھی مولانا مرحوم کا تدبر ہی کام آیا اور قاتل اپنے انجام کو پہنچا۔

سیاسی و مذہبی خدمات:

حضرت مولانا مرحوم کی سیاسی و مذہبی خدمات کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے۔
سالہا سال سے آپ ضلعی و شہری امن کمیٹی کے رکن تھے۔ ''تحریکِ ختم نبوت'' ہو یا ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰ'' دونوں میں آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۷۴ء میں تحریکِ ختم نبوت میں فیصل آباد کی مجلسِ عمل کے رکن تھے، بلکہ اس دوران میں انھوں نے اہلِ حدیث علمائے کرام کو فعال بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ''مجلسِ عمل اہلِ حدیث'' کے نام سے ایک کمیٹی بنائی، سب نے بالاتفاق اس کا کنوینیر آپ کو منتخب کیا، متحدہ پلیٹ فارم کے علاوہ اسی مجلسِ عمل اہلِ حدیث کی طرف سے مختلف مقامات پر بھرپور جلسے منعقد کیے۔

اسی تحریک کے دوران میں جب آپ مرحوم مولانا تاج محمود، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور مولانا مفتی زین العابدین کے ہمراہ ضروری دستاویزات لے کر رات کی ٹرین پر راولپنڈی مرکزی مجلس عمل کے اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تو راستے میں پنجاب پولیس کے ہتھے چڑھ گئے، ایک اسٹیشن پر سب کو اتار کر تھانے لے جایا گیا۔

صبح کے وقت جب پولیس بول و براز کے لیے باہر لے گئی تو آپ نے موقع پا کر ایک کم سن لڑکے کو اپنے پاس بلایا، اس سے پوچھا: یہاں سے جلوس وغیرہ نکلتے ہیں؟ اس نے کہا: فلاں مسجد سے روزانہ جلوس نکلتے ہیں، مولانا نے اسے کہا: وہاں کے خطیب صاحب سے جا کر کہو کہ لائل پور سے تین چار عالم آئے ہیں اور وہ تھانے میں بند ہیں۔ مولانا تاج محمود دور سے یہ کارروائی دیکھتے رہے۔ پاس آئے تو فرمانے لگے: چیمہ صاحب کچھ بنے گا یا نہیں؟ فرمایا: گھبرایئے نہیں، اللہ تعالیٰ مددگار ہے، ان شاء اللہ نتیجہ ضرور نکلے گا۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا، ابھی ایک گھنٹا بھی بمشکل ہو پایا تھا کہ ایک بڑا جلوس ''ختم نبوت، زندہ باد! علمائے کرام، زندہ باد'' کے نعرے لگاتا ہوا تھانے میں پہنچا۔ انتظامیہ حیران رہ گئی کہ ماجرا کیا ہے؟ انھیں کس نے اطلاع دی ہے؟ بالآخر جلوس سے ان علمائے کرام کو باحفاظت واپس بھجوانے کا وعدہ کر کے انھوں نے اپنی جان چھڑائی۔

ادھر اہلیانِ لائل پور کو پنڈی رابطے سے معلوم ہوا کہ ہمارے نمایندہ علمائے کرام راولپنڈی نہیں پہنچ سکے۔ شہر میں فی الفور ہڑتال ہو گئی، کچہری بازار جامع مسجد میں احتجاجی جلسہ ہوا اور گورنمنٹ کو وارننگ دی گئی کہ اگر شام تک ہمیں مطمئن نہیں کیا جاتا اور حضرات علمائے کرام کو لائل پور باحفاظت نہیں پہنچایا جاتا تو لائل پور کی اینٹ سے

ایندھ بجا دی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد پنجاب پولیس کی آنکھیں کھل گئیں چنانچہ انتظامیہ کے اس وعدے پر کہ کل شام تک حضرات علمائے کرام لائل پور پہنچ جائیں گے۔ حسبِ وعدہ اگلے روز بذریعہ شاہین ایکسپریس اس قافلے کو لائل پور پہنچا دیا گیا۔ مجلسِ عمل کو اس کی خبر پہلے مل چکی تھی، شہر میں ان کی آمد کا اعلان ہوا تو جمِ غفیر اپنے قائدین کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر پہنچا اور پوری فضا ''ختمِ نبوت زندہ باد، علمائے کرام زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔

مولانا مرحوم پیپلز پارٹی اور اس کی ہنگامہ پرور سیاست کے ہمیشہ مخالف رہے، ہر الیکشن کے موقع پر اس کی مخالفت کی۔ ۱۹۷۰ء میں جب پہلی بار خم ٹھونک کر پیپلز پارٹی میدانِ عمل میں آئی تو ان کی غریب پروری کا طلسم توڑنے کے لیے ایک بڑا اشتہار غالباً ''پیپلز پارٹی کے غرباء'' کے نام سے ادارۃ العلوم الاثریہ نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر ملک بھر میں پھیلایا۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے مولانا مفتی محمود مرحوم کے مقابلے میں بھی جب بھٹو صاحب نے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو وہاں کے حلقے میں دیوبندی حضرات نے سیکڑوں کی تعداد میں یہ اشتہار منگوائے اور حلقہ بھر میں لگوائے۔ بھٹو صاحب کا یہی اقدام دراصل حضرت مفتی صاحب اور بھٹو کے مابین نزاع کا باعث بنا، ورنہ کسے معلوم نہیں کہ اوائل میں مفتی صاحب کا بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی سے کوئی زیادہ اختلاف نہیں تھا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی بھی اسی موضوع پر بولتے، لاہور کا ''ترجمان الاسلام'' جو ہزاروی صاحب کی زیرِ ادارت نکلتا تھا، اسلام کا نہیں، پیپلز پارٹی اور سوشلزم کا ترجمان محسوس ہوتا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام نفاذِ اسلام کے موقف کو چھوڑ کر سوشلسٹوں سے گٹھ جوڑ کر رہی تھی۔ پاکستان کے مقتدر اہلِ علم کے ایک سو

تیرہ علما نے سوشلزم کے کفر کا فتویٰ دیا تو جمعیت علمائے اسلام نے اس کی مخالفت کی، دھوبی گھاٹ فیصل آباد میں جمعیت کا جلسہ حضرت مفتی محمود مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ اس ناکارہ کے کانوں میں مرزا غلام نبی جانباز کی نظم کا یہ مصرعہ آج بھی محسوس ہو رہا ہے، جس میں انھوں نے کہا تھا: ''یہ ہیں استنجے کے ڈھیلے'' اور مفتی صاحب مسکرا رہے تھے۔

سوشلزم کے خلاف فتویٰ دینے والوں میں مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری آف گجرات بھی تھے۔ حضرت مفتی صاحب، مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہ ان کی خدمت میں گئے کہ فتویٰ واپس لے لیں، مگر شاہ صاحب نے فتویٰ واپس لینے سے انکار کر دیا۔ شورش کشمیری مرحوم اور ان کا چٹان جمعیت علمائے اسلام کے خلاف جو کچھ کہہ اور لکھ رہا تھا وہ آج بھی چٹان کی فائلوں میں محفوظ ہے۔

حضرت مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے اس طرزِ عمل سے بہت سے علمائے دیوبند پریشان تھے۔ سوشلزم کے خلاف مولانا احتشام الحق تھانوی اور ان کے ہم نوا میدانِ عمل میں آئے۔ ملک میں سوشلزم کے خلاف جلسے کیے، مولانا تھانوی ایک صاحب طرز خطیب تھے اور تھانہ بھون کی نسبت سے ان کا ایک مقام تھا، ہر شہر مرکزی جمعیت علمائے اسلام بنانے کا اعلان کیا۔ فیصل آباد میں اس کی تنظیم بنی تو ہمارے ممدوح مولانا محمد اسحاق چیمہ کو اس کا صدر اور مولانا شمس الدین افغانیؒ اس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ رات کو دھوبی گھاٹ میں مولانا چیمہ مرحوم کی صدارت میں عظیم الشان جلسہ ہوا، دوسرے علمائے کرام کے علاوہ مولانا تھانوی نے تقریباً دو گھنٹے بڑی دھواں دھار تقریر کی۔ مگر افسوس! تھانوی صاحب بھی پیپلز پارٹی کے سیل رواں کے سامنے استقامت کا مظاہرہ نہ کر سکے اور ''سابقہ روش'' کے مطابق چھلانگ لگا کر چڑھتے سورج کے پجاریوں میں شامل ہو گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

مسلم لیگ اور اس کے طرزِ فکر سے بھی حضرت مولانا متفق نہ تھے، ان لوگوں نے ہمیشہ اسلام کا نام لے کر سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دامنِ تزویر میں پھنسایا، پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان کی سیاست کو اسلام ہی نہیں، ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انتخابات میں ہمیشہ ان کی مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت کے نمایندے سے بھرپور تعاون کیا، بلدیاتی الیکشن ہو یا صوبائی و قومی، کوئی نمایندہ ان کی خدمت اور ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکا، انتخاب کے بارے میں ہمیشہ ان کی یہ رائے رہی کہ اہلِ حدیث نمایندہ بطور اہلِ حدیث بجز دو ایک حلقوں سے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ اہلِ حدیث افراد و بھیڑ بکریوں کی طرح جدھر کوئی چاہے ہانک کر لے جائے۔ ملک میں اہلِ حدیث بحمداللہ ایک قوت ہیں، بالخصوص حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی کوششوں سے جو اس میں بیداری پیدا ہوئی، اب انھیں نہ دھوکے میں مبتلا کیا جا سکتا ہے نہ ورغلایا جا سکتا ہے۔ مولانا مرحوم نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ان حالات میں اہلِ حدیث افراد کو باور کرایا جائے کہ اس کا ووٹ اس کا نہیں، بلکہ اس کی جماعت کا ہے، جماعت جس نمایندہ کی تائید کرے گی، اہلِ حدیث اس کو ووٹ دیں گے، ان کی اس فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ اہلِ حدیث حضرات کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ضلعی و شہری سطح پر نمایندے ان کی طرف رجوع کرتے اور وہ اپنے رفقا سے مشورے کے بعد جو فیصلہ فرماتے، اس کی ہمیشہ پابندی کرتے۔

پاکستان بنا تو آپ ان دنوں اوڈانوالہ مدرسہ تعلیم الاسلام میں مدرس تھے۔ تحصیل سمندری میں ایک نہر پر سکھوں کی آبادی زیادہ تھی اور وہ زمیندار تھے اور اپنے آپ کو مسلح کرنے میں شبانہ روز کوشش کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ذکر کیا کہ

ہم اوڈانوالہ سے ۱۹۴۷ء میں لائل پور آ رہے تھے، میرے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب مرحوم ملوی تھے اور ایک بھینس بھی ساتھ تھی، سمندری کے قریب سورج غروب ہونے لگا تو ہم نے چک ۴۶۸ کا رخ کیا، مسلمان گھرانے کا پوچھ کر ہم جب اس کے ہاں پہنچے اور اپنے رات رہنے کا اظہار کیا تو اس نے صاف طور پر انکار کر دیا کہ میں تمھیں رات نہیں رکھ سکتا۔ میں نے کہا: ہم نہ کھانا مانگتے ہیں، نہ مکان صرف رات رہنا چاہتے ہیں، مگر وہ پھر بھی نہ مانا۔ میں نے کہا: ہم رات اور کہاں جائیں، گڈے کے ساتھ بھینس باندھ دی اور اسی پر لیٹ گئے، مگر مالک مکان اس کی بھی اجازت دینے کو تیار نہ تھا، باتوں باتوں میں میں نے اس سے پوچھا کہ تمھارا آبائی گاؤں کون سا ہے؟ تو اس نے کہا: سیالکوٹ میں، میں نے کہا: میرے آبا اجداد کا تعلق بھی سیالکوٹ سے ہے۔ یہ سن کر وہ بڑا خوش ہوا، گھر جا کر بسترے لے آیا اور کھانا بھی کھلایا۔

پھر اندھیرے میں وہ مجھے لوہار کی دکان کی طرف لے گیا، وہاں دیکھا کہ سکھ اسلحہ بنوانے میں مصروف ہیں، کلہاڑی، برچھا وغیرہ تیار ہو رہے ہیں، میں یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ صاحبِ خانہ نے بتلایا: ہم کسی مسلمان کو اسی لیے تو یہاں مہمان نہیں رکھتے کہ اگر انھیں پتا چل جائے کہ کوئی ان کے ہاں آ کر ٹھہرا ہے تو یہ ہمیں تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ہماری شامت آ جاتی ہے۔ محض اس لیے کہ یہ تمھارا مہمان ہمارا راز افشا کر دے گا، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنجاب کی تقسیم نے کیا کیا ستم ڈھائے تھے۔

برصغیر تقسیم ہوا تو مسلمان لٹ پٹ کر آئے، مولانا مرحوم اپنے رفقا کے ہمراہ ان کی رہایش اور خوراک کا بندوبست کرتے، اسٹیشن ماموں کانجن پر ٹرین آتی تو

مسافروں اور بے گھروں کے لیے پانی اور روٹی کا انتظام کرتے۔ ایک بار گاڑی غیر مسلمانوں کو لے کر لاہور جا رہی تھی، اسٹیشن ماموں کانجن پر آ کر رکی تو دیکھا اس کے اکثر مسافر کٹے پھٹے اور زخمی تھے، کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں، بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مولانا مرحوم نے بتلایا کہ میں نے پانی لے جا کر انھیں پلانا چاہا، مگر سکھ فوجی نے بلند آواز سے کہا: مت پانی پینا، اس میں نیلا تھوتھا ملا ہوا ہے۔ میں نے ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے پہلے خود وہ پانی پیا، جس پر انھیں یقین آیا تو وہ مجھ سے پانی لے کر پینے لگے۔

مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے: پارٹیشن کے دوران میں سکھوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا اور جبر و بربریت کی جو داستانیں چھوڑیں، انھیں کسی صورت بھلایا نہیں جا سکتا، مگر افسوس کہ اس کے ردِعمل میں مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا جو سکھوں نے کیا۔ اوڈانوالہ کے مضافات میں ہونے والے ایسے خونی واقعات کا کبھی ذکر کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

فیصل آباد شہر و ضلع میں آپ کی مسلکی خدمات کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے، اس کا کوئی گاؤں، قصبہ یا شہر ایسا نہیں، جہاں آپ جماعت کے تعارف اور مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے نہ گئے ہوں، مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کا وجود بنا تو اس کی رکن سازی اور افراد اہلِ حدیث کی معلومات جمع کرنے کے لیے ضلع بھر کے کوائف جس طرح اپنے رفقا کے تعاون سے جمع کیے، اس کا اندازہ آپ اس سوال نامے سے کر سکتے ہیں، جو اس سلسلے میں انھوں نے چھپوایا تھا:

سوالنامہ بابت کوائف متعلقہ تحریک اہلِ حدیث در ضلع فیصل آباد

① چک .... ڈاکخانہ .... تحصیل ....

② قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام اور فاصلہ ....

③ قریب ترین پختہ سڑک اور قریبی اڈا کا فاصلہ ....

④ گاؤں کی کل آبادی ....

⑤ جماعت اہلِ حدیث سے متعلقہ افراد کی آبادی ....

⑥ ابتدائی آبادکاری یا قیامِ پاکستان پر

ا کتنے اہلِ حدیث خاندان یہاں آباد ہیں ....

ب وہ کن کن مقامات سے آئے ....

ج خاص سرکردہ افراد کے اسمائے گرامی مع امتیازی قابلیت وغیرہ ....

⑦ = کیا الگ مسجد اہلِ حدیث تعمیر شدہ ہے؟ اور کب تعمیر ہوئی ....

ب مسجد کی عمارت کے متعلق تفصیل ....

ج مسجد سے ملحقہ وقف اراضی، مکانات وغیرہ کی تفصیل ....

د مسجد میں خطیب و امام کے طور پر ابتدا سے اب تک کام کرنے والے سحاب کے اسمائے گرامی مع ان کی عرصہ کارکردگی ....

⑧ = کیا باقاعدہ جمعیۃ اہلِ حدیث کا قیام عمل میں لایا گیا ہے؟ ....

ب کیا اس کا الحاق مرکز سے ہے؟ ....

ج جمعیۃ کے ممتاز ارکان اور عہدیداران کے اسمائے گرامی مع تفصیلِ کارکردگی .....

⑨ = تبلیغی کام کس انداز سے ہو رہا ہے؟

ب کیا بیرونی مبلغ تشریف لاتے رہتے ہیں؟

ج سالہائے گزشتہ میں کون کون سے مبلغ تشریف لاتے رہے ہیں؟

د سالہائے گزشتہ کے دوران میں باقاعدہ جلسے کتنے منعقد کیے گئے، ایسے جلسوں کے متعلق ایک مختصر رپورٹ شامل کی جائے۔

۱۰ = دینی تعلیم کا ابتدائی سطح پر کیا انتظام ہے؟

ب اعلیٰ سطح پر دینی تعلیم کا انتظام ہو تو اس کی تفصیل الگ سے مہیا فرمائی جائے۔

ج دینی تعلیم کا انتظام مسجد میں ہے یا الگ عمارت میں؟

۱۱ = چک مذکور کے قابلِ ذکر افراد کی فہرست بتفصیلِ ذیل مہیا فرمائی جائے:

ب قرآن مجید کے حافظ اصحاب

ج گریجویٹ یا اس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب

د مبلغ اصحاب

ہ دینی مدارس میں مدرس اصحاب

و مختلف محکمہ جات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اصحاب۔

ز ڈاکٹر یا طبیب حضرات

ح اعلیٰ پیمانے پر تجارت کنندہ حضرات

ط اعلیٰ پیمانے پر صنعتی کاروبار کرنے والے اصحاب

ی کالجوں میں کام کرنے والے اصحاب

ک ہائی سکول میں کام کرنے والے اصحاب

ل مڈل سکول میں کام کرنے والے اصحاب

م پرائمری سکول میں کام کرنے والے اصحاب

ن یونین کونسل یا اس سے اعلیٰ تر منتخب ادارے کے ارکان حضرات

س نمبردار حضرات

ع مرحومین سے خاص قابلِ ذکر اصحاب

یہ ہے وہ سوالنامہ جو ضلع بھر میں اہلِ حدیث حضرات کو منظم کرنے اور ان کے

کوائف جمع کرنے کے لیے انھوں نے مرتب کروایا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جماعت کے بارے میں ان کے احساسات کیا تھے اور وہ اسے کس ڈھب اور سلیقے کے ساتھ منظّم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی انھی خطوط پر کام کیا جائے تو ہر ہر فرد کے بارے میں معلومات مرکزِ جماعت میں جمع ہو سکتی ہیں اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلک میں پرویا جا سکتا ہے۔

شہرِ فیصل آباد میں بھی ان کی خدمات کوئی ڈھکی چھپی نہیں، یہاں مساجد کی تعمیر اور ترقی میں ان کی مساعی کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ جماعت کے افراد پر جہاں کہیں کوئی افتاد پڑی یا مسجد اہلِ حدیث کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ یا قانونی پیچیدگی پیدا ہوئی تو اس کے ازالے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی علمی و شخصی وجاہت کی بنا پر دیوبندی و بریلوی مکتبِ فکر کے حضرات بھی ان کی رائے کا احترام کرتے تھے اور شہر کی انتظامیہ بھی اس میں وزن محسوس کرتی تھی، بلکہ جب انتظامیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے تو دیکھنے والے حیران و ششدر رہ جاتے۔

حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمان یزدانی اور مولانا عبدالخالق قدوسی وغیرہ رحمہم اللہ کے سانحۂ شہادت کے موقع پر احتجاجی پروگرام کو اپنے رفقا کے تعاون سے جس سلیقے سے انھوں نے چلایا، اس کی مثال دوسرے شہروں میں ملنا مشکل ہے۔ انتظامیہ بہرنوع اس میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتی تھی، مگر مولانا مرحوم نے اپنے حسنِ تدبر سے اس کو جماعت کے پروگرام کے مطابق چلایا اور انھیں باور کرایا کہ ہم مظلوم ہیں، مظلوموں کا راستہ مت روکو، یہ ہمارا آئینی و انسانی حق ہے اور بمصداق ع

بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے
کوئی رکاوٹ بھی ان کا راستہ نہ روک سکی۔

پسندیدہ شخصیات جن سے وہ متاثر تھے:

یوں تو حضرت مولانا نے بڑے بڑے شیوخ واعیان کو پایا اور متعدد اہلِ علم و فضل سے کسبِ فیض کیا، مگر دیکھنے میں یہ بات آئی کہ ان میں حسبِ ذیل حضرات سے وہ زیادہ متاثر تھے:

- حضرت مولانا نیک محمد صاحب رحمہ اللہ شیخ الحدیث مدرسہ غزنویہ کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''آپ اسم بامسمیٰ تھے۔ سلف کی یادگار تھے اور حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے سچے جانشین تھے۔'' مولانا مرحوم کے پاس ان کا عطا کردہ جُبہ بھی تھا۔ جس کا ذکر بڑی عقیدت و محبت سے کیا کرتے تھے۔
- حضرت مولانا عمر دین صاحب جانشین حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی۔ مولانا مرحوم ان سے اس قدر متاثر تھے کہ جب بھی ان کے علم و عمل اور ان کے زہد و تقویٰ اور ورع کا ذکر کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے۔
- امیر المجاہدین حضرت صوفی محمد عبداللہ صاحب: ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں افراد ابھی موجود ہیں، جنھوں نے حضرت صوفی صاحب سے کسبِ فیض کیا اور ان کی زیارت کی۔ مولانا مرحوم کو حضرت صوفی صاحب اور ان کے جامعہ تعلیم الاسلام سے اس قدر اُنس تھا کہ فرمایا کرتے تھے جب کبھی طبیعت اداس ہوتی ہے تو میں ماموں کانجن کا پھیرا لگا کر اپنے آپ کو ہلکا اور مطمئن پاتا ہوں۔ حضرت صوفی صاحب زندگی کے آخری ایام میں حج پر تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ دیگر

رفقا کے علاوہ حضرت چیمہ رحمہ اللہ بھی ہمراہ تھے۔

حضرت صوفی صاحب انتہائی کمزور ہو چکے تھے، چلنا پھرنا ایک مشکل ترین مسئلہ بن گیا تھا۔ بس ایک بہانے سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے مجاہد کو بالکل آخری ایام میں اپنے گھر کی حاضری کی سعادت بخشی، ورنہ اتنے طویل سفر کی صعوبتیں ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حج کے اس بابرکت سفر میں حضرت چیمہ رحمہ اللہ نے حضرت صوفی صاحب کی جی بھر کر خدمت کی، اپنی کمر پر اٹھا کر بیت اللہ شریف لے جاتے، بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کراتے۔ یہ کام اُجرت پر ہوسکتا تھا، ہوتا بھی ہے، مگر انھوں نے اسے انتہائی سعادت سمجھا اور خدمت کا حق ادا کیا۔ اس طرح کا معاملہ مدینہ طیبہ میں مسجدِ نبوی اور روضۂ رسول اللہ ﷺ پر بھی رہا۔ روضۂ اقدس کے نزدیک انتظامی پیچیدگیوں کی بنا پر اور کچھ خرافیوں کی ناروا حرکتوں کے سبب وہاں کے نگہبان اور خدام روضۂ مقدسہ کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیتے۔ مگر مولانا نے ذکر کیا کہ میں نے حضرت صوفی صاحب کو اٹھائے رکھا۔ روضۂ اقدس کے قریب درود وسلام کے لیے جب لے گیا تو حضرت صوفی صاحب دیر تک وہاں درود شریف پڑھتے رہے، تا آنکہ انھوں نے خود فرمایا کہ اب آگے نکل چلو۔ یوں اس پورے سفر میں ان کی خوب خدمت کی اور ان سے دعائیں لیں۔

حضرت صوفی صاحب مستجاب الدعوات تھے اور ان کی اس کرامت کو زمانہ جانتا ہے۔ اس ناطے میں نے دیکھا جب بھی کسی نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا مولانا مرحوم اسے حضرت صوفی صاحب کے پاس لے جاتے اور ان سے دعا کرواتے۔ ایک بار حضرت والد صاحب مرحوم تشریف لائے۔ مولانا چیمہ صاحب سے ملاقات پر باتوں باتوں میں بڑی حسرت سے ذکر کیا کہ میرے بھانجے کے یہاں نرینہ اولاد

نہیں۔ مولانا مرحوم نے فرمایا: چلیں حضرت صوفی صاحب سے دعا کراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم و فضل فرمائے گا۔ چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ مرحوم کے ہمراہ انھیں ماموں کانجن لے گئے، یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا، وہاں حاضر ہوئے۔ مدعا بیان کیا تو حضرت صوفی صاحب نے فرمایا صبح کے وقت دعا کریں گے۔ چنانچہ تہجد کے وقت نوافل سے فارغ ہو کر ہم سب کو اکٹھا کیا۔ وضوء وغیرہ کے بعد حضرت صوفی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں دعا کی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل و احسان کا اندازہ کیجیے کہ ان کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بیٹے عطا فرمائے۔ جو بحمد اللہ بقید حیات ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی مرضیات سے نوازے۔ آمین

حضرت صوفی صاحب کو بھی آپ پر پورا اعتماد تھا۔ جامعہ تعلیم الاسلام کے معاملے میں ہمیشہ حضرت چیمہ مرحوم کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے اور آخری ایام میں جامعہ کے انتظام و انصرام کے لیے جب انھوں نے چند احباب کو منتخب کیا تو ان میں سرفہرست مولانا چیمہ مرحوم بھی تھے۔ ان کے اس اعتماد کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بھی آخر دم تک یہ عہد وفا پورا کیا اور بہر نوع جامعہ تعلیم الاسلام کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ تقبل اللہ سعیھم

امام الزاہدین حضرت سید مولیٰ بخش صاحب کوموی رحمہ اللہ: اہلِ علم اور اصحاب ذکر وفکر کے ہاں تو ان کی شخصیت کوئی محتاج تعارف نہیں، البتہ اکثر عوام ان کی شخصیت سے ناآشنا ہیں، اس لیے کہ وہ خود عوامی جھمیلوں سے بچنے کی کوشش کرتے تے، زہد وتقویٰ، علم وعمل، فقر وقناعت کے ہمالہ تھے، نمود ونمائش سے کوسوں دور اور جبہ و دستار کے تکلفات سے نفور بلکہ ناآشنا، سلف کی طرح چھپنے کی خُوتھی چھپنے کی نہیں، اہلِ ثروت کے ہاں قیام ان پر بارگراں گزرتا۔ فرمایا کرتے کہ ان کے کھانوں

ے ہمیں ہماری دال روٹی کا لطف نہیں آئے گا۔ ایک روز کی روٹی سے اپنے ہمیشہ
کے کھانے کا ذائقہ کیوں خراب کریں۔ مستجاب الدعوات تھے، مگر ان سے دعا کروانا
ایک مشکل مسئلہ تھا۔ جب کوئی دعا کی التجا کرتا تو فرماتے حضرت صوفی صاحب سے
دعا کراؤ۔ میرے بارے میں تمھیں کسی نے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ بات کچھ
اس انداز اور بے نفسی سے فرماتے کہ آنکھیں چھلک جاتیں۔ ذکر واذکار اور صوم وصلاۃ
کے ساتھ ساتھ باقاعدہ اہتمام سے صحیح بخاری شریف مع فتح الباری کا ہمیشہ مطالعہ
کرتے۔ فیصل آباد تشریف لاتے تو حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث امرتسری
بانی کلیہ دار القرآن اور حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث فیصل آباد سے
علمی مذاکرہ کرتے اور مسائل پر ان دونوں حضرات کی تحقیق وبصیرت کو بڑی وقعت کی
نظر سے دیکھتے ان کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں، مگر یہ ان کا محل نہیں۔

عرض یہ کرنا تھا کہ حضرت سید کوموی صاحب رحمہ اللہ سے بھی حضرت چیمہ مرحوم
کو گہری عقیدت تھی۔ کئی بار انھیں اپنے ہاں رات ٹھہرایا۔ جی بھر کے خدمت کی اور
ان سے خوب دعائیں لیں اور کئی بار ان کے آستانہ پر حاضری دی۔ ایک بار جیسے کہ
انھوں نے بتلایا کہ میں پریشانیوں میں گھر گیا تو بذریعہ سکوٹر ''سید محمود'' ان کے ہاں
حاضر ہوا۔ حالِ دل بیان کیا تو انھوں نے مجھے ایک دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ جس کا
اثر ایسا ہوا کہ میرے دل کو چند ہی دنوں میں قرار آ گیا۔ میں جب وہ دعا پڑھتا تو
مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میرے دل پر برف گر رہی ہے۔ اس ناکارہ نے دریافت کیا
کہ وہ دعا کون سی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ افسوس کہ وہ دعا میں اب بھول گیا ہوں۔
البتہ جب حضرت شاہ صاحب نے مجھے اس کی تلقین فرمائی تو ان کے تلمیذ حافظ محمد
یوسف صاحب وہاں موجود تھے۔ امید ہے انھیں یاد ہوگا، مجھے اس پر انتہائی تعجب ہوا۔

وہ بھی مولانا مرحوم اصحابِ ذکر کی طرح ذکر وفکر کے آدمی نہ تھے۔ یا ممکن ہے انھیں یہ بتلانے میں تامل ہو۔ بہر حال اس ناکارہ کی اس کے بعد جب جناب حافظ محمد یوسف صاحب سے ملاقات ہوئی تو اسی سابقہ حوالے میں میں نے اس دعا کا تذکرہ کیا اور اس بارے میں سوال کیا کہ وہ کون سی دعا تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں حضرت نواب صدیق حسن خان مرحوم کی ''نزل الابرار'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ فلاں دعا ہے اور اس کے ساتھ انھوں نے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ ''دعا الکرب'' ہے جسے امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے الدعوات میں اسی عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ اللهم وفقنا لمرضياتك

حضرت سید صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی تو ہم ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں پہنچے۔ گاؤں میں وسائل آمد ورفت کے نہ ہونے کے باوجود ایک جمِ غفیر تھا۔ اس ناکارہ نے اپنے ہاتھوں سے اور آنکھوں کے سامنے درجنوں افراد واحباب کو قبر میں اتارا اور قبر میں میت کو رکھتے ہوئے دیکھا، مگر ہمیشہ قبر سے وحشت اور خوف طاری ہوا۔ مگر حضرت شاہ صاحب مرحوم کی قبر کو ان کے دفن سے پہلے اور دفن کے وقت دیکھا۔ یقین کیجیے دل میں بار بار یہ خواہش اٹھتی کہ کاش اس قبر میں آج مجھے دفن کیا جاتا۔ قبر سے ہمیشہ وحشت ہوئی لیکن یہ وہاں بالکل مفقود تھی۔ اسی اثنا میں یہ بھی ہوا کہ حضرت چیمہ صاحب مرحوم قبر میں اترے اور قبر میں کچھ دیر لیٹے رہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کو لحد میں اتارا گیا، دفن کے بعد جب قبر کے بارے میں میں نے اپنے احساسات کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: یہی کیفیت میری تھی اور اسی بنا پر تو میں قبر میں لیٹ گیا تھا۔ گویا حضرت شاہ صاحب کی قبر سے ''روضة من رياض الجنة'' کا احساس ابھر رہا تھا کہ یہ قبر جنت

جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ محسوس ہو رہا ہے۔

اللّٰهم توفنا مسلمين وألحقنا بالأنبياء والصالحين، آمين يا رب العالمين.

❀ حضرت چیمہ مرحوم کی محبوب شخصیتوں میں ایک استاذ العلماء حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ تھے۔ جو اپنے علم و فضل، ذکر و فکر اور استغناء میں اپنے اقران پر فائق تھے۔ سلف کی یادگار اور "العلماء ورثة الأنبياء" کے سچے اور صحیح مصداق تھے۔ آپ ہمیشہ ان کے علم و عمل کا ذکر کرتے، مگر جماعت کو چلانے کے لیے جس تدبر اور منتظمانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اس بارے میں وہ ان سے اختلاف کرتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حافظ صاحب کو امیر بنایا گیا تو چیمہ صاحب نے عہدۂ امارت کے لیے ان کا نام پیش کرنے والوں سے اختلاف کیا۔ مگر اس کے باوجود کبھی ان کے احترام میں نہ خلل واقع ہوا نہ کوئی کمی محسوس ہوئی۔

❀ اسی طرح ان کی پسندیدہ شخصیتوں میں ایک حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی مرحوم تھے، جن کی عظمتوں سے زمانہ واقف ہے۔ مولانا غزنوی رحمہ اللہ کا جماعتی زندگی میں ایک خاص مزاج تھا اور ان کے ہمنواؤں میں ایک حضرت چیمہ مرحوم تھے۔ جمعیۃ کی تشکیل کا دور مولانا کی جوانی کا دور تھا۔ جس میں انھوں نے خوب محنت کی، جس کے ہمیشہ مولانا غزنوی رحمہ اللہ معترف رہے۔

بہت کم احباب کو علم ہے کہ آل پاکستان اہلِ حدیث کانفرنس جب گوجرانوالہ میں ہوئی اور اس میں مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم اور مولانا غزنوی مرحوم کے مابین تلخ کلامی ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ جمعیۃ کا وجود اسی روز دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتا، مگر اس تلخی کو ختم کرانے میں حضرت چیمہ مرحوم کے تدبر نے کام کیا۔ ان ہی انھی

صلاحیتوں کی بنا پر مولانا غزنوی رحمہ اللہ ہمیشہ ان کے قدر دان رہے اور ان کی رائے کا احترام کرتے رہے۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد عبداللہ سے بھی وہ انتہائی متاثر تھے اور ان کے علم وفضل کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتے تھے۔

ادارۃ العلوم الاثریہ:

یوں کرنے کو تو انھوں نے بہت سے دینی کام کیے، بہت سی مساجد تعمیر کرائیں، مدرسے بنوائے، ان کی سرپرستی کی اور بہر آئینہ ان کی تعمیر و ترقی میں ہمیشہ کوشش کی، مگر ان کی آخری یادگار ادارۃ العلوم الاثریہ فیصل آباد ہے، جو بحمداللہ اپنی کارکردگی، کتاب و سنت اور مسلک کی ترویج و اشاعت میں ملک اور بیرونِ ملک کسی تعارف کا محتاج نہیں اور اس سلسلے میں اس کی خدمات کسی بھی جامعہ سے کم نہیں۔

یہاں ادارے کا تعارف اور اس کی خدمات کا تذکرہ مطلوب نہیں، کیوں کہ یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہے۔ تاہم اس سلسلے میں بعض باتیں ناگزیر ہیں اور مولانا مرحوم کی نسبت سے ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ادارہ کا تاسیسی اجلاس ۱۷ نومبر ۱۹۶۸ء میں جامع مسجد اہلِ حدیث منٹگمری بازار میں منعقد ہوا۔ جس میں فیصل آباد کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اصحاب علم وفضل نے شرکت کی۔ ادارے کا یہ نام متکلم اسلام حضرت مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم نے تجویز کیا، اس کا آغاز جامع مسجد کریمیہ اہلِ حدیث جھال خانوآنہ میں ہوا اور کچھ عرصہ بعد اسے جامع مسجد اہلِ حدیث منٹگمری بازار میں منتقل کر دیا گیا۔ ادارے کے قیام کا مقصد فارغ التحصیل طلبا کی تربیت اور ان کے لیے حدیث میں تخصص کا ماحول مہیا کرنا، ایک بہترین لائبریری کا قیام، مسلکِ سلف کی ترجمانی اور حدیث و سنت کی ترویج و اشاعت کا اہتمام۔ نیز متخصصین حضرات کی اس انداز سے تربیت کہ وہ مستقبل قریب میں تصنیفی، تدریسی،

تحقیقی اور تبلیغی میدان میں عمدہ ترین اسلوب سے اسلام کی خدمت کر سکیں۔

بحمد اللہ انہی خطوط پر دس گیارہ سال تک کام ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ ادارے کی زیرِ نگرانی تحفیظ القرآن کا پروگرام بھی بنا۔ جس میں سیکڑوں طلبا نے قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی اور چالیس کے قریب طلبا نے ادارہ میں تخصص کیا۔ اسی دوران میں متخصصین حضرات کے بعض مقالات کی اشاعت بھی ہوئی، جسے جماعتی حلقوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور انھیں ادارے کی کامیابی کی دلیل قرار دیا گیا۔ مگر افسوس کہ یہ اسلوب بوجوہ قائم نہ رہ سکا۔ جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے، اس کے بعد ادارہ میں تمام تر کام تصنیف و تألیف کا ہونے لگا۔ جس میں بحمد اللہ دو درجن کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں ''مسند إمام أبي یعلیٰ الموصلی'' چھے جلدوں میں ''العلل المتناھیہ لابن الجوزي'' دو جلدوں میں ''المعجم لأبي یعلیٰ الموصلی'' ایک جلد میں سرفہرست ہیں۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ حدیث کی ان اہم ترین کتابوں کو سب سے پہلی بار طبع کرنے کا شرف ادارۃ العلوم الاثریہ کو حاصل ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی کی ''إعلام أھل العصر بأحکام رکعتي الفجر'' حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی ''جزء رفع الیدین'' کی کامل مکمل عربی میں تخریج وحواشی جسے شیخ العرب والعجم حضرت سید بدیع الدین شاہ صاحب الراشدی نے مرتب فرمایا، بھی اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ احناف اور اہلِ حدیث کے مابین فروعی نزاعی مسئلہ ہے، اس موضوع پر ''توضیح الکلام في وجوب القراءۃ خلف الإمام'' دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ جسے ہمارے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے تبصرہ نگار نے اس موضوع کا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا اور کہا کہ کوئی

اہل علم اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ادارہ کی تمام مطبوعات کا تعارف یہاں مقصود نہیں، بتلانا صرف یہ ہے کہ ادارہ نے اس سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں ان سے ایک عالم مستفید ہو رہا ہے۔

۱۹۷۴ء میں ''غایة المقصود'' کی تکمیل کا مبارک پروگرام بنا، اس سلسلے میں تمام تر تیاری کے باوجود افسوس کہ کام نہ ہو سکا، جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اسی طرح تقریباً ۱۹۷۸ء میں امام بیہقی رحمہ اللہ کی ''معرفة السنن'' کی تخریج و حواشی کا پروگرام بنا، بلکہ ایک جلد کے قریب یہ کام بھی ہوا، مگر صد افسوس کہ یہ مبارک منصوبہ بھی ادھورا رہا اور پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پایا۔ اب بھی بحمد اللہ کئی کام مکمل ہو چکے ہیں۔ بعض زیرِ تسوید ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو منظور ہوا تو اپنے وقت میں یہ بھی منصۂ شہود پر آ جائیں گے۔ إن شاء الله. لكل أجل كتاب.

یوں تو بساط بھر ادارہ کے سب رفقا نے خدمت کی، مگر اس کی تمام تر کامیابیاں استاذ مکرم حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث فیصل آبادی کے اخلاص اور حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب چیمہ رحمہ اللہ کے تدبر و تفکر کی رہینِ منت ہیں۔ مولانا آخری ایام میں ادارہ کے مستقبل پر غور کرتے تو پریشان ہو جاتے۔ اس کے لیے انھوں نے جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن سے الحاق کا پروگرام بھی بنایا۔ مگر افسوس وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کافی وقت پہلے فیصل آباد کے بعض حضرات نے اسے الجامعۃ السلفیہ سے ملحق کرنے کا عندیہ دیا تو مولانا مرحوم نے اس سے بھی انکار نہ کیا۔ البتہ یہ شرط قرار دی کہ اس کی نگرانی کے لیے اہلِ علم پر مشتمل کمیٹی بنا دی جائے، وہی اس کا تمام پروگرام بنائیں اور کام کرنے والے حضرات اسی کمیٹی کے سامنے جواب دہ ہوں۔ مگر افسوس کہ یوں بھی نہ ہو سکا۔

بلاشبہ ادارہ کو اہلِ علم کی سرپرستی کی ضرورت ہے، بلکہ اس کی ضرورت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لیے اہلِ علم و دانش سے استدعا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے اس خادم ادارہ کے ساتھ اپنا علمی وفکری تعلق بدستور رکھیں اور مرحومین کے اس لگائے ہوئے پودے کی آبیاری فرمائیں۔

عرض کر رہا تھا کہ ادارۃ العلوم الاثریہ کی کامیابیوں میں اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں بڑا عمل دخل حضرت مولانا محمد اسحاق چیمہ مرحوم کا ہے اور ان کا صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی حسنات کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور ان کی بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرمائے۔ آمین

مولانا چیمہ مرحوم کی دینی وملی خدمات پر ماہنامہ ''تعلیم الاسلام'' (ماموں کانجن) کا ۱۹۹۴ء میں نمبر شائع ہوا، اسی طرح ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' (لاہور) جو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے، اس میں بھی ۱۳ جنوری ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں شیخ الحدیث حضرت مولانا چیمہ رحمۃ اللہ علیہ نمبر، شائع ہوا جس میں ہمارے شعراء نے بھی اشعار میں انھیں خراجِ تحسین پیش کیا، اس سلسلے کے دو کلام نذرِ قارئین کر رہا ہوں:

مولانا محمد اسحاق چیمہ رحمہ اللہ

از: پروفیسر محمد اسحاق شاد

(صدر شعبہ ادبیات اردو، گورنمنٹ کالج سمندری)

معظم محتشم اسحاق چیمہ — چھنا محفل سے سطوت کا خزینہ
جمعیت سُونی سُونی لگ رہی ہے — فسُردہ ہو گیا روشن نگینہ

مدرس علم کا، حسنِ عمل کا — ادائے حرف کا احسن قرینہ
زباں پہ روز و شب تذکارِ نبوی — رہی دل میں سدا حُبِ مدینہ
تلاطم آشنا، طغیانیوں کا — شناور تھا وہ سالارِ سفینہ
کھلایا گلشن سلفی[1] و اثری[2] — بہایا اُس نے محنت کا پسینہ
کرشمہ ہے خلوصِ بے بہا کا — محبت موجزن سینہ بسینہ
ملا خالق سے اپنے قدر کی شب[3] — سعادت کی گھڑی اَسعد مہینہ[4]
کرے گی فخر دائم خاکِ مرقد — ملا ہے ارض کو ایسا دفینہ

مجاہد تھا وہ اس دار المحن کا
الٰہی! قبر ہو دار السکینہ

آہ مولانا محمد اسحاق چیمہ رحمہ اللہ

حضرت مولانا عبدالرحمان عاجز مالیرکوٹلوی

مولانا اسحاق چیمہ وہ شریعت کے امیں
عالمِ قرآن و سنت عاملِ دینِ متیں
کل جو تھے پشتِ زمیں پر سرنگوں مست خرام
پی گئے جامِ اجل اُف چھپ گئے زیرِ زمیں

1. الجامعۃ السلفیہ
2. ادارۃ العلوم الاثریہ
3. ۲۹ ویں شب۔
4. رمضان المبارک۔

محفلوں میں لب پہ اکثر علمِ دیں کا تذکرہ
موجزن سینے میں تھی حرصِ فروغِ علمِ دیں

خوش نشست و خوش قیام و خوش خرام و خوش کلام
خوبصورت، خوب سیرت تھے، نہایت خوش جبیں

وہ کہ تھا جن کا تبسم نکہتِ گل کی مثال
تھیں ادائیں جن کی خوش کن تھیں وفائیں دلنشیں

فیصل آباد آج تجھ سے کون رخصت ہو گیا
اہلِ علم و فہم ہیں کیوں اس قدر اندوہ گیں

اہلِ علم و اہلِ دیں تھے مولانا اسحاق خود
کب بھلا سکتے ہیں اُن کو اہلِ علم و اہلِ دیں

اُن کی جدوجہد تھی سب آخرت کے واسطے
اس لیے کہ آخرت پر تھا انھیں کامل یقیں

دے گئے داغِ جدائی وہ ہمیشہ کے لیے
کون دکھلائے گا اب ان کی ہمیں شکلِ حسیں

اب نہ آئیں گے کبھی واپس وہ بزمِ دہر میں
جو گیا دنیا سے بس وہ ہو گیا پردہ نشیں

یا الٰہی تیرے در پر ہے یہ عاجز کی دعا
مولانا اسحاق کو تو کر عطا خُلدِ بریں

❀❀❀

جل رہا ہے آتشِ حسرت میں ہر پروانہ آج
بجھ گئی اک اور شمعِ محفلِ جانانہ آج

خون ہو کر بہہ گیا دل دیدۂ بے تاب سے
ہو گیا خالی چھلک کر صبر کا پیمانہ آج

مولانا اسحاق چیمہ عالم دینِ نبی ﷺ
کل تھا سب کا آشنا، اُف سب سے ہے بے گانہ آج

دے رہا تھا جو ہمیں کل تک پیامِ دوستی
چل دیا خود توڑ کر ہم سے وہی یارانہ آج

اک جھلک جس کی دوائے دردِ چشم شوق تھی
چل دیا منہ ڈھانپ کر وہ رونقِ کاشانہ آج

جس کا دل مومن کے درد سے پُر درد تھا
سو رہا ہے قبر میں ہر درد سے بے گانہ آج

بن گیا تفسیر کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی
اٹھ گیا دنیائے دوں سے اس کا آب و دانہ آج

تو ہی اس کے غم میں اے عاجزؔ نہیں زار و نزار
کتنی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اس کو بے تابانہ آج

سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ

(کچھ یادیں کچھ باتیں)

خاندانِ غزنویہ سے تعارف الجامعۃ السلفیہ میں دورانِ تعلیم حمائل غزنویہ اور مترجم مشکاۃ سے ہوا اور تعلق خاطر حضرت سید عبداللہ غزنوی نور اللہ مرقدہ کے سوانح اور بالخصوص ان کے مطبوع خطوط سے ہوا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی زمانہ میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب قدس سرہٗ (قلعہ میہاں سنگھ) کے سوانح حیات مل گئے۔ اس نے جلتی پر تیل ڈالا اور یوں اس خاندان سے قلبی تعلق استوار ہوتا گیا۔

حضرت موصوف کے وہ خطوط جو انھوں نے حضرت سید صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں ارسال فرمائے۔ فارسی ادب میں بلند مقام کے حامل ہیں۔ گو دونوں بزرگ ہم سبق ہیں، دونوں نے حضرت میاں صاحب محدث دہلوی کے سامنے اکٹھے زانوئے تلمذ تہ کیے، لیکن خطوط میں اسی عقیدت، ادب و احترام ومحبت کا اظہار ہے جو ایک مرید کو شیخ سے اور ایک سچے طالب علم کو استاد سے ہوتا ہے۔ حضرت غزنوی رحمہ اللہ کے متعلق صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی رحمہ اللہ کی رائے ہے:

"الشيخ العلامة، قدوة أهل الاستقامة، إمام الهدى واليقين، رئيس الأتقياء الكاملين، صاحب الكشف والتحقيق .. كان عارفاً بالله، ساعياً في مرضاته، عابداً، كثير الذكر،

راجعاً إلى الله، متذلّلا، خاشعاً، ورعاً، متضرعاً، متواضعاً، حنيفاً كاملًا إمام الزمان، ولي الرحمان خادم القرآن، متقرباً إلى الله المنان، وكان في جميع أحواله مستغرقاً في ذكر الله عزوجل حتى أن لحمهٗ وعظامهٗ وعصابهٗ وأشعارهٗ وجميع بدنه كان متوجهاً إلى الله تعالىٰ فانياً في ذكره عزوجل"[1]

حضرت مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے ان کی شخصیت کا جو تعارف محبت بھری زبان میں بیان فرمایا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ چنانچہ وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

"صحبت محدثین لازم شمارند کہ اہلِ حدیث اہل اللہ و بعد فراغ از علم دینیہ دست بیعت بشیخ کامل مکمل دہند و دریں زمان مثل عبداللہ غزنوی در قیاس ما حدے نیست۔ صحبتش اکسیر است و تحقیقت آنحضرت کامل مکمل پیراست۔ عبدالقادر[2] ترجمہ قرآن ازیشان شروع کنند و بسم اللہ عبدالعزیز[3] ازیشان شروع کنند کہ در عقیدۂ فقیر مثل جنید و نظیر حضرت بایزید است۔"

لا يدرك الواصف المطرى خصائصهٗ
وإن يك سابقا فى كل ماوصفا

ہمیں بس گرچہ بس کاسد قماشم کہ در سلک خریدارانش باشم

(سوانح مولانا غلام رسول مرحوم)

---

[1] "من ... غاية المقصود"

[2] آپ کے بڑے صاحبزادے کا نام ہے۔

[3] آپ کے دوسرے صاحبزادے۔ دونوں علم و فضل میں کامل تھے۔

وذلك فضل الله يؤتيه من يشآء

بلاشبہ حضرت رحمہ اللہ نے بجا فرمایا اور امید ہے کہ تاریخ کا طالب علم بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ جس طرح سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی رحمہ اللہ نے شریعت و طریقت کی ثنویت پر ضرب کاری لگا کر باطنیہ کے سیلِ رواں کے سامنے بند باندھا۔ دلائل و براہین سے علم ظاہر یعنی علم شریعت کی برتری کو ثابت کیا اور کتاب و سنت ہی کو اساسِ روحانیت اور معیارِ ولایت قرار دیا، اسی طرح حضرت غزنوی رحمہ اللہ نے بدعی اور نظام خانقاہی کے مقابلے میں خالص کتاب و سنت کو اصلاحِ نفس کا معیار قرار دیا۔ غزل گوئی (جسے اصطلاحاً صوفیا سماع کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں) اور اشتغالِ صوفیا سے بیزاری کا اعلان کیا۔ تلاوتِ قرآن پاک اور ادعیہ ماثورہ کو اوڑھنا بچھونا بنایا، بلکہ لطائف و اشغالِ صوفیا کو احداث فی الدین قرار دیا۔

سید ابو بکر غزنوی رحمہ اللہ اسی عظیم خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کو علومِ قدیمہ و جدیدہ میں مہارت کے ساتھ وجاہت، للّٰہیت، استغنا، درویشی میں بادشاہی، ذکر و اذکار میں انہماک، فقرا سے محبت اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا۔ راقم السطور سے ان کا تعارف غالباً ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ آپ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں لائل پور تشریف لائے، یہ ناکارہ ان دنوں معتکف تھا۔ استاذ محترم مولانا محمد عبداللہ صاحب رحمہ اللہ سے گزارش کی کہ میرا پیغام حضرت سید صاحب تک پہنچا دیں: ''مسجد کے کونے میں ایک درویش زیارت کا متمنی ہے، شرعی حدود مانع نہ ہوتیں تو حاضرِ خدمت ہوتا۔''

حسبِ اطلاع دوپہر کے وقت مسجد میں ان کی تشریف آوری کا پیغام پہنچا تو عصر کے بعد جناب میاں عبدالواحد کے ساتھ مسجد منٹگمری بازار میں تشریف لائے۔ میں ابھی وضو سے فارغ ہو کر معتکف میں جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز سنائی دی کہ

حضرت سید صاحب تشریف لائے ہیں۔ واپس لوٹا اور جلدی سے سلام کے بعد نعلین اٹھا کر معتکف میں رکھ لیے۔ آپ نے وضو کیا میں پاس کھڑا ان کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ محسوس یوں ہوتا تھا کہ آپ ہاتھ پانی سے نہیں آنسوؤں سے دھو رہے ہیں اور بار بار وضو کے دوران یہ دعا پڑھ رہے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَ وَسِّعْ لِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ"

میں نے ایک دفعہ ان سے خطبہ جمعہ میں سنا تھا کہ نماز میں اطمینان اور خشوع و خضوع کے لیے ضروری ہے کہ وضو پوری جمعیت سے کیا جائے اور ہاتھ دھوتے وقت یہ خیال کرے کہ آقا کے سامنے ہاتھ مل مل کے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔ اسی طرح دیگر اعضا کو دھوتے ہوئے ان کے گناہوں کی معافی طلب کرے اور بار بار یہ دعا پڑھتا جائے۔ الحمد اللہ کہ آج اس کا عملی نمونہ ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا۔ وضو سے فارغ ہو کر میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتلایا تو معاً سینے سے لگا لیا اور فرمایا: یہاں تم ہی سے تو ملنے آیا ہوں۔ اس کے بعد میرے ساتھ ہی معتکف میں تشریف لے آئے۔ لحہ بھر خاموشی کے بعد عرض کی حضرت دعا فرمایئے۔ فرمایا: میں تو خود دعا کے لیے آیا ہوں، تم دعا کرو میں آمین کہوں گا۔ یہ سن کر ندامت سے سر جھک گیا۔ میں نے پھر عرض کی حضرت دعا فرمایئے مجھے دعا کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ انھوں نے پھر فرمایا: نہیں، تم دعا کرو میں آمین کہوں گا۔

چنانچہ ہاتھ اٹھائے اور مختصر مگر جامع دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو میں نے پھر خیریت پوچھی۔ فرمایا، خیریت ہے، میں نے عزم کر لیا ہے کہ واپس لاہور جا کر باقی ایام اعتکاف میں گزاروں گا۔ جو سکون یہاں چند لمحے میں حاصل ہوا۔ اس کا تصور بھی باہر کی دنیا میں ممکن نہیں، اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہوئے

تو الوداعی سلام کے بعد فرمایا: لاہور کبھی آؤ تو مجھے ضرور ملو، پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ یہاں زیادہ گفتگو مناسب نہیں۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ جس سے ان کی محبت وعقیدت کا آغاز ہوا اور پھر یہ تعلق بدستور بڑھتا گیا۔

اس کے بعد لاہور جاتا تو زیارت کی کوشش کرتا۔ گرمیوں کے موسم میں ایک مرتبہ عصر کی نماز کے قریب پہنچا۔ موسم کے مناسب مشروب سے مہمانی کی اور فرمایا: میں نے ابھی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد بیٹھیں گے۔ چند لمحے بعد وضو کر کے واپس تشریف لائے۔ انھوں نے نماز پڑھائی۔ کسی زمانے میں غزنوی طرزِ نماز سن رکھا تھا۔ آج اس کا مشاہدہ کیا۔ تقریباً بیس منٹ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ نماز میں جو سکون واطمینان حاصل ہوا، افسوس وہ آج تک دوبارہ حاصل نہ ہو سکا۔

نماز کے بعد چائے آ گئی، اسی دوران کچھ طالب علمانہ سوال کیے۔ ذکر و اذکار کے طریقہ کا سبق لیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اجازت طلب کی تو فرمانے لگے اتنی جلدی؟ میں بڑھ کر گلے سے چمٹ گیا اور گردن کا بوسہ لیتے ہوئے کہا:

لپٹ کر چوس لے گل کو اری بلبل — چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

فرمانے لگے اس قدر دیوانگی اچھی نہیں، میں نے معاً عرض کی:

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب — یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

تو ہنس دیے۔ ان سے رخصت ہوا تو دیر تک یوں گنگناتا رہا ؏

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

حضرت رحمہ اللہ نے مجلسِ ذکر قائم کر رکھی تھی، چار مرتبہ اس میں بھی حاضری کا موقع ملا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر صاحب حسبِ حال آہستہ ذکر کرتے، کوئی

پابندی نہ تھی کہ اب مل کر اسمِ اعظم کا ذکر کرو، پھر افضل الذکر اکٹھے پڑھو، جیسا کہ عام مجالسِ ذکر میں ہوتا ہے۔ البتہ حضرت سید صاحب رحمہ اللہ مخصوص غزنوی انداز میں بیچ وقفے کے بعد استغفر اللہ فرماتے اور کبھی اللہ کا مبارک نام لیتے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اس کے بعد ریاض الصالحین یا کسی اور کتاب سے دو تین احادیث کا مختصر درس ہوتا اور پھر موسم کے مطابق حاضرین کی تواضع کرتے۔ اس کے بعد یہ مجلس ختم ہو جاتی۔

اللہ ذوالجلال نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ جہاں جس مجلس میں بیٹھتے اپنی شاہانہ انفرادیت قائم رکھتے۔ جس موضوع پر گفتگو ہوتی اس پر عقلی و نقلی دلائل کے انبار لگا دیتے۔ فارسی تو آپ کی مادری زبان تھی۔ اردو کے علاوہ عربی اور انگلش پر بھی عبور تھا، جب چاہتے بلا تکلف سب زبانوں میں گفتگو کرتے، عربی بولتے تو یوں محسوس ہوتا کہ حجاز کے کوئی شیخ محوِ گفتگو ہیں۔ شعر و شاعری سے بھی آپ کو لگاؤ تھا۔ اردو عربی اور پنجابی کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔

لائل پور تشریف لاتے تو اکثر و بیشتر جناب میاں عبدالواحد صاحب کے ہاں قیام ہوتا۔ ایک مرتبہ مجلس گرم تھی، عابد و معبود کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب نے ہیر وارث شاہ کا یہ جملہ پڑھا ع

انا نا تے نحن کدوں آکھیا میں　　میں تے آکھیا قالو بلیٰ نا تھا

تو حضرت رحمہ اللہ نے برجستہ فرمایا ع

میں کہہ کے بلیٰ پھنس گیا بلا میں مدام
یہ بلا اک میرے لیے ہے اور میں بلا کے لیے

ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے اللہ سے محبت کی باتیں ہو رہی تھیں، فرما رہے تھے کہ

محبت کے بغیر اطاعت سے انسان منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی گوہرِ نایاب ہاتھ آتا ہے، اس کے بعد بڑے درد بھرے انداز میں یہ شعر پڑھا ع

لقد لسعت حية الهوى كبدي لا طبيب لها ولا اقي

ایک مرتبہ ذکر کے موضوع پر بات کر رہے تھے کہ اللہ کی یاد سے کوئی لمحہ خالی نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں جس قدر وقت گزر جائے غنیمت ہے۔ فرمایا کہ سید الاولین والآخرین کو حکم ہوا: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ اور پھر اس کی ترجمانی میں جذب کے عالم میں شیخ فرید کا یہ شعر پڑھا ع

کُوک فریدا کُوک توں جیویں راکھا ہے جوار
جد تک ٹانڈا نہ پکے تو کردا رہ پکار

بلاشبہ حضرت رحمہ اللہ ایک سچے ''صوفی'' اور درویش منش انسان تھے۔ کئی بلسوں میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر انھیں کڑھتے دیکھا۔ انھیں قوم کے واعظوں سے بھی شکوہ تھا۔ فرمایا کرتے: جس ملک میں خداوند قدوس کا انکار ہو، اس کے دین سے کھلے بندوں استہزا ہو، شیطان چوراہوں میں ننگا ناچ رہا ہو، اس میں فروعی اختلافات کو ہوا دینا کوئی دین کی خدمت نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں عالمِ دین تھے۔ اللہ کریم کی محبت اور اس کا ڈر ان کے رگ و ریشے میں رچا بسا تھا۔ واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ انھیں بسا اوقات غلبہ حال میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے بھی دیکھا گیا۔

میں نے کئی دوستوں اور بزرگوں سے ان کی ابتدائی زندگی اور حالیہ زندگی کی کچھ مجبوریوں کی بنا پر کوتاہیوں پر شکوہ بھی سنا۔ لیکن شاید کسی عارف کا یہ قول انھیں معلوم نہیں۔

ہر کہ درد اہلِ ہنر در اہلِ عیب آفتابے دارد اندر جیب غیب

عاقبت روزے بود کاں آفتاب — در برش گیر دلبر انداز نقاب

بلاشبہ وہ جلد ہی آفتاب بن کر چمکے اور جلد غروب ہو گئے۔ بڑے خوش نصیب ہیں، جنھوں نے ان سے روشنی حاصل کی۔ ان کی مجلسوں اور محفلوں سے دل کی اجڑی دنیا کو سجایا۔ اپنے اللہ کریم کو راضی کرنے کا ان سے سلیقہ سیکھا، لیکن آہ! اپنا تو یہ حال ہے ع

در مجلس وصالت خمہا کشند مرداں — چوں در خسرو آید مے در سبو نماند

اللہ تعالیٰ ہماری اور ان کی لغزشوں پر نظرِ عفو فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ بخشے۔ میں نے انھیں دعائے یوسفی بکثرت پڑھتے سنا۔ امید واثق ہے کہ اللہ کریم و رحیم نے اسی کے مطابق معاملہ کیا ہوگا۔

بشکریہ

ہفت روزہ ''الاسلام''

۸/اکتوبر ۱۹۷۶ء